

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنِهِمْ



# شوری کی شرعی حیثیت



تالیف

حضرت مولانا ریاست علی صنا بجنوری

شیخ الہند اکیدمی دارالعلوم دیوبند



وَلَا تُشْرِكْ بِهٖ شَيْئًا

# شوری کی شرعی حیثیت

جس میں شوری کی شرعی حیثیت کے علاوہ سلاطین اور دیگر امار کے ساتھ شوری کی نسبت کثرت رائے کے ذریعہ فیصلے، مدارس عربیہ کے نظام کار، ان کے دستور اساسی، رجسٹریشن اور وقف کے موضوع نیز دیگر ضمنی مسائل پر معتبر حوالوں کے ساتھ مدلل اور سیرجہل بحث کی گئی ہے۔

حضرت مولانا ریاست علی صاحب بخنوری

مکتبہ خلیفہ

راجپوت مارکیٹ، اردو بازار ○ لاہور



نام کتاب ..... شوری کی شری حیثیت  
 مؤلف ..... مولانا ریاست علی بجنوری استاذ حدیث و  
 ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند  
 صفحات ..... چار سو آٹھ  
 سن اشاعت ..... مارچ ۱۹۸۸ء  
 تعداد اشاعت ..... گیارہ سو

# فہرست مضامین

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۱	فہرست، تصدیقات اکابر، پیش لفظ، مقدمہ	۲ تا ۲۴
۲	ہندوستان اقتدار اسلامی کے زوال کے بعد	۲۷
۳	دارالعلوم کے آغاز کی نوعیت	۳۲
۴	مجلس شوریٰ کی تشکیل دارالعلوم سے پہلے ہے۔	۳۵
۵	چندہ پر چلنے والے مدارس میں شوریٰ کی اہمیت	۳۹
۶	مجلس شوریٰ کی بالادستی کے سلسلے میں حجۃ الاسلام حضرت نانوتوی کی تحریر	۴۵
۷	حضرت مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم دوم کی تحریر	۴۸
۸	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی تحریر	۵۱
۹	شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صابونی کی تحریر	۵۳
۱۰	دستور اساسی کی تدوین کا طریقہ	۵۶
۱۱	زیر بحث موضوع کے تجزیہ کی صحیح بنیادیں	۵۹
۱۲	آیت پاک میں اولوالامر سے کیا مراد ہے۔	۶۳
۱۳	اولوالامر کا مصداق فرد و جماعت دونوں ہو سکتے ہیں۔	۷۰
۱۴	خلاصہ بحث	
۱۵	اولوالامر کے درمیان فرق مراتب کی تفصیل۔	۸۳



نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۱۶	الاحکام السلطانیہ کے پہلے باب کا خلاصہ	۱۶
۱۷	تمام امراء پر نگرانی قائم کرنے کی صراحت	۱۷
۱۸	خلاصہ بحث	۱۸
۱۹	اسلام میں شوری کا مقام	۱۹
۲۰	شوری کے لغوی معنی	۲۰
۲۱	مشورہ کی اہمیت عقل انسانی کی نظر میں	۲۱
۲۲	مشورہ شریعت کی نظر میں	۲۲
۲۳	قرآن کریم میں شوری کا حکم تفصیلاً پر مشتمل نہیں۔	۲۳
۲۴	اجمالی احکام کی چند نظیریں۔	۲۴
۲۵	شوری کے احکام بھی تفصیلی نہیں ہیں۔	۲۵
۲۶	حضرت بریرہؓ کا واقعہ	۲۶
۲۷	شوری پر اجسمالی تبصرہ	۲۷
۲۸	رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے مشورہ کا حکم۔	۲۸
۲۹	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے مشورہ کے مقاصد۔	۲۹
۳۰	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے مشورہ کے مزید فائدے۔	۳۰
۳۱	عزم کے بارے میں علماء تفسیر کے ارشادات	۳۱
۳۲	اصول فقہ کی روشنی میں۔	۳۲
۳۳	آیت پر اصول کا اجرا اور پہلے مضمون پر استدلال	۳۳



نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۳۴	دوسرے مضمون پر استدلال۔	۱۵۹
۳۵	تیسرے اور چوتھے مضمون پر استدلال۔	۱۶۰
۳۶	حاصل کلام۔	۱۶۲
۳۷	رسول کے عزم اور دیگر امراء کے عزم میں فرق۔	۱۶۶
۳۸	عہد رسالت میں مشورہ طلب مسائل اور فیصلہ کا طریقہ۔	۱۶۳
۳۹	زیر بحث موضوع سے متعلق امام بخاری کا ترجمہ الباب۔	۱۶۹
۴۰	کتاب و سنت کی طرف مراجعت کا طریقہ۔	۱۹۰
۴۱	امام ابو بکر جصاص کا ارشاد۔	۱۹۱
۴۲	مفسر قرآن قاضی بیضاوی کا ارشاد	۱۹۳
۴۳	علامہ شاطبی کے ارشادات	۱۹۷
۴۴	کتاب و سنت کی طرف مراجعت کے قابل اعتماد طریقے	۲۰۱
۴۵	خلافت راشدہ میں مشورہ کی نوعیت	۲۰۳
۴۶	حضرت ابو بکر صدیق کا عہد خلافت	۲۰۴
۴۷	حضرت ابو بکر کے عہد خلافت کے چند واقعات کی صحیح تصویر	۲۰۸
۴۸	حضرت عمرؓ کا عہد خلافت	۲۱۶
۴۹	خلیفہ کے انتخاب کیلئے حضرت عمرؓ کی سات نفری مجلس شوریٰ۔	۲۲۰
۵۰	سلاطین پر شوریٰ کی بالادستی قرآن میں۔	۲۲۶
۵۱	سلاطین پر شوریٰ کی بالادستی حدیث میں	۲۳۲



صفحہ	مضامین	نمبر شمار
۲۳۸	سلاطین پر مجلس شوریٰ کی بالادستی کی مزید تصریحات	۵۲
۲۴۲	ماتحت امرار کے حق میں مجلس شوریٰ کی بالادستی	۵۳
۲۴۸	ایک ہی شخص کے امیر اور مامور ہونے کی وضاحت	۵۴
۲۵۰	مشورہ طلب مسائل کیا ہیں ؟	۵۵
۲۵۶	ایک کام کیلئے ایک سے زائد افراد کی ہیئت مجموعی کا حکم	۵۶
۲۵۹	اختلاف رائے کی صورت میں فیصلے کا طریقہ	۵۷
۲۶۲	کثرت رائے بھی فیصلے کا ایک طریقہ ہے۔	۵۸
۲۶۲	کثرت رائے و ترآن میں	۵۹
۲۶۷	کثرت رائے حدیث میں	۶۰
۲۷۶	ایک غلط فہمی کا ازالہ	۶۱
۲۷۹	مشورہ کے باب میں عہد رسالت کے طریق کار کی وضاحت	۶۲
۲۸۲	کثرت رائے خلافت راشدہ میں	۶۳
۲۹۲	کثرت رائے فقہاء کی نظر میں	۶۴
۲۹۵	مجلس شوریٰ میں امیر کی رائے کا درجہ	۶۵
۲۹۸	حضرت حکیم الامت کے نقطہ نظر کی وضاحت	۶۶
۳۰۹	دستور اساسی	۶۷
۳۱۲	عدالتی مراعات میں رجسٹریشن کی اہمیت	۶۸
۳۱۹	رجسٹریشن پر کئے گئے اعتراضات کا جائزہ	۶۹



صفحہ	مضامین	نمبر شمار
۳۱۹	سوسائٹی ایکٹ کی بعض دفعات کا ترجمہ	۷۰
۳۲۷	وقف اور دیگر املاک	۷۱
۳۲۸	وقف کی تعریف	۷۲
۳۲۹	وقف میں مالک کی ملکیت کے ازالہ کی شرطیں	۷۳
۳۳۲	وقف کی شرائط	۷۴
۳۳۷	وقف کے الفاظ	۷۵
۳۴۵	مدرسہ یا مسجد کی ملکیت	۷۶
۳۴۸	مدرسہ اشرف العلوم کانپور کی جائیداد کے سلسلے میں علماء کے فتاویٰ	۷۷
۳۵۳	سلاطین کی جانب سے دی جانے والی جائیداد میں وقف نہیں۔	۷۸
۳۶۰	ہندوستان کے مدارس عربیہ	۷۹
۳۷۷	مدرسہ کی املاک کا حکم۔	۸۰
۳۷۹	ضمیمہ — از حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب مدظلہ	۸۱
۴۰۳	ماخذ و مراجع	۸۲



# تصدیقات اکابر

فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی امت کا تہم

خلیفہ خاص شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرہ

مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

کچھ مدت سے بعض دینی مدارس میں ایک مسئلہ پیدا ہو رہا ہے کہ مدرسے کے مہتمم اور مدرسے کی شوری کے درمیان کس نوع کا تعلق ہے ان میں سے کون حاکم ہے کون محکوم بعض جگہ تو شوری نے مہتمم کو اتنا پابند کر دیا ہے کہ وہ کوئی کام شوری سے پوچھے بغیر نہیں کر سکتا چھوٹی چھوٹی چیز میں بھی اس کو سخت دشواری پیش آتی ہے۔ شوری نے اس کیلئے کوئی ضابطہ بناتی ہے جس کے تحت مہتمم کام کر لیا کرے نہ ہر ضرورت کی وقت پر منظوری دیتی ہے۔

بعض جگہ مہتمم نے شوری کو بالکل ہی بے حیثیت کر دیا ہے۔ اور خود مختاری کا پورا پورا اعلان کر دیا ہے کہ کسی کام میں شوری سے پوچھنے اور معلوم کرنے کی ضرورت ہی نہیں بلکہ شوری ہی بیکار اور کالعدم ہے۔ آئے دن اس کے متعلق سوالات آتے رہتے ہیں اور حسب سوال جواب بھی تحریر کر دیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ حضرت مولانا ریاست علی صاحب مدرس و ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند کو جزا خیر عطا فرمائے



کہ انہوں نے اس موضوع کے ہر گوشہ کو واضح فرما دیا اور فقہی عبارات سے مدتل بھی کر دیا ہے۔ جس سے علماء بھی پوری طرح مستفید ہو سکتے ہیں نیز مسئلہ وقف کو بھی خوب وضاحت سے بیان فرما دیا ہے۔ کہ کن شرائط کے ساتھ وقف صحیح ہوتا ہے۔ مدرسہ کی ہر چیز کو نہ وقف کہا جاسکتا ہے نہ ہر چیز کے وقف ہونے سے انکار کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ جو جائیداد وغیرہ فقہی ضابطہ کے تحت وقف ہے اس پر وقف کے احکام جاری ہوں گے کہ اس کو بیع وغیرہ کے ذریعہ کسی کی ملک قرار نہیں دیا جائے گا۔ اس کی حفاظت پوری طرح واجب ہوگی۔ اور جو اشیاء فقہی قاعدہ کے ماتحت وقف نہیں ملک مدرسہ ضرور ہیں۔ ان پر وقف کے احکام نافذ نہیں ہوں گے۔ البتہ مدرسہ کی ضروریات ان سے پوری کی جائیں گی مہتمم یا شوری کوئی بھی ایسی اشیاء کو اپنی ذاتی ملک قرار دینے کا مجاز نہیں۔ اس طرح اور بھی اہم امور اس تحریر میں آگئے۔ احقر نے پورا مضمون سن لیا ہے اور کہیں کہیں مشورہ بھی دیا ہے۔ مؤلف زید مجدہ نے اسکو قبول بھی فرمایا ہے۔

خدائے پاک اس کو نافع بنائے اور اس کے ذریعہ دینی مدارس کی الجھنوں کو دور فرمائے۔ اور مؤلف متذللہ کے علم و عمل میں اور اخلاص میں برکت عطا فرمائے

نقط

املاہ العبد محمود غفرلہ

چھتہ مسجد دارالعلوم دیوبند

۲۱ صفر ۱۴۰۸ھ

## استاذ العلماء حضرت مولانا معراج الحق صاحب کاتھم صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند

الحمد لله رب العالمین والصلوة والسلام علی سید المرسلین وعلیٰ آلہ و  
اصحابہ الطیبین اما بعد ! یہ دنیا تغیر پذیر ہے یہاں نت نئے مسائل و حوادث  
پیدا ہوتے ہیں اور فقہائے امت قرآن و سنت اور ائمہ دین کی تصریحات کی روشنی میں  
ان کے احکام واضح کرتے رہتے ہیں۔

اسی طرح کے جدید مسائل میں سے ایک نیا مسئلہ مدارس دینیہ کے سلسلہ میں  
بعض حلقوں کی طرف سے بڑی قوت کے ساتھ اٹھایا گیا ہے کہ ان مدارس کی مجلس شوریٰ  
اور ان کے مہتمم کی باہمی حیثیت کیا ہے نیز یہ مدارس فقہاء کرام کی اصطلاح کے مطابق وقف  
ہیں یا وقف نہیں ہیں یہ دونوں مسئلے حضرات اکابر رحمہم اللہ کے زمانے میں علمی اعتبار سے  
تقریباً طے شدہ تھے لیکن ان کی آج اس طرح سے تشویش کی جارہی ہے کہ گویا اسکی  
طرف اب تک توجہ نہیں کی گئی ہے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ معروضی طور پر ان مسائل کا  
جائزہ لیا جائے اور کتاب و سنت نیز فقہائے امت کی تصریحات کی روشنی میں علمی  
اعتبار سے ان کی توضیح و تنقیح کر دی جائے

خدا جزائے خیر دے مولانا ریاست علی صاحب استاذ حدیث و ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند  
کو کہ انھوں نے کثرت مشاغل اور عیدیم الفرصت ہونے کے باوجود ان مسائل کو کتاب و سنت  
اور کتب فقہ کی روشنی میں اس طرح منقح کر دیا ہے کہ اس پر اضافہ کی ضرورت باقی نہیں رہی  
کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مؤلف موصوف کو ترتیب و بسط و دلائل میں خصوصی درک حاصل ہے  
(بقیہ صلا پر)



## استاذ الاساتذہ حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب مدظلہ العالی شیخ الحدیث و نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند

حامداً و مصلیاً! "شوری کی شرعی حیثیت" اور اس سے متعلق دیگر مباحث کی تحقیق و تنقیح میں جو محنت کی گئی ہے، کتاب کے مضامین خود اس کا ثبوت ہیں۔ مزید یہ احتیاط کی گئی کہ اکابر علماء کے علمی مناقشہ، یا ان کے بغور مطالعہ اور سماعت فرمانے کے بعد اس کو شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ تحریر جس میں کسی پہلو سے تشنگی محسوس نہیں ہوتی، مدارس عربیہ کے نظام کار، ان کے دستور اساسی، رجسٹریشن، وقف اور دینی و دنیاوی تمام معاملات میں شوری کی شرعی حیثیت کی تفصیلات پر مشتمل ہے اور ہر جگہ ایسی دلنشین اور مدلل گفتگو کی گئی ہے کہ ہر مسئلہ پر شرح صدر ہو جاتا ہے۔

فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی زید مجدہم نے بغور سماعت فرمانے کے بعد تمام مضامین کی صحت کی توثیق فرمادی ہے جس کے بعد کسی توثیق کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

دعا ہے کہ پروردگار عالم، کتاب کو نفع بخش بنائے، اور مدارس عربیہ کے نظام کار کے ذمہ داروں کیلئے شوری کی شرعی حیثیت کے مطابق استفادے کی راہیں سافراں بنائے۔

نصیر احمد غفرلہ ۱۲ صفر ۱۴۰۸ھ

بقیہ صفحہ گزشتہ کتاب اپنے موضوع پر جامع اور پُر از معلومات ہے اور میری معلومات کی حد تک اس موضوع پر اتنی بسیط اور مدلل کتاب ہے ہمارے کتب خانے خالی ہیں۔ دعا ہے کہ پروردگار اس خدمت کو نفع بخش اور مقبول فرمائے۔ فقط  
احقر معراج الحق غفرلہ

# رائے گرامی

حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری زید مجدہم  
نگران اعزازی شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند

اسے حسن اتفاق ہی کہا جائے گا کہ "شوری کی شرعی حیثیت" کی طباعت کا وقت آیا تو حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری زید مجدہم دیوبند تشریف لے آئے اور موصوف نے مسودہ دیکھ کر اپنی رائے رقم فرمادی۔ قاضی صاحب موصوف کو مجلس شوریٰ نے شیخ الہند اکیڈمی کے کاموں کی نگرانی کا کام اعزازی طور پر سپرد کیا ہے وہ اسی غرض سے دیوبند تشریف لاتے رہتے ہیں، اور مفید مشوروں سے نوازتے ہیں۔ (ادارہ)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

زیر نظر کتاب ایسے مسائل و مباحث پر مشتمل ہے جن کا تعلق مدارس اسلامیہ سے ہے اور جن کے جملہ امور و معاملات مجلس شوریٰ اور مہتمم یا ناظم کے باہمی اشتراک و استصواب سے انجام پاتے ہیں، اس سلسلہ میں مجلس شوریٰ اور ناظم و مہتمم کیلئے قواعد و ضوابط بھی ہوتے ہیں، یہ بات یقیناً جسارتِ بیجا سمجھی جائے گی کہ ان اصول و



ضوابط میں شرعی احکام ذہنی ہوتے ہیں اور علما ان پر توجہ بہت کم ہوتی ہے۔ خاص طور سے مقامی اور علاقائی درسگاہوں میں یہ صورت زیادہ ہوتی ہے جس کے باعث بعض اوقات ناگوار حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔

سخت ضرورت تھی کہ مدارس اسلامیہ کے شوری، اہتمام، مالیات، اور جائیداد وغیرہ کے بارے میں شرعی احکام مفصل و محقق طور سے یکجا بیان کر دئے جائیں، یہ کتاب اسی انداز پر اس غرض سے مرتب کی گئی ہے۔

اس کتاب کے مصنف جناب مولانا ریاست علی صاحب بجنوری مدرس ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند نے نہایت تحقیق و تلاش سے ان مسائل پر سیر حاصل بحث کی ہے، اور کتاب وسنت، فقہ و فتاویٰ اور علماء کے آراء و اقوال کے قدیم و جدید مأخذوں کو کھنگھا کر ایک نہایت سنجیدہ اور باوقار کتاب مرتب کی ہے، شوری اور اہتمام سے متعلق حصہ خاص طور سے مصنف کی تلاش و تحقیق کا شاہکار ہے

اس کتاب کی وجہ تصنیف اگرچہ ان موضوعات پر بعض جدید تصنیفات ہیں مگر اس میں کہیں مجادلانہ تو کیا مجیبانہ انداز بھی نظر نہیں آیا ہے۔ یہ اس کتاب کی خاص خوبی ہے جس کی وجہ سے عام مدارس اسلامیہ کیلئے بڑے کام کی ہے، اگر ارکان شوری اور نظما و مہتممین حضرات شرعی حدود میں رہ کر مدارس کے نظم و نسق کو چلائیں تو کوئی ناگوار بات پیدا نہیں ہوگی بلکہ خیر و برکت کا ظہور ہوگا، حضرت مصنف اپنی اس علمی دینی کاوش میں کامیاب ہیں۔ اللہ کرے یہ کتاب ہمارے مدرسوں کے حق میں مفید اور باعث خیر ہو۔

# پیش لفظ

اِن رِیَاسَت عَلَیٰ مَجْنُورِ غَفْلَةٍ

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ! اما بعد۔ آج سے چند سال پہلے تک مدارس عربیہ کے نظام کار میں شوریٰ اور اہتمام کی شرعی حیثیت کوئی ایسا موضوع نہیں تھا جس پر کسی تالیف کی ضرورت محسوس کی جائے، مہتمم کو ہر حال میں شوریٰ کا ماتحت سمجھا جاتا تھا جیسا کہ واقعہ ہے اور اسی وجہ سے ماضی میں کبھی مجلس شوریٰ کے مقابلہ میں مہتمم کی حیثیت زیر بحث نہیں آئی، نہ کبھی کسی مہتمم نے مجلس شوریٰ کے مقابل بالادستی کا دعویٰ کیا۔

زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ ان مدارس عربیہ کی ایک صدی سے زائد کی تاریخ میں ایک موقع پر شوریٰ اور سرپرست کے درمیان اس طرح کا موضوع زیر بحث آیا تھا اور دیانت و امانت کے اس زریں عہد میں اس کا فیصلہ عملی طور پر اس طرح ہو گیا کہ سرپرست نے شوریٰ کے سامنے اپنا استعفیٰ پیش کر دیا جو شوریٰ کی بالادستی کے اعتراف کے ساتھ، اختلاف کو ختم کرنے کا نہایت کامیاب اور قابل تقلید حل تھا۔

لیکن اب چند سالوں سے کچھ اہل علم اور ان کے حلقہ اثر کی جانب سے علمی اور عملی طور پر شوریٰ کے بارے میں منفی رویہ اختیار کرنے کی باتیں سامنے آرہی ہیں کہ پہلے تو ان حضرات نے شوریٰ کو تحلیل کرنے کی کوشش کی، پھر اس موقف کو مدلل کرنے کیلئے



کچھ تحریریں مرتب کر کے شائع کی گئیں۔ دارالعلوم کا موقف چونکہ شوری کی بالادستی کے سلسلے میں ہمیشہ شک و شبہ سے بالاتر رہا ہے اس لئے ہندو بیرون ہند سے اس موضوع کا علمی و تحقیقی جائزہ لینے کی فرمائشیں تسلسل کے ساتھ وصول ہونے لگیں۔

ابتداءً اس صورت حال کو انگیز کیا جاتا رہا، لیکن جب یہ دیکھنے میں آیا کہ یہ موضوع علماء کرام کی مجلسوں میں زیر بحث آگیا ہے اور بعض اہل علم بھی مسئلہ کا ایک ہی پہلو سامنے ہونے کے سبب غلط فہمی میں مبتلا ہو رہے ہیں تو حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مہتمم زید مجدہم اور حضرت مولانا معراج الحق صاحب صدر المدرسین دامت برکاتہم نے راقم الحروف کو اس موضوع پر محنت کرنے کا حکم دیا۔

راقم الحروف نے تعمیل حکم میں جب اس موضوع پر مطالعہ اور اساتذہ دارالعلوم سے تبادلہ خیال کے بعد مضمون کے عناصر کو قلمبند کرنا شروع کیا تو اس کے اطراف کا سمیٹنا دشوار ہو گیا اور اندازہ ہوا کہ مضمون چھ طیات سو صفحات پر محیط ہو جائے گا۔ میں نے اس الجھن کو اپنے خصوصی مرتبی حضرت مولانا سلطان الحق صاحب سابق ناظم کتب خانہ المتوفی ۱۴۰۶ھ کے سامنے رکھا تو انھوں نے مشورہ دیا کہ صرف موضوع سے براہ راست مربوط مضامین کو تین سو صفحات کے درمیان قلمبند کرنے کی کوشش موزوں معلوم ہوتی ہے، چنانچہ موصوف کے مقرر فرمودہ مسطر کی پابندی کرتے ہوئے بندہ نے مدارس عربیہ کے نظام کل شوری، دستور اساسی اور رجسٹریشن سے متعلق مضامین کی ترتیب پر محنت کی، اختصار کی رعایت میں سینکڑوں حوالوں کو ترک کرنا پڑا، بس اتنا اہتمام کیا کہ کوئی بات حوالہ کے بغیر اپنی جانب سے نہ لکھی جائے، اس وقت تک وقف کے موضوع پر لکھنے کا ارادہ نہیں تھا۔ اس کے بعد راقم فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب مدظلہ کی خدمت میں حاضر

ہوا، میں بے حد ممنون ہوں کہ قبلہ محترم حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب زید مجدہم نے فوراً وقت مرحمت فرمادیا اور بالاستیعاب ایک ایک لفظ بغور سماعت فرمایا، دوران سماعت دعائیہ کلمات اور بہت افزائی بھی فرماتے رہے اور جگہ جگہ اصلاح بھی دیتے رہے اور آخر میں فرمایا کہ جب اتنی محنت کی ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وقف کا موضوع بھی اس تحریر میں شامل کر دیا جائے، چنانچہ حضرت مخدوم و محترم کے حکم کی تعمیل میں وقف کے موضوع پر مقالہ کا اضافہ کیا۔ حضرت موصوف نے اس کی بھی سماعت اور اصلاح فرمائی، لیکن یہ ارشاد فرمایا کہ اگر عربی کی امہات کتب کے حوالوں کی بنیاد پر مضمون لکھا جاتا تو زیادہ بہتر تھا، چنانچہ پورا مضمون قلمزد کر دیا گیا اور دوبارہ اس موضوع پر محنت کی، پھر خدمت عالی میں پیش کیا، سماعت اور اصلاح کے بعد دعائیہ کلمات کے نوازا، فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب کی نظر اصلاح کے بعد حضرت الاستاذ مولانا معراج الحق صاحب صدر المدرین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت الاستاذ نے بھی شفقت و عنایت کا معاملہ فرماتے ہوئے چند ہی مجلسوں میں بالاستیعاب سماعت فرمائی، دوران سماعت بعض مقامات پر تبدیلی کی گئی اور ان دونوں بزرگوں کی اصلاحات کو مناقشہ کے بغیر قبول کیا گیا۔

اس کے بعد یہ احتیاط برتی گئی کہ مسودہ صاف کرنے کے بعد اس کی متعدد فوٹو اسٹیٹ کاپیاں تیار کرائی گئیں، ایک ایک کاپی حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی زید مجدہم اور حضرت مولانا قاضی زین العابدین صاحب زید مجدہم کی خدمت میں روانہ کر دی گئی، اور تین کاپیاں حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب، حضرت مولانا سعید احمد صاحب پانپوری، حضرت مولانا جمیب الرحمن صاحب قاسمی کی خدمت میں پیش کی گئیں، اول الذکر ہر دو حضرات تو اپنے ضعف و علالت کے سبب بالاستیعاب نہ دیکھ سکے۔ لیکن مؤخر الذکر



تینوں اساتذہ دارالعلوم نے بالاستیعاب نظر ڈالی اور جگہ جگہ نوٹ لکھے، پھر ایک مجلس مناقشہ منعقد کی گئی اور تبادُلہ خیالات کے بعد اصلاحات کی گئیں، ایک ایک کاپی حضرت مولانا محمد عثمان صاحب کاشف الہامی اور حضرت مولانا حکیم عزیز الرحمن صاحب کی خدمت میں پیش کی گئی، ان دونوں حضرات نے مکمل اعتماد کا اظہار فرمایا۔

اور اب اتنے مراحل سے گزرنے کے بعد کتاب نذر قارئین کی جا رہی ہے امکان کی حد تک احتیاط تو مکمل کی گئی ہے لیکن بشریت کے تقاضوں میں خامیوں کا رہ جانا مستبعد نہیں ہے اس لئے اہل علم اگر ازراہ خیر خواہی مفید مشوروں اور اصلاحات سے نوازیں گے تو شکریہ کے ساتھ دوسرے ایڈیشن میں اصلاح کر دی جائے گی۔

ناسپاسی ہوگی اگر ان حضرات علماء اور احباب کا شکریہ ادا نہ کیا جائے جن سے اس کتاب کی ترتیب کے دوران استفادہ، تبادُلہ خیال یا کسی بھی طرح کی مدد ملی گئی ہے۔ حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب استاذ حدیث دارالعلوم اور حضرت مولانا محمد عثمان صاحب کاشف الہامی سے ہر مسئلہ پر استفادہ یا تبادُلہ خیال کیا گیا ہے، موقع بہ موقع جن حضرات سے مدد ملی گئی ہے ان میں جناب مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی، حضرت مولانا سعید احمد صاحب پانیپوری، حضرت مولانا ہدایت الزمان صاحب کیرانوی، جناب مولانا بلال اصغر صاحب، جناب مولانا عبدالحق صاحب مدرا سی، جناب مولانا مجیب اللہ صاحب، جناب مولانا سید ارشد صاحب مدنی، جناب مولانا شبیر احمد صاحب میرٹھی، جناب مولانا نعمان الحق صاحب فاروقی، جناب مولانا عبدالحق صاحب سنہلی، جناب مولانا نسیم احمد صاحب، جناب مولانا قاری ابوالحسن صاحب اعظمی، جناب مولانا جمال احمد صاحب، جناب مولانا عبدالرؤف صاحب افغانی اساتذہ دارالعلوم کے نام شامل ہیں۔

اساتذہ دارالعلوم کے علاوہ جناب مولانا افتخار الحق صاحب روڑکی، جناب مولانا محمد اسلام صاحب محرر دارالافتاء، جناب مولانا محمد اسماعیل صاحب مدنی اور جناب مولانا جمیل الرحمن صاحب پرتابگڑھی کا بھی تعاون شامل رہا ایک موضوع پر جناب مولانا مفتی ظفر الدین صاحب اور جناب مولانا مفتی حبیب الرحمن صاحب خیر آبادی سے بھی تہلہ خیال کیا گیا۔

کتابوں کی فراہمی میں جناب مولانا محمد حنیف صاحب رفیق کتب خانہ دارالعلوم، جناب حکیم عبد الحمید صاحب ناظم کتب خانہ دارالعلوم، جناب مولانا شمیم احمد صاحب لکھیم پوری، جناب مولانا عتیق اللہ صاحب سہر سادی، مولوی اشتیاق احمد صاحب بہرائچی، مولوی محمد سفیان عرشی اور مولوی محمد سلیم صاحب سیتاپوری کی مدد شامل حال رہی۔

ترتیب کے بعد کتابت کا مرحلہ آیا تو جناب مولانا محمد اسرار ایل صاحب دمکادی مولانا نیاز الدین صاحب اصلاحی اور جناب منشی محمد وجاہت صاحب عثمانی نے بوجہت ممکنہ اس ضرورت کی تکمیل فرمادی، راقم الحروف ان تمام ہی محسنین و معاونین کا تہہ دل گمنون ہے دعا ہے کہ پروردگار عالم اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو صراطِ مستقیم پر گامزن رکھے، بغرضتوں کو معاف فرمائے اور اکابر کے حکم کی تعمیل میں جو محنت کی گئی ہے اس کو حسن قبول سے نوازے۔

می توانی کہ دی اشک مرا حسن قبول اے کہ در ساختہ ای قطره بارانی را

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الْحَكِيمُ

ریاست علی بجنوری غفرلہ

۱۹ صفر ۱۴۰۸ھ



حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مدظلہ

محقق مدد العلوم دیوبند

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على رسوله محمد وعلى آله وصحبه أجمعين

امّا بعد ! اسلام میں مناصب کی تقسیم کیلئے اہلیت کو معیار مقرر کیا گیا ہے  
ارشاد خداوندی ہے۔

ان الله يامرکم ان تؤدّوا  
الامانات الی اهلها۔

بے شک اللہ تم کو یہ حکم دیتا ہے کہ تمام  
امانتوں کو، ان کی اہلیت رکھنے والوں

تک پہنچا دو۔

(سورۃ النساء آیت ۵۸)

چنانچہ خیر القرون میں منصب خلافت سے لے کر ماتحت امارتوں تک  
مناصب کی تقسیم اہلیت کی بنیاد پر کی گئی اور اس اہلیت کی توثیق کا عمل اہم  
شوری بینہم کے حکم کی تعمیل میں شوری کے سپرد رہا، لیکن رفتہ رفتہ یہ بنیاد کمزور  
ہوتی چلی گئی۔ اور اسلامی حکومت میں شوریّت اور اہلیت کے بجائے وراثت  
کا عمل جاری ہو گیا۔

علماء کرام اور اخبار امت نے روز اول ہی سلاطین کے اس طرز عمل کی  
غلطی کا ادراک کر لیا، کچھ حضرات نے ارباب حکومت کی توجہ بھی ادھر مبذول  
کرائی اور درمیان میں ایسے حکمراں بھی آتے رہے جنہوں نے ابوان حکومت



کو وراثت کے بجائے شوری کی بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی لیکن ان نیک دل سلاطین کی کوششیں بار آور نہ ہو سکیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی سلطنت، وراثت کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی، علامہ طنطاوی ان حکمرانوں کے بارے میں اس طرح اظہار خیال فرماتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ شوری کا قیام واجباً

میں سے ہے، اور جبکہ ہمارے ضابطہ شریعت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی قوم سے مشورہ

فرمایا کرتے تھے جبکہ وحی آپ پر نازل ہوتی

تھی اور آپ صحابہ کے فیصلہ کو قبول فرمالیتے

اور ان کے ساتھ ہو جاتے تھے، اس صورت

میں کوئی بتلائے کہ سلاطین اسلام کو استبداد

بالرائے کا حق کیسے حاصل ہوا اور ماضی میں

انہوں نے شوری کو کیوں ترک کر دیا، یہی

کہا جاسکتا ہے کہ مسلمان سو رہے تھے، مجھے

بمذا بہت ہی زیادہ حیرت ہے کہ ان چند

مسلمانوں نے شوری کو کیسے ترک کر دیا اور

کیسے وہ امور مملکت میں مستبد بالرائے

ہو گئے اور کیسے انہوں نے اپنے فیصلے میں

ظلم کو روا رکھا، اس ظلم پیشہ قوم کی مثال

فہمنا اصبحت الشوری من

الواجبات واذا کان صاحب

شرعنا صلی اللہ علیہ وسلم یستشیر

قومہ والوحی ینزل علیہ فینزل علی

حکمہم ویسیر بامرہم فیالیت

شعری کیف استبد ملوک

الاسلام وکیف ترکوا الشوری

فی غابر الایام۔ الا انما القوم

کانوا نیاماً۔ واللہ لقد عجبت

العجب کلہ فکیف ترک بعض

المسلمین الشوری واستبدوا

بامورہم وظلموا فی حکمہم۔

الاساء مثلاً القوم الظالمون۔

وقد ان ان یرجعوا لمجدہم

وینالوا عزہم ویوفوا حظہم

(تفسیر الجواہر للطنطاوی ص ۱۵۷)

بہت بری ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ

مسلمان اپنی غفلت رفتہ کو واپس لائیں،

عزت حاصل کریں اور اس سلسلے میں

اپنا حصہ پورے طور پر وصول کریں۔

چنانچہ سلاطین کی اس غلط روش کے نتیجہ میں ایوانِ حکومت شوریٰ کی سرپرستی سے محروم ہو گیا تو علماء کرام نے اپنے لئے مقررہ حدود کی پابندی کو لازم کرتے ہوئے

محض اس کوتاہی کے سبب سلاطین کے خلاف کام کر نیکے بجائے علم و حکمت کے دبستانوں میں

شوریٰ کی بالادستی اور سرپرستی کا عمل جاری کر دیا، حضراتِ علماء نے شوریٰ کی زیر سرکردگی علوم و فنون

کی جو گرانقدر خدمات انجام دیں وہ اسلامی کتب خانہ کی صورت میں موجود ہیں اور جہاں

جہاں اسلامی حکومتیں قائم رہیں علماء کرام وہاں اپنی پسندیدہ روش پر قائم رہے کہ

سلاطین سے کوئی سروکار نہ رکھا جائے بلکہ شوریٰ کے ذریعہ کتاب و سنت کی طرف

مراجعت کر کے غیر منصوص مسائل کے شرعی احکام مدون کر دئے جائیں

اسی انداز پر صدیاں گزر گئیں، لیکن ہندوستان میں اسلامی حکومت کی

تحلیل کے بعد یہاں کی امت اسلامیہ کو بالکل تازہ صورتِ حال سے دوچار ہونا

پڑا، اس صورت میں اقتدارِ اسلامی کی بازیابی کی جدوجہد کے ساتھ، جب دین و

ملت کے بقا و تحفظ کی خاطر مدارسِ عربیہ کا نظام کار مرتب کیا گیا تو اکابرِ دیوبند

نے اس کو شوریٰ کی بنیادوں پر استوار کیا، یہ عبقری صفت اکابر، اسلام، اس کی

تعلیمات، اس کے مزاج، اس کی روح اور احکامِ شرعیہ اور ان کے مقاصد کے

سلسلے میں خداداد بصیرت کے ساتھ، زہد و تقویٰ اور پاکبازی میں اپنی نظیر آئیے

ان کے سامنے شوری کے بارے میں قرآن و حدیث کی نصوص تھیں، قرآن کریم میں خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کا حکم دیا گیا۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ  
(سُورَةُ الْأَعْرَافِ آیت ۱۵۹)

اور اس حکم ربانی کی تعمیل میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا پورا عہدہ غیر منصوص معاملات میں مشورہ کرتے ہوئے گزارا۔

مشورہ کی اہمیت بیان کرنے کیلئے قرآن کریم میں صحابہ کرام کی صفات مدحیہ بیان کرتے ہوئے فرائض و واجبات کے درمیان یہ صفت بیان فرمائی گئی۔

وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا

الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ

وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ۝

(سُورَةُ الشُّرَى آیت ۳۸)

ایمانیات اور فرائض کے درمیان شوری کا تذکرہ اس کی اہمیت کو بیان کرنے کیلئے کافی تھا، چنانچہ خیر القرون کے مسلمانوں نے اس کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا اور صحابہ کرام کا پورا زمانہ شوری کی ملو افشائیوں سے منور رہا کہ تمام غیر منصوص اور انتظامی معاملات کا فیصلہ اس طرح کیا جاتا رہا کہ ہر موقع پر شوری طلب کی گئی اور اس نے ان تمام معاملات میں کتاب و سنت کی طرف مراجعت کر کے اپنا فرض منصبی باحسن وجود ادا کیا، کیونکہ ایسے تمام معاملات میں امت کو صرف یہی حکم دیا گیا تھا کہ



فان تنازعتم فی شئی فردوه  
الی اللہ والرسول۔

رسورۃ النساء آیت ۵۹ اور رسول کے حکم کی طرف مراجعت کرلو،

ان احکام خداوندی کی روشنی میں، اکابر علمائے مدارس عربیہ کا نظام کار مرتب فرمایا تو شوری کو وہی مقام دیا جس کی وہ مستحق تھی چنانچہ ہندوستان کے علمی قافلے عرصہ دراز تک اسی شاہراہ پر گامزن رہے جو اکابر نے منتخب فرمائی تھی۔ لیکن جس طرح اسلامی سلطنت کو شوری سے ملکیت وراثت میں تبدیل کرنے کا عمل تدریجی طور پر وجود میں آیا اور اس کی تلافی نہ ہو سکی بالکل اب یہ مرحلہ ہندوستان کے مدارس عربیہ کو درپیش ہے کہ شوری کی بالادستی سے انکار کیلئے راہیں تلاش کی جا رہی ہیں، اور حیلوں کو عزیمت قرار دینے کی جدوجہد شروع کر دی گئی ہے۔ پھر چونکہ اس دور کا سب سے بڑا ہتھیار علم ہے اسلئے مدارس عربیہ سے شوری کو ختم کرنے کے حامی علماء کرام نے خواہ ان کی نیت بخیر ہو اپنے نقطہ نظر کو علمی طور پر مدلل کرنے کا کام شروع کر دیا ہے، اس لئے ضروری تھا کہ اس موضوع کا خالص علمی اور تحقیقی جائزہ لیا جائے۔ اور واضح کیا جائے کہ ہندوستان کے مدارس عربیہ کا نظام کار مرتب کرنے والے اکابر علماء کے سامنے کیا حقائق تھے جن کی بنیادوں پر انھوں نے شوری کو با اختیار رکھا اور تمام عہدیداران مدارس کیلئے شوری کی ماتحتی میں کام کرنے کا لائحہ عمل مرتب فرمایا۔

زیر نظر کتاب اسی موضوع کا ایک مثبت اور معروضی جائزہ ہے جس میں سب سے پہلے مدارس عربیہ کے نظام کار کی تشریح کی گئی ہے اور اکابر کے ارشادات کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے کہ مدارس عربیہ کے عہدے داروں میں کس منصب کی کیا شرعی حیثیت ہے، پھر شوری کا شرعی مقام واضح کیا گیا ہے، شوری کا مسئلہ چونکہ اس تحریر کا بنیادی نقطہ بحث تھا، اس لئے

اس موضوع کے تمام پہلوؤں کا مبسوط جائزہ لیا گیا ہے، اور بتلایا گیا ہے کہ عہد رسالت اور خلافت راشدہ میں شوری کا طرز عمل اور دائرہ کار کیا تھا، پھر قرآن و حدیث اور فقہ اسلام میں شوری کیلئے پائی جانے والی حقیقتوں کو واضح کیا گیا ہے اور یہ بات پوری طرح واضح اور ثابت کر دی گئی ہے کہ مدارس عربیہ میں شوری کی بالادستی شبہ سے بالاتر ہے ان خالص علمی اور تحقیقی مضامین کے درمیان، شوری کی بالادستی کا انکار کرنے والے نقطہ نظر کے دلائل کا جائزہ بھی آگیا ہے جس سے غلط فہمیوں کے ازالہ میں پوری طرح مدد ملی جاسکتی ہے۔ شوری کی بحث سے فارغ ہونے کے بعد مدارس عربیہ کے دستور اساسی اور اس کے رجسٹریشن کا مسئلہ بھی واضح کر دیا گیا ہے، اور سب سے آخر میں مدارس عربیہ اور وقف کے موضوع کا قابل اعتماد تجزیہ کر کے واضح کر دیا گیا ہے کہ ان کی کتنی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مصنف نے ہر موضوع پر قرآن و سنت اور فقہائے امت کے فتاویٰ کی روشنی میں نہایت محققانہ بحث کی ہے اور ہر موضوع کو دلائل کی قوت سے مدلل کر دیا ہے۔ موصوف نے اس تحقیق و تدقیق میں کس قدر کوشش کی ہے اس کا اندازہ مآخذ اور حوالوں سے کیا جاسکتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غالباً مبالغہ نہ ہوگا کہ موضوع زیر بحث پر اس سے زیادہ محنت و کاوش نہیں کی جاسکتی۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

دعا ہے کہ خداوند عالم اس سعی کو مشکور فرمائے، اور خلوص و دیانت کے ساتھ جن تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے یہ خدمت انجام دی گئی ہے۔ اپنے فضل و کرم سے اس سلسلے میں اس کو نفع بخش فرمائے۔ آمین

مرغوب الرحمن عفی عنہ

۸/ صفر المظفر ۱۴۰۸ھ

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لله رب العلمین والصلاة والسلام علی رسولہ محمد  
وعلی آلہ وصحبہ اجمعین! اما بعد۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی  
ذاتِ اقدس کو پروردگار عالم نے تمام انسانی کمالات کا جامع مرقع بنایا، جمالِ فطرت  
کی تمام نیزنگیاں اور کمالِ انسانیت کی ساری کائنات آپ کی شخصیت میں سمیٹ کر  
اعلان فرمادیا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ  
حَسَنَةٌ مِّنْهُ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں  
تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بے شمار محاسن میں ایک اہم کمال، کمالِ علمی  
ہے، خداوند قدوس نے آپ کی تربیت اپنی صفتِ علم سے فرمائی اور کمالِ علمی آپ کی  
ذاتِ پاک کا طغرائے امتیاز بن گیا، چنانچہ آپ کی حیاتِ طیبہ کا ایک لیکچر اشاعتِ  
علم کیلئے وقف رہا۔ آپ کے ارشادات اور آپ کے افعال ہی نہیں بلکہ آپ کی موجودگی  
میں کئے جانے والے وہ کام بھی جن پر آپ نے سکوت فرمایا، علم قرار پائے۔

امتِ مسلمہ کو علم کی دولت سے مالا مال کرنے کیلئے آپ نے مسجد نبوی سے  
ملحق ایک چبوترہ بنوایا جسے صفحہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جو تاریخِ انسانیت میں  
طالبانِ علم دین کا پہلا اجتماعی مدرسہ ہے، مسلمانوں میں علم کی صحیح تڑپ پیدا کرنے  
کیلئے آپ نے علم کی طلب کو فریضہ قرار دیا۔



طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى  
كُلِّ مُسْلِمٍ رَمَكُوهُ كِتَابُ الْعِلْمِ  
علم کی طلب ہر مسلمان کے لئے  
فرض ہے۔

طَلَبُ عِلْمٍ كَيْفَ سَفَرٍ كَرْنِي كِي اِهْمِيَّتْ كُو قُرْآنِ كَرِيمِ مِي اِس طَرَحِ بَيَانِ فَرْمَايَا كِيَا  
فَلَوْلَا نَفَرٌ مِّنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ  
لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا  
قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ  
سو كِيُونِ زَنَكَلَا هَرْ فِرْقَةٍ مِي سَ اِن كَا اِيَكِ  
حَصَّةً، تَاكِي سَمَجْهِي سِيْدَا كَرِيْسِ دِيْنِ مِيْنِ اُوْر  
تَاكِي خَبَرْ پَهِنچَايِيْنِ اِيْتِي قَوْمِ كُو جَب كِي بُوْشْ كَر  
رِسُوْرَةُ التَّوْبَةِ اِيَةِ ۱۲۳  
آيِيْنِ۔

چنانچہ روزِ اوّل سے امتِ مسلمہ نے علم کے حصول اور اس کی ترویج و اشاعت  
کیلئے وہ کارنامے انجام دئے جن کے اندراج سے انسان کا قلم عاجز رہا اور شاید  
ان کی سرگزشت کی تفصیل فرشتوں کے لکھے ہوئے نامہ اعمال کے علاوہ کہیں  
دستیاب نہ ہو سکے گی۔

مسلمانوں کی ان علمی سرگرمیوں کی تاریخ میں کتنی ہی صدیاں ایسی گزری ہیں  
کہ حصولِ علم کے لئے باقاعدہ درس گاہوں کا نظم نہیں تھا بلکہ ہر عالمِ دین اور ہر صاحبِ  
فن کی چوکھٹ، صحیح طلب رکھنے والوں کی توجہ کا مرکز بنی رہتی تھی اور اسی طرح قرون  
تک چراغ سے چراغ جلتے رہے اور ایک نسل سے دوسری نسل میں علم منتقل ہوتا  
رہا، پھر ضرورت محسوس ہوئی اور ان انفرادی کوششوں کے ساتھ مدارس کا قیام  
عمل میں آنے لگا، تاریخ اسلام میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں چھوٹے بڑے مدارس  
قائم ہوئے اور عموماً انفرادی یا اجتماعی طور پر علم کی ترویج و اشاعت کا فریضہ انجام دینے  
والوں کو حکومتِ وقت یا صاحبِ ثروت علم دوست مسلمانوں کی سہولتی حاصل رہی

ہندوستان کی علمی سرگرمیوں کا حال بھی عالم اسلام سے کچھ مختلف نہیں رہا۔ یہ سرزمین بھی عالم اسلام کے دیگر علاقوں کی طرح علوم نبوت کے چراغوں اور میناروں سے جگمگاتی رہی، تاریخ میں ایسے ہزاروں علماء کے نام محفوظ ہیں جن کے دروازوں سے علم کے ساغر و مینا تقسیم ہوئے، ایسے ہزاروں مراکز کی یادیں تاریخ کے سینے میں محفوظ ہیں جہاں اجتماعی طور پر میراث نبوت میں سے علم، یا علم و عرفان کی دولت تقسیم ہوتی رہی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صفہ کی اقتدار میں اہل علم نے کتنی ہی مسجدوں سے عبادت گاہ کے ساتھ مدارس کا کام بھی لیا، آج بھی ہزاروں مسجدوں کے قرب و جوار کے تعمیری نشانات یا صحن مسجد سے ملحق کمروں کا انداز، زبان حال سے ترجمانی کر رہا ہے کہ یہاں کبھی علمی قافلوں کا قیام رہا ہے، بلکہ ہندوستان کے بہت سے مقامات میں آج تک مسجدوں سے درسگاہوں کا کام تسلسل کے ساتھ لیا جا رہا ہے۔

## ہندوستان، اقتدار اسلامی کے زوال کے بعد

علم دین کی ترویج و اشاعت کا یہ کام برابر ہوتا رہا۔ لیکن جب ہندوستان میں اسلامی اقتدار کا آفتاب غروب ہو گیا تو اسلام کو انسانیت کے حق میں خدا کی سب سے بڑی نعمت سمجھنے والوں کیلئے اس بڑے عظم کا تاریکیوں میں ڈوب جانے کا حادثہ، ناقابل برداشت صدمہ ثابت ہوا۔

ایک طرف ہندوستان میں غیر ملکیتوں کا تسلط اور دوسری طرف خدا کی سب سے بڑی نعمت کے تحفظ کی فکر، چنانچہ اکابر دارالعلوم نے ایک طرف تو اقتدار کی بازیابی کیلئے مسلح جدوجہد کی جسکی پوری تفصیلات اول تو محفوظ نہیں ہیں، دوسرے یہ کہ ان کے

بیان کا یہ موقع نہیں تاہم حضرت مولانا عبید اللہ سندھی قدس سرہ کی التہید لائٹ الاکادمی کا ایک اقتباس پیش کرنا مناسب ہے۔

ووقعت نحو سبعین معركة في  
اطراف دہلی فی مدّة اربعة  
اشهر فما وصل اليهم من كان  
واجبا عليه نصرهم من ولاية  
حيدرآباد وكابل بل تركوهم  
وخذ لوهم وشاركوا الاعداء  
فوقع الفشل في محرم ١٢٧٢ لله ثم  
القتل والاسر والفرا فلا تسأل  
كيف مضى عليهم تلك السنة  
(التہید لائٹ الاکادمی)

دہلی کے قرب وجوار میں چار مہینہ کی مدت  
میں تقریباً ستر معرکے وقوع پذیر ہوئے  
اور حیدرآباد و کابل وغیرہ کے حکمرانوں  
کی جانب سے جو امداد پہنچنا ضروری تھی  
وہ نہیں پہنچ سکی، بلکہ ان حکمرانوں نے  
علماء کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا اور دشمنوں کے  
ساز کر لی چنانچہ محرم ۱۲۷۲ھ میں شکست  
واقع ہو گئی، پھر قتل، گرفتاری اور فرار  
کے واقعات پیش آئے، پھر نہ پوچھئے کہ  
یہ سال علماء پر کیسے گزرا۔

اکابر کی یہ مسلح جدوجہد ۱۲۷۲ھ میں شروع ہوئی لیکن قضا و قدر  
کے فیصلوں کے مطابق وہ اس میں کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکے بلکہ کچھ مزید الزامات  
ان کے حصّہ میں آ گئے، اس نازک وقت میں دین کے تحفظ کی فکر نے ان بزرگوں  
کو ماہی بے آب بنادیا اور ان حضرات نے فیصلہ کیا کہ دین و شریعت کے تحفظ  
کیلئے اسلامی مدارس کا قائم کرنا انشاء اللہ مفید ہوگا، مولانا عبید اللہ سندھی کی زبان  
سے اس کی اجمالی کیفیت سنئے۔

اہمۃ الحزب الدہلوی اجتمعوا  
دہلوی جماعت کے اساطین حجاز میں جمع ہوئے



فی الحجاز واجمعوا علی تاسیس  
مدرسة دینیة جامعة فی الهند  
علی تمثال المدرسة الدہلویة  
ردہی کالج، التی اسست فی زمان الامام  
عبدالعزیز وکان المدرسون بها  
الصدر السعید مولانا عبد الغنی  
ثم شیخ مشائخنا التسعة وشیخنا  
الدہلوی ثم استاد الاساتذہ  
مولانا مملوک علی الدہلوی وسد  
بعد المحاربة سنة ۱۲۸۵ھ فما قدروا  
علی ذلک الا فی دیوبند قریباً من  
دہلی فاشتغلوا بتاسیس المدرسة  
وتکیلها من محرم سنة ۱۲۸۳ھ ومن  
تلک الايام سمیت الطائفة  
بالدیوبندیة وقبل ذلک کانوا  
لا یعرفون الا بالدہلویة۔

امراء الطائفة کانوا مقیمین  
بالحجاز منهم الامیر امداد اللہ  
التھانوی ومنهم الامام عبد الغنی

اور انھوں نے ہندوستان میں ایک ایسے  
دینی جامع مدرسہ کی بنیاد ڈالنے پر اتفاق رائے  
کر لیا جو دہلی کالج کے انداز پر قائم کیا جائے  
دہلی کالج وہ مدرسہ ہے جو شاہ عبد العزیز کے  
زمانہ میں قائم ہوا تھا اور جس کے مدرسین  
میں صدر سعید مولانا عبد الغنی، پھر شیخ المشائخ  
رشید الدین، اور پھر استاد الاساتذہ مولانا  
مملوک علی دہلوی تھے، اور جو سنة ۱۲۸۵ھ میں  
معرکہ آرائی کے بعد بند کر دیا گیا تھا، چنانچہ  
اکابر اپنے منصوبہ کی تکمیل پر دہلی کے قریب  
دیوبند میں کامیاب ہو گئے اور محرم ۱۲۸۳ھ  
میں مدرسہ کی تاسیس و تکمیل میں مشغول ہو گئے  
اسی وقت سے اس جماعت کو، دیوبندی  
جماعت کے نام سے یاد کیا جانے لگا، جبکہ  
اس سے پہلے یہ جماعت، دہلوی جماعت کے  
نام سے مشہور تھی۔

جماعت کے امراء حجاز میں مقیم تھے جن میں  
حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور شیخ عبد الغنی  
مجددی شامل ہیں، یہ حضرات حجاز

الدہلوی و کافوایرید و تثبیت  
مرکز الاسلام فی الحجاز و تجدید  
مرکز النهضة الهندیة فی جبال  
الافاغنة و کان وکیل الامیر  
فی الہند شیخ مشائخنا شیخ  
الاسلام مولانا محمد قاسم  
الدیوبندی الخزانہ القہید لائمتہ التجلید

مقدس میں ایک اسلامی مرکز کو مضبوط  
کرنا چاہتے تھے، اور افغانستان میں  
ہندوستانی تحریک کے مرکز کی تجدید کا  
ارادہ رکھتے تھے اور ہندوستان میں  
نائب امیر کی حیثیت سے شیخ الاسلام  
حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ  
کام کر رہے تھے۔

یعنی ۱۳۲۷ھ کی مسلح جدوجہد کی ہم میں ناکامیوں کے بعد یہ حضرات ہندوستان  
سے ہجرت پر مجبور ہو گئے اور انھوں نے حجاز مقدس میں جا کر پناہ لی، پھر غور و فکر کے  
بعد ہندوستان میں دہلی کالج کے انداز پر ایک بڑا مدرسہ قائم کرنے کی تجویز پاس  
ہوئی، حاجی امداد اللہ اور شیخ عبدالغنی رحمہم اللہ کے پیش نظر تین مقامات پر مرکز قائم  
کرنا ضروری تھا۔ حجاز مقدس میں، افغانستان میں اور ہندوستان میں، حسن اتفاق  
کہ ہندوستان میں ان اکابر کو اپنے نقطہ نظر کی تکمیل کیلئے ایک نہایت کامیاب  
وکیل شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ میسر آ گئے،

ان حضرات کے پیش نظر کیا مقاصد تھے؟ یعنی وہ صرف ایک مدرسہ قائم کرنا  
چاہتے تھے کہ علم دین کی ترویج و اشاعت کیلئے وہ ایک معیاری درس گاہ قائم فرمادیں  
یا اس کے علاوہ بھی ان کے سامنے کچھ حقائق تھے، اس کے لئے مولانا عبید اللہ سندھی  
رقم طراز ہیں۔

نحران کان قطر من المسلمین پھر یہ کہ اگر مسلمانوں کے کسی ملک پر

کفار کا تسلط ہو جائے تو ان عام مسلمانوں  
پر جو ہجرت پر قادر نہ ہوں اپنے تعلیم اور  
افتاء کے معاملات میں مراجعت کے لئے  
امام کا قائم کرنا واجب ہو جاتا ہے، اور  
ہمارے مشائخ جنہوں نے دہلی کے قریب  
دیوبندی مدرسہ کی بنیاد رکھی اور اس کی بہت  
سی شاخیں ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں  
قائم فرمائیں ان کا مقصد اسی واجب کی  
ادائیگی تھا، چنانچہ اللہ نے ان کے کام میں  
برکت عطا فرمائی اور ان مدارس سے یکے  
بعد دیگرے ولی اللہی انداز خفیت رکھنے

والی جماعتیں پیدا ہوتی رہیں۔

تغلب علیہ الکفار وجب علی علمۃ  
المسلمین الذین لا یقدرون علی  
الہجرة ان ینصبوا لہما ما  
یرجعون الیہ فی التعلیم والفتیاء  
ومشائخنا الذین اسسوا المدرستہ  
الدیوبندیۃ بقرب دہلی وفروعہا  
لہا فی اطراف الہند کان مقصودہم  
اداء هذا الواجب، فبارک اللہ فی  
صنیعہم وتخرج منها فوج بعد فوج  
علی السلیقۃ الواحدۃ الولی اللہیۃ  
الحنفیۃ۔

(مواقف السُرخدین ص ۳۶۴ بحذف سیر)

فلسفہ ولی اللہی کے کامیاب شارح اور حکمت قاسمی کے معتبر ترجمان حضرت مولانا عبید اللہ  
سندھی قدس سرہ اس اقتباس میں یہ فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں اسلامی اقتدار کے  
ختم ہو جانے اور غیر مسلموں کے ہاتھ میں زمام اقتدار آ جانے کے بعد جو مسلمان ہجرت پر  
قادر نہیں تھے ان کے ذمہ امامت کا قائم کرنا ایک فریضہ کے طور پر عائد ہوتا تھا اور اکابر  
مروجین نے دیوبندی مرکز میں درگاہ قائم کرنے کے بعد جو ہندوستان میں جگہ جگہ  
مدارس قائم فرمائے اس میں ان کے پیش نظر اسی نصب امامت کے فریضہ کی ادائیگی تھا  
نصب امامت کا فریضہ کسی نہ کسی درجہ میں مدارس عربیہ کے قیام سے کس طرح ادا

ہوا۔ اس کی وضاحت کے لئے مدارس عربیہ کے نظام کار میں مجلس شوریٰ کی شرعی حیثیت کا معلوم کر لینا ضروری ہے۔ اس لئے ہم پہلے دارالعلوم کے آغاز کی نوعیت پر قدرے روشنی ڈالیں گے اور پھر اکابر کے ارشادات سے مجلس شوریٰ کی شرعی نوعیت و حیثیت واضح کریں گے۔

## دارالعلوم کے آغاز کی نوعیت

سبع جدوجہد کے جو نتائج سامنے آئے تھے اس کے بعد یہ تصور نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اس طرح کے کاموں کی سرپرستی اقتدار کئی رکھنے والی طاقت کر سکے گی۔ کیونکہ یہ طاقت ختم ہو چکی تھی، یا اس کے مصارف کی کفالت صاحب ثروت مسلمان کر سکیں گے کیونکہ یہ حضرات بھی تباہ ہو چکے تھے اور اس تازہ صورت حال سے خائف بھی تھے۔ اس لئے اکابر مروجین نے اس نئی صورت حال میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق مشورے کئے، آپ کا ارشاد ہے۔

عن علی قال قلت یا رسول اللہ  
ان نزل بنا امر لیس فیہ بیان امر  
ولا نہی فما تامرنی، قال شاوروا  
فیہ الفقہاء العابدین ولا تمضوا  
فیہ رای خاصۃ۔

حضرت علیؑ سے روایت ہے کہ میں نے عرض  
کیا، یا رسول اللہ! اگر کوئی ایسی صورت پیش  
آجائے جس میں آپ کی جانب سے امر یا نہی  
کی وضاحت نہ ہو تو آپ کیا حکم دیتے ہیں،  
آپؐ نے فرمایا کہ اس معاملہ میں فقہاء اور عباد

گزاروں مشورہ کرو اور خاص لوگوں کی رائے  
اس سلسلے میں نافذ نہ کرو۔

چنانچہ آپؐ کے ارشاد کے مطابق حجاز مقدس میں حضرت حاجی امداد اللہ اور شیخ



عبد الغنی قدس سرہما نے مشورے کئے اور ہندوستان میں ان کے نائب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ نے بار بار مشورے فرما کر ایک طریق کار کا تعین کیا۔

حضرت اقدس مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ کی اس زمانہ میں دیوبند میں بہت زیادہ آمدورفت تھی، محلہ دیوان میں آپ تشریف لاتے اور چھتہ کی مسجد میں نمازیں ادا کرتے، چھتہ کی مسجد حضرت حاجی عابد حسین قدس سرہ کی قیام گاہ ہونے کے سبب اہل علم اور ارباب تقویٰ کا مرکز تھی، وہاں بار بار اس موضوع پر تبادلہ خیال ہوا اور ان حضرات کے مشوروں میں بھی یہ بات طے ہو گئی کہ اب اپنے منصوبوں کی تکمیل کیلئے تعلیم گاہوں اور مدرسوں کا قائم کرنا ہی ضروری ہے، لیکن اسلامی حکومت کے ختم ہو جانے اور صاحب ثروت مسلمانوں کے تباہ ہو جانے کے بعد مدارس کے لئے مصارف کا کیا انتظام ہوگا تو ان بزرگوں نے اس کے لئے عوامی چندہ کی تدبیر پر غور کیا، دارالعلوم سے پہلے عوامی چندہ کے ذریعہ کسی ادارہ یا مدرسہ کے چلائے جانے کی بات تاریخ میں محفوظ نہیں ہے۔ حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحب اور حضرت مولانا محمد میاں صاحب ایک استفتاء کے جواب میں لکھتے ہیں۔

”موجودہ مدارس، دارالیتامیٰ یا تبلیغی اداروں کا سلسلہ اقطار ہند میں اس وقت قائم ہوا جب کہ اسلامی حکومت ختم ہو چکی تھی اور ارباب بصیرت و فراست اکابر نے محسوس کیا کہ اس قسم کے سلسلے کے علاوہ بلاد ہند میں احکام اسلام کے تحفظ کی کوئی تسکین نہیں، غالباً اس نظام مبارک کا پہلا موتی دارالعلوم دیوبند ہے۔“

(فتویٰ مطبوعہ روزنامہ الجمعۃ اکتوبر ۱۹۳۵ء)

مگر عوامی چندہ حاصل کرنا، بیت المال اور اسلامی نظم پر موقوف ہے، اس لئے ان

اکابر نے ارباب حل و عقد افراد پر مشتمل ایک مجلس تشکیل کی جو مفاداتِ عامہ کے تحفظ کے باب میں امام کی قائم مقام ہو اور شرعاً اس کے لئے عوامی چندہ حاصل کرنا اور مصارفِ خیر میں صرف کرنا جائز ہو۔

چونکہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور ان کے وہ رفقا جو مسلح جدوجہد میں پیش پیش تھے وہ حکومتِ متسلط کی نگاہوں میں آچکے تھے، ان کے خلاف مقدمات بھی قائم ہو چکے تھے، قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کر چکے تھے اس لئے دین کے تحفظ کی کسی بھی جدوجہد میں ان اکابر کا بالکل سامنے رہنا، خود اس جدوجہد کیلئے نقصان دہ ہو سکتا تھا۔

ان حالات میں مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور و مشورہ کے بعد، جو اعلان دارالعلوم کے قیام سے متعلق شائع کیا گیا اس میں بہت احتیاط برتی گئی اور صرف وہ بات ظاہر کی گئی جو سب کے نزدیک قابلِ تعریف ہو اور کسی کے لئے اس پر انگلی اٹھانے کی گنجائش نہ ہو اس اعلان و اشتہار کے متن کے علاوہ ہمارے پاس کوئی دستاویز ایسی نہیں ہے جس کی بنیاد پر ہم یہ دعویٰ کر سکیں کہ ان اکابر نے چھتہ کی مسجد میں دارالعلوم کی بنیاد پہلے کتنی مجلسیں منعقد کیں اور ان میں کیا کیا تجاویز زیر غور آئیں، بلکہ ہمارے پاس تاریخی وثیقہ کے طور پر صرف ایک اشتہار ہے جس کا متن یہ ہے۔

## اشتہار

الحمد للہ کہ مقام قصبہ دیوبند ضلع سہارنپور میں اکثر اہل ہمت نے جمع ہو کر کسی قدر چندہ کیا اور ایک مدرسہ عربی پندرہ محرم الحرام ۱۲۸۴ھ سے جاری ہوا اور مولوی محمد محمود صاحب بالفعل بمشاہدہ مع ماہوار مقرر ہوئے، چونکہ لیاقت مولوی صاحب کی

بہت کچھ ہے اور تنخواہ بسبب قلتِ چندہ کے کم، ارادہ مہتمان مدرسہ کا ہے کہ بشرط وصول زر چندہ قابل اطمینان جس کی امید کر رکھی ہے تنخواہ مولوی صاحب موصوف کی زیادہ کی جاوے اور ایک مدرس فارسی و ریاضی کا مقرر ہو، جملہ اہل ہمت و خیر خواہان ہند خصوصاً مسلمانان سکنائے دیوبند و قرب جوار پر واضح ہو کہ چندہ مفصلہ فہرست ہذا کے کہ جسکی میزان ۸/۴۰۱ ہے دوسرا چندہ واسطے خوراک و مدد و خراج طلبہ بیرونجات کے جمع ہوا ہے اور سولہ طالب علموں کا سفر جمع ہو گیا ہے اور انشائاً اللہ روز بروز جمع ہوتا جاتا ہے، اس میں طلبہ بیرونجات کو کھانا پکا پکایا اور مکان رہنے کو ملے گا، کتابوں کا بندوبست بھی متعاقب ہوگا نام مہتمان کے درج ذیل ہیں جن صاحبوں کو روپیہ چندہ بھیجنا منظور ہو تو بنام اونکے بذریعہ خط میزنگ ارسال فرمادیں، رسید اس کی بصیفہ پید بھیجی جاوے گی فقط حاجی عابد حسین صاحب، مولوی محمد قاسم صاحب، نانوتوی، مولوی مہتاب علی صاحب، مولوی ذوالفقار علی صاحب، مولوی فضل الرحمن صاحب، منشی فضل حق صاحب، شیخ نہال احمد صاحب العبد، فضل حق، سربراہ کار مدرسہ عربی و فارسی و ریاضی قصبہ دیوبند ضلع سہارنپور

تقریر بتاریخ ۱۹ محرم ۱۲۸۲ھ بروز دوشنبہ ۱۰

## مجلس شوری کی تشکیل دارالعلوم سے پہلے

اس مختصر اشتہار میں یوں تو کتنی ہی باتیں قابل توجہ ہیں، کیونکہ اپنی تمام قوتوں کو دین کی سربلندی کیلئے وقف کرنے والے یہ اکابر، یہ واضح نہیں فرما رہے ہیں کہ ان کا

منصوبہ کیا ہے، کتنے عرصہ تک پیشانیاں بارگاہِ خداوندی میں سجدہ ریز رہیں۔ حجاز مقدس سے ہندوستان تک کتنے اکابر کے دل و دماغ نے غور و فکر کے کتنے مرحلے طے کئے، قید و بند اور ترک وطن کی کتنی منزلوں سے گزرنے کے بعد اس اقدام کی نوبت آئی، وہ یہ سب کچھ دانستہ چھپا رہے ہیں، مگر جتنی باتیں بھی ظاہر کی گئی ہیں ان میں تین چیزیں خصوصی توجہ کی طالب ہیں۔

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ مجلس شوریٰ کی تشکیل، قیام دارالعلوم سے پہلے ہی کیونکہ اشتہار میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اکثر اہل ہمت نے جمع ہو کر چندہ کیا، اور پھر ایک مدرسہ عربیہ جاری ہوا۔ اشتہار میں "مہتمان" کا لفظ دوبار آیا ہے جس کا کھلا مفہوم یہ ہے کہ فرد واحد کے ذریعہ نہیں، بلکہ پوری ایک جماعت کے ذریعہ اس کار خیر کی ابتدا ہوئی ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ مدرسہ کا چندہ کے علاوہ اور کوئی ذریعہ آمدنی نہیں ہے تمام مصارف چندہ پر انحصار کرتے ہیں اور اسی لئے چندہ کے حصول پر زور دیا گیا ہے۔

۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ چندہ وصول کرنے والا فرد واحد نہیں بلکہ چندہ وصول کرنے والے تمام بزرگوں کو مہتمان کے نام سے موسوم کیا گیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ابتداءً چندہ بھی جماعت کے نام پر آ رہا ہے اور مدرسہ کا نظم و نسق بھی باہمی مشورہ سے انجام پا رہا ہے۔

اسی سال کی رُوداد میں ذکرِ آئین مدرسہ کے عنوان سے بھی ۹ دفعات درج کی گئی ہیں جس کا مفہوم یہ ہوا کہ دستور اساسی کی بنیاد بھی اسی وقت پڑ گئی ہے، غرض اس اشتہار سے شوریٰ کی دارالعلوم سے پہلے تشکیل، شوریٰ کی بالادستی، چندہ کے شوریٰ کے نام پر آنے کی بات پوری طرح واضح ہے۔ البتہ یہ بات واضح نہیں ہے کہ یہ ایک مدرسہ نہیں بلکہ تحریک



لیکن ۱۲۸۵ء کی روداد کے آخر میں جو اشتہار دیا گیا ہے اس سے یہ مضمون بھی کسی نہ کسی درجہ میں واضح ہو جاتا ہے، اس اشتہار کا متن یہ ہے۔

## خاتم دعا و شکر یہ

الہی ہزار ہزار شکر و احسان تیرا کہ ہم سے ناجیز بندوں سے تو نے ایسا کام بزرگ لیا اور نہ اس چھوٹے سے قصبہ دیوبند میں نہ ایسے ذی مقدور لوگ ہیں کہ کفیل اتنے بڑے کام بزرگ کے ہوتے اور نہ ایسے اسباب تعلیم و تعلم موجود تھے کہ جن سے امید اجراء تعلیم خیال میں آئے۔ یہ تیرا ہی احسان ہے کہ اتنے اتنے دور دراز جگہ پر سے کہ جہاں وہم و گمان بھی نہ پہنچتا تھا اہل ہمت کو اس کی امداد پر متوجہ فرمایا اور طالبان علوم عربیہ کے لئے ایک در فیض کھول دیا۔ و ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم

الہی برکت دے تو ان کی ہمت عالی میں اور وسعت عطا فرما ان کے مال میں کہ معاون ہیں وہ اس مدد کے اور ہمت دے تو ان کو کہ تجویز و اجرا اس کا رنیک کا وہ اپنے شہروں میں بھی فرمائیں۔ آمین یا رب العالمین۔

اہل دیوبند نہایت شکر گزار ہیں ان باہمت صاحبوں کے جنہوں نے اسکی ترقی میں کار خیر سمجھ کر کوشش بلخ فرمائی اور مال سے، کتب سے فہمائش زبان سے دریغ نہ فرمایا اور نہایت خوشی اپنی ظاہر کرتے ہیں اس امر پر کہ اکثر حضرات باہمت نے اجراء مدارس عربی کو تو سیلح دینے میں کوشش کر کے مدارس مقامات مختلفہ دہلی، میرٹھ، دھرم پور، دکن وغیرہ میں جاری فرمائے اور دوسری جگہ مثل علی گڑھ وغیرہ میں اس کار کی تجویزیں ہو رہی ہیں۔ اور

امید کرتے ہیں کہ ہم کو بھی وہاں کے حسابات و حالات سے کبھی کبھی جیسا کہ یہاں کے مہتمم بھی کرتے ہیں مطلع فرماتے رہیں تاکہ جو عمدہ انتظام ان کے مدارس میں تجویز ہو وہ یہاں بھی جاری کئے جایا کریں اور یہاں سے وہاں، اور نتیجہ اس نیک تدبیر کا یہ ہوگا کہ انتظام سب جگہ کے قریب یکساں ہو جاویں گے۔

المشتھر - ارباب مشورہ مدرسہ عربیہ دیوبند  
حسب تجویز ارباب مشورہ مشتہر کئے گئے۔ المرقوم یکم محرم ۱۲۸۶ھ

العبد محمد رفیع الدین مہتمم مدرسہ

اس اشتہار میں بھی چندہ پر انحصار، ایک نئے تجربہ کی کامیابی اور توقع سے زیادہ کامیابی پر بارگاہِ خداوندی میں شکر و سپاس پیش کیا گیا ہے کہ اس طرح طلبہ کے لئے در فیض کھل گیا ہے، مزید یہ کہ اس اشتہار میں یہ بات ظاہر ہو گئی ہے کہ بہت سے مقامات پر اکثر باہمت حضرات نے مدارس عربیہ کی بنیاد ڈال دی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ حضرات اکابر قدس اللہ اسرارہم نے قیام مدارس کو تحریک کی شکل دیدی ہے۔

ان تمام مدارس کے درمیان رابطہ کی استواری پر بھی انتظام کی یکسانیت اور حساب کتاب کی یکسانیت کے عنوان سے زور دیا گیا ہے تاکہ جو قابل قبول نظم ایک جگہ جاری کیا جائے، دوسری جگہ اس کو نافذ کر کے فائدہ اٹھایا جائے۔

اور سب اہم بات اس اشتہار میں یہ ہے کہ دو سال پہلے کے اشتہار میں جن اکابر کے نام مہتممان کے لقب کے ساتھ درج کئے گئے تھے وہ اس اشتہار میں "ارباب مشورہ" کے نام سے موسوم ہو گئے ہیں اور مہتمم اس ذات کا نام رکھا گیا ہے جس کو مجلس شوریٰ نے اپنی تجاویز کے نفاذ کا مامور بنایا ہے، مثلاً یہی دوسرا اشتہار ہے اس اشتہار پر مجلس شوریٰ کا

حکم بھی لکھا ہوا ہے یعنی محاسب تجویز ارباب مشورہ مشہر کئے گئے۔

ان اشتہارات سے ہر صاحبِ نظر یہ سمجھ سکتا ہے کہ مجلس شوریٰ کی تشکیل، دارالعلوم دیوبند کی تاسیس سے پہلے ہے نیز یہ کہ مجلس شوریٰ روزِ اوّل ہی سے تمام معاملات کو اپنے ماتحت لیکر چل رہی ہے، معمولی جزئیات یعنی اشتہارات تک کی طباعت کیلئے مجلس شوریٰ کی تجویز و اجازت کی ضرورت ہے، ایسا نہیں ہے کہ مجلس شوریٰ نے مہتمم کو اپنی امارت کے لئے نامزد کیا ہو اور اس کو اپنا امیر مقرر کر کے درو بست تمام اختیارات اس کے سپرد کر دئے ہوں۔

## چند پرچلنے والے مدارس میں شوریٰ کی اہمیت

ان ابتدائی اشتہارات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی اقتدار کے ختم ہو جانے اور اس کی واپسی کی جدوجہد میں مایوسی کے بعد اسلام کے بقا اور اس کے تحفظ کیلئے یہ اکابر بے تاب ہیں اور انھوں نے اسلام کی حفاظت کیلئے مدارسِ عربیہ کے قلعے تعمیر کرنے کا پروگرام مرتب کیا ہے۔ مصارف کے سلسلے میں چندہ پر انحصار کو وہ سب پائیدار طریقہ سمجھ رہے ہیں، اب عام مسلمانوں سے چندہ حاصل کرنے کا طریقہ، اس کا شرعی جواز اور اس کو مصارفِ خیر میں صرف کرنے کی گنجائش، یہ باتیں اربابِ حل و عقد یعنی شوریٰ کے بغیر بنتی نہیں اس لئے وہ سب سے پہلے شوریٰ تشکیل فرماتے ہیں۔

اس موقف کو سمجھنے کیلئے حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کا مدارسِ عربیہ کی صورت میں نصبِ امامت پر مشتمل اقتباس بہت اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں حضرت مولانا نے فرمایا کہ بلادِ ہند میں کفار کے غلبہ کے بعد امامت کا قیام، ایک فریضہ کے طور پر عائد ہوتا ہے۔ اور

اس فریضہ کی ادائیگی مدارس عربیہ قائم کرنے کی صورت میں ہو رہی ہے، لیکن اس اجمال کی تفصیل اور اس موقف کو پوری طرح سمجھنے کیلئے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب بہار پوریؒ اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے درمیان چندہ کے سلسلے میں ہونے والے خط و کتابت کا نقل کرنا مناسب ہوگا۔

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سندھ پورہؒ کی خدمت میں تحریر فرمایا۔

”مدرسہ میں جو روپیہ آتا ہے اگر یہ وقف ہے تو بقارئین کے ساتھ انتفاع کہاں  
اور یہ ملک معطل کا ہے تو اس کے مرجع کے بعد واپسی ورثہ کی طرف واجب ہے۔“

(فتاویٰ خلیلیہ ص ۳۱۸)

سوال کا خلاصہ یہ ہے کہ مدارس عربیہ میں آنے والے چندہ کی نوعیت متعین فرمائی جائے۔ اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔

۱۔ ایک تو یہ ہے کہ اس چندہ کو اسلامی بیت المال میں جمع ہونے والے اموال کی طرح قرار دیا جائے کہ سلطان یا اس کے نائبین ان اموال کو مصارف خیر میں صرف کرنے کے مجاز ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت یہاں نہیں ہے کیونکہ ہندوستان میں اسلامی حکومت کے زوال کے بعد نہ سلطان موجود ہے نہ اسلامی بیت المال اس لئے حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے سوال میں اس شق کا ذکر ہی نہیں فرمایا۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چندہ میں آنے والے اموال کو وقف قرار دیا جائے مگر وقف کی تعریف امام ابو حنیفہؒ کے یہاں جس العین علی ملک الواقف والتصدق

بمنفعتها او صرف منفعتها الی من احب ہے۔ [۱] فتح القدیر بحوالہ حاشیہ ہدایہ ص ۶۱۶



اور صاحبین کے یہاں وقف کی تعریف ہے جسہا لا علی ملک احد غیر اللہ یعنی امام صاحب کے یہاں وقف کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ شئی موقوف کو واقف کی ملکیت قرار دیکر جوں کاتوں محفوظ رکھا جائے اور اس کے منافع امور خیر میں یا واقف کی تصریح کے مطابق صرف کئے جاتے رہیں، اور صاحبین کے یہاں شئی موقوف پر واقف کی ملکیت تو ختم ہو جاتی ہے مگر اس کو جوں کاتوں محفوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ البتہ منافع خرج کئے جاتے رہیں گے۔ گویا امام صاحب اور صاحبین اس پر متفق ہیں کہ شئی موقوف جوں کی توں محفوظ رہے گی اب حضرت اقدس مولانا اشرف علی قدس سرہ کے سوال کا خلاصہ یہ ہوا کہ اگر آنے والا چندہ وقف ہے تو ضروری ہو گا کہ آنے والی رقوم بعینہ محفوظ رہیں حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ قمیں خرچ ہوتی رہتی ہیں۔

۳۔ تیسری صورت یہ ہے کہ یہ چندہ معطلی ہی کی ملک رہے، لیکن اس صورت میں یہ اشکال ہے کہ اگر چندہ کی رقم معطلی کی زندگی میں صرف ہو گئی تو کوئی اشکال نہیں۔ البتہ اگر خرچ میں آنے سے پہلے معطلی کا بالفرض انتقال ہو گیا تو ضروری ہو گا کہ یہ رقم معطلی کے وارثین کو واپس کی جائے، جبکہ مدارس عربیہ میں اس کا کوئی انتظام نہیں ہے۔

گویا مدارس عربیہ میں آنے والے چندہ کے بارے میں تین شقوں میں سے ایک شق کو حضرت مولانا اشرف علی صاحب قدس سرہ نے ذکر ہی نہیں فرمایا تھا اور بقیہ دو شقوں پر اشکال وارد فرما کر، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہ سے سوال کیا تھا اس کے جواب میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہ نے تحریر فرمایا۔

”عاجز کے نزدیک مدارس کاروبار وقف نہیں، مگر اہل مہر مثل عمال بیت المال معطین اور آخذین کی طرف سے دکلا رہیں۔ لہذا اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور نہ

معطین واپس لے سکتے ہیں۔“ (دفترِ اویٰ خلیلیہ ص ۳۱۹)

جواب کا خلاصہ یہ ہوا کہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب قدس سرہ نے جوشنِ بڑا پر اعتماد کر کے ذکر نہیں فرمائی تھی، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے اسی کو متعین فرمایا کہ مدارس میں آنے والی رقوم نہ وقف ہیں اور نہ معطین کی ملکیت ہیں، بلکہ اہل مدرّان رقوم کو دینے والوں کے وکیل ہونے کی حیثیت سے صرف کرتے ہیں، اسی طرح لیتے وقت وہ لینے والوں کے وکیل ہوتے ہیں جیسے اسلامی حکومت میں بیت المال کے کارکنان لینے اور دینے والوں کے وکیل ہوتے ہیں اس لئے اس چندہ کے اموال میں زکوٰۃ بھی واجب نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ فقرار کا مال ہے اور نہ معطین کو واپس کیا جائے گا کیونکہ ان کی ملکیت سے یہ مال خارج ہو چکا ہے۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہ کے اس جواب پر حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے پھر تحریر فرمایا۔

”عمال بیت المال منصوب من السلطان ہیں اور سلطان کی ولایت عامہ ہے اس لئے وہ سب کا وکیل بن سکتا ہے اور مقیس میں ولایت عامہ نہیں اسلئے آخذین کا وکیل کیسے بنے گا، کیونکہ نہ توکیل صریح ہے نہ دلالت ہے اور مقیس علیہ میں دلالت ہے کہ وہ سب اس کے زیر اطاعت ہیں اور وہ واجب الطاعت ہے۔“

(دفترِ اویٰ خلیلیہ ص ۳۲۲)

اشکال کا حاصل یہ ہے کہ ہندوستان میں سلطان کے نہ ہونے کے سبب، اہل مدارس کو ولایتِ عامہ حاصل نہیں ہے۔ اسلئے اہل مدارس معطین کے وکیل تو بن سکتے ہیں کیونکہ معطین معین ہیں اور اس صورت میں ولایتِ عامہ کی ضرورت نہیں، لیکن فقرار

کے وکیل بن کر ان اموال کو وصول کرنے کا جواز ولایتِ عامہ پر موقوف ہے کیونکہ  
فقرار غیر متعین ہیں اور ان صورتوں میں ولایتِ عامہ ضروری ہے، چنانچہ حضرت مولانا  
خلیل احمد صاحب نے اس اشکال کے جواب میں تحریر فرمایا۔

”بندہ کے خیال میں سلطان میں دو وصف ہیں، ایک حکومت جس کا شرہ  
تفہیز حدود و قصاص ہے، دوسرا انتظامِ حقوقِ عامہ، امر اول میں کوئی  
اس کا قائم مقام نہیں ہو سکتا ہے، امر ثانی میں اہل حل و عقد بوقت ضرورت  
قائم مقام ہو سکتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ اہل حل و عقد کی رائے و مشورہ کے  
ساتھ نصب سلطان وابستہ ہے جو باب انتظام سے ہے، لہذا مالی انتظام  
مدارس جو برضائے ملاک و طلبہ، ابقار دین کیلئے کیا گیا ہے بالاولیٰ معتبر  
ہوگا۔ اور ذرا غور فرمائیں انتظام جمعہ کیلئے عامہ کا نصب امام معتبر ہونا ہی  
جزئیات میں اس کی نظیر شاید ہو سکے۔“ (فتاویٰ خلیہ ص ۳۲۵)

حضرات اکابر قدس سرہ کی اس علمی گفتگو میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کے آخری  
جواب کی خط کشیدہ عبارت سے ہمارا مدعا صراحت کے ساتھ ثابت ہوتا ہے، کیونکہ اول  
تو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اپنی جلالتِ علمی کی بنیاد پر امتیازی مقام کے عالم اور  
بزرگ ہیں، دوسرے یہ کہ وہ مدارسِ عربیہ کا جال پھیلانے والے اکابر مرحومین کے دامن  
فیض سے بلا واسطہ وابستہ ہیں، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی اور حضرت مولانا  
رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہما اللہ سے ان کا تعلق بہت قریب کا رہا ہے۔ اس لئے  
حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کا یہ بیان بظاہر ان کی انفرادی رائے نہیں بلکہ یقیناً  
اکابر سے ان کے سمجھے ہوئے طریق کار کی مضبوط شہادت ہے کہ اربابِ حل و عقد

(مجلس شوری) کی رائے اور مشورے سے چونکہ نصبِ سلطان بھی وابستہ ہے اس لئے سلطان یعنی اقتدار اعلیٰ کی عدم موجودگی میں، مجلس شوری تشکیل کر کے اسلام اور حقوق عامہ کے تحفظ کا انتظام کیا جائے گا۔

گویا مجلس شوری صرف مشورہ کی سنت یا اس کے وجوب سے عہدہ برآ ہونے کیلئے تشکیل نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ مدارس عربیہ میں چندہ کے ذریعہ حاصل ہونے والی آمدنی کے جواز کی مجبوری بھی ہے کہ اس کے بغیر مدارس عربیہ کا نظام کار مکمل ہی نہیں ہوتا۔

نیز یہ کہ حضرت اقدس مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ، گو کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہ سے سوال کے وقت اس اہم نکتہ کی جانب متوجہ نہیں تھے، مگر توجہ دلانے کے بعد وہ بھی اس حقیقت سے متفق ہو گئے، بوادر النوار میں حضرت اقدس کا یہ ارشاد موجود ہے۔

”قواعد شرعیہ سے ثابت ہے کہ جہاں امیر نہ ہو عامہ مسلمین جن میں ارباب

حل و عقد بھی ہوں قائم مقام امیر کے ہوتے ہیں۔“ (بوادر النوار ص ۷۵)

حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہم اللہ کی تصریحات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ چندہ کے ذریعہ چلنے والے مدارس عربیہ میں مجلس شوری، محض مشورے کے حکم کی تعمیل کیلئے نہیں ہے۔ بلکہ یہ ارباب حل و عقد کی وہ مجلس ہے جس کے ذریعہ عوامی چندہ کا جواز حاصل ہوتا ہے، اور اگر مجلس شوری سے صرف نظر کر لیا جائے تو حضرت تھانوی قدس سرہ کے اس اشکال کا حل دشوار ہو جائے گا کہ چندہ کو وقف قرار دیا جائے تو



اس کو بعینہ باقی رکھنا ضروری ہوگا اور اگر اس کو معطلی کی ملکیت قرار دیا جائے تو خروج سے پہلے معطلی کے انتقال کی صورت میں وارثین کی طرف اس کی واپسی ضروری ہو جائے گی جب کہ یہ دونوں صورتیں مدارس عربیہ میں رائج نہیں۔

مدارس عربیہ کے نظام کار میں مجلس شوریٰ کی اسی شرعی حیثیت کے سبب روز اول سے اس کو اسی طرح بالادستی حاصل رہی ہے جس طرح اسلامی نظام حکومت میں سلطان یا خلیفۃ المومنین کو رہتی ہے کہ۔

(الف) عوامی چندے سے چلنے والے مدارس عربیہ کا قیام مجلس شوریٰ کے ذریعہ عمل میں آتا رہا ہے۔

(ب) قوانین اور دستور اساسی کی تدوین مجلس شوریٰ اور اسکے ارکان کے ذریعہ عمل میں آتی رہی ہے۔

(ج) تمام مدرسین، کارکنان اور خود مہتمم کے عزل و نصب کے تمام اختیارات مجلس شوریٰ کے ہاتھ میں رہے ہیں۔

(د) مالیات کی فراہمی ہمیشہ مجلس شوریٰ کے اعتماد پر ہوتی رہی ہے اور مجلس شوریٰ ہی چندہ کے اموال کو مصارف خیر میں صرف کرنے کے احکام صادر کرتی رہی ہے

(ه) اور ہر دور کے اکابر نے ہمیشہ مجلس شوریٰ کی بالادستی کا اپنے اپنے رنگ میں اعتراف کیا ہے، مناسب ہوگا کہ یہاں چند اکابر کی تصریحات نقل کر دی جائیں:

**مجلس شوریٰ کی بالادستی کے سلسلے میں حضرت نانوتوی کی تحریر**

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ، ہندوستان میں اس

برگزیدہ جماعت کے امیر کارواں ہیں جس نے حکومت وقت کی سرپرستی، یا صاحب ثروت مسلمانوں کی امداد یا مخصوص اوقاف کی آمدنی پر انحصار کے بجائے عوامی چندے کے ذریعہ مدارس عربیہ کو چلانے کی بنیاد ڈالی ہے، حضرت اقدس نے دارالعلوم یا اس نہج پر چلنے والے مدارس کیلئے اساسی طور پر آٹھ اصول قلمبند فرمائے ہیں، ان میں سے مفصل دفعہ مجلس شوریٰ سے متعلق ہے جس کا متن یہ ہے۔

”مشیرانِ مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور اسلوبی ہو، اپنی بات کی قیاس نہ کی جائے، خدا نخواستہ جب اس کی نوبت آجائے گی کہ اہل مشورہ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنیاد میں تزلزل آجائے گا، القصہ تہہ دل سے بروقت مشورہ اور نیز اس کے پس و پیش میں اسلوبی مدرسہ ملحوظ رہے سخن پروری نہ ہو اور اس لئے ضرور ہے کہ اہل مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ سے متامل نہ ہوں اور سامعین بہ نیت نیک اس کو سنیں، یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائے گی تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہو بدل و جان قبول کریں گے۔“

اور نیز اسی وجہ سے یہ ضرور ہے کہ مہتمم امور مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے، خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد و صادر ہو جو علم و عقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو۔ اور نیز

لے واردین و صادرین سے مشورہ کی اجازت سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ مہتمم مجلس شوریٰ کے پابند نہیں ہیں، کیونکہ حضرت اقدسؒ کی یہ تحریر اولاً تو دستور اساسی کی تدوین سے پہلے کی بات ہے جب کوئی (باقی برصغیر)

اسی وجہ سے ضرور ہے کہ اگر اتفاق سے کسی وجہ سے مشورہ کی نوبت نہ آئے اور بقدر ضرورت اہل مشورہ کی مقدار معتد بہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر وہ شخص اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھ سے کیوں نہ پوچھا، ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر ہر اہل مشورہ معترض ہو سکتا ہے: " (مطبوعہ مسودہ دستوراسی) مجلس شوریٰ سے متعلق حضرت اقدس کی اس الہامی عبارت میں یوں تو کتنے ہی اشارے ہیں لیکن جو اہم باتیں بیک نظر سمجھ میں آتی ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ چندہ سے چلنے والے مدارس عربیہ میں حضرت اقدس مجلس شوریٰ کو ضروری قرار دے رہے ہیں۔ کیونکہ اصول ہشتگانہ پر جو عنوان حضرت نے قائم فرمایا ہے وہ یہ ہے " وہ اصول جن پر مدرسہ (یعنی دارالعلوم) اور نیز اور مدارس چندہ مبنی معلوم ہوتے ہیں " گویا بنیادی طور پر حضرت اقدس نے چندہ سے چلنے والے مدارس کیلئے مشورہ مجلس شوریٰ، اور اس کی اہمیت پر پورا زور دیا ہے۔

۲۔ امور مشورہ طلب میں حضرت اقدس نے مہتمم کو مشورہ کا پابند بنایا ہے، اور اس پابندی کیلئے عبارت میں دو بار لفظ "ضرور" کا استعمال فرمایا ہے کہ "نیز اسی وجہ سے یہ ضرور ہے کہ مہتمم امور مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے۔"

۳۔ باقاعدہ ممبران شوریٰ کی نامزدگی کی بھی صراحت ہے کیونکہ فرمایا گیا ہے: "خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں۔" ہمیشہ مشیر مدرسہ رہنا اسی وقت ممکن ہے جب مجلس شوریٰ کے ممبران کی باقاعدہ نامزدگی ہو۔

(بقیہ حاشیہ ص ۴۷ کا) شوق وضاحت کے ساتھ متعین نہیں تھی، ثانیاً یہ کہ واردین و صادرین سے

مشورہ کا مفہوم یہ ہے کہ جماعت کے مشورہ کو اہمیت دی جائے اور مجلس شوریٰ میں پیش کر کے منظور

کرایا جائے۔

۴۔ تمام ممبرانِ شوریٰ کی حاضری کو ضروری نہیں فرمایا گیا ہے بلکہ معتد بہ تعداد سے مشورہ کر لینے کو کافی قرار دیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ حجت الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ نے نہ صرف یہ کہ اس دفعہ میں مجلس شوریٰ کی بالادستی کی تصریح کی ہے بلکہ مجلس شوریٰ کے سلسلے میں بعض اہم جزئیات تک کی صراحت فرمادی ہے۔ اور مہتمم کو ہر حال میں شوریٰ کا پابند قرار دیا ہے۔

## حضرت مولانا رفیع الدین صاحب دہلویؒ مہتمم دوم کی تحریر

شوریٰ کی بالادستی کے سلسلے میں دوسری قدیم صراحت، حضرت مولانا رفیع الدین صاحب قدس سرہ مہتمم دوم کے وہ اصول ہشتگانہ ہیں جن میں بیشتر دفعات مجلس شوریٰ ہی سے متعلق ہیں، یہاں وہ تمام دفعات نقل کی جا رہی ہیں تاکہ دارالعلوم کے ابتدائی ایام میں شوریٰ کی قانونی اور عملی بالادستی کی صحیح تصویر لگا ہوں میں آسکے یہ تحریر ۱۲۸۶ھ میں یعنی دارالعلوم کی تاسیس کے صرف پانچ سال کے بعد مرتب ہوئی ہے۔

۱۔ ہر کارخانہ کے امور جزئی کی بنا ایک شخص کی رائے پر رہنا چاہئے، اس قاعدہ پر اس کارخانہ کے امور جزئیہ کے انجام میں کسی صاحب کو اہل مشورہ میں سے دخل نہ ہو، الا مشورہ اور رائے کہ وہ اپنے موقع پر اظہار فرمادیں جیسا اہل شوریٰ مل کر پسند کریں مقبول ہوگا۔  
۲۔ امور جزئیہ میں جو کوئی صاحب بندہ کے مددگار ہوں گے یا اچھا مشورہ دیں گے بندہ ان کا مشکور ہوگا مگر انجام ان کا موقوف بندہ ہی کی رائے پر رہنا چاہئے۔

۳۔ جس کسی صاحب کو خواہ اہل شوریٰ خواہ اور عام خلق کوئی امر قابلِ اعتراض معلوم ہو تو مہتمم سے مزاحمت نہیں جلسہ شوریٰ میں پیش کر کے اس کو طے کرالیں اور جیسا قرار پاو



اس کے انجام پر مہتمم کو غدر نہ ہوگا۔

۴۔ مشورہ کے جلسہ جب کبھی ہوں بے حاضری مہتمم نہ ہوں گے اگرچہ اس کی ہی کسی بات پر خوردہ ہو اور یوں اہل شوریٰ کو اختیار اعتراض کا ہر وقت ہے اور مہتمم کو موقع جواب کا۔  
۵۔ مہتمم اگر اہل شوریٰ کے اجتماع تک کسی امر ضروری کے انجام میں انتظار نہ کر سکے تو بذریعہ خط سب صاحبوں کو اطلاع دے گا۔ اور اس ضروری امر کو سب صاحبوں کو قبول کرنا ہوگا۔

۶۔ آمدنی مدرسہ کی مہتمم کے ہاتھ میں رہے گی کیونکہ صرف ضروریہ کیلئے کسی قدر روپیہ مہتمم کے ہاتھ میں رہنا ضرور ہے۔ حاجت ضروری سے زیادہ روپیہ جب جمع ہو جایا کریگا تو خزانچی کے پاس جمع کر دیا جاوے گا۔

۷۔ ہر روز وقت مقررہ مدرسہ پر مہتمم مدرسہ میں جایا کرے گا اور اسی وقت میں امور متعلقہ مدرسہ کو انجام دیا کرے گا۔

۸۔ مناسب ہے کہ سب اہل شوریٰ مل کر اپنے دستخط اس معروضہ پر فرمادیں کہ مہتمم کو جائے سندر ہے۔  
تحریر تاریخ ۳ رزی قعدہ ۱۲۸۸ھ

العبد

العبد

العبد

محمد عابد

ذوالفقار علی

محمد قاسم عفی عنہ

حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب قدس سترہ، اکابر دیوبند کے شیخ حدیث حضرت مولانا عبد الغنی مجددی قدس سترہ سے خصوصی نسبت فیض رکھنے والے بزرگ ہیں، ان کی مندرجہ بالا تحریر کی ایک ایک دفعہ مجلس شوریٰ کی بلا دستی کی صراحت کر رہی ہے۔ پہلی اور دوسری دفعہ میں وہ مجلس شوریٰ سے امور جزئیہ کی انجام دہی کا اختیار

طلب فرما رہے ہیں، اس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ مسئلہ ۱۲۸۸ تک مجلس شوریٰ امور جزئیہ کی انجام دہی میں بھی پوری طرح دخیل ہے، یہ ظاہر امور جزئیہ سے مراد روزمرہ کے وہ کام ہیں جن کی بنیادی پالیسی مجلس شوریٰ نے وضع کر دی ہو، اور صرف اس پالیسی کو جزئیات پر منطبق کرنے کی بات باقی رہ گئی ہو۔

تیسری دفعہ میں بالکل صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ جلسہ شوریٰ میں جو طے ہو جائے گا مہتمم کو اس کی تعمیل میں کوئی عذر نہ ہوگا، یہ نہیں فرما رہے ہیں کہ مجلس شوریٰ کے ممبران کا کام مسئلہ زیر غور کے تمام پہلوؤں کو سامنے کر دینا ہے اور پیش کردہ پہلوؤں میں کسی ایک کا انتخاب مہتمم کریں گے۔ بلکہ وہ یہ فرما رہے ہیں کہ ”جیسا قرار پاوے اس کے انجام پر مہتمم کو عذر نہ ہوگا۔“

چوتھی دفعہ میں وہ مجلس شوریٰ سے یہ درخواست فرما رہے ہیں کہ شوریٰ کا جلسہ مہتمم کی عدم موجودگی میں نہ کیا جائے۔

پانچویں دفعہ میں وہ مجلس شوریٰ سے ہنگامی امور کی انجام دہی کا اختیار طلب فرما رہے ہیں چھٹی دفعہ میں وہ مجلس شوریٰ سے ضروری مصارف کیلئے رقم اپنے پاس رکھنے کی اجازت لے رہے ہیں۔

ساتویں دفعہ میں وہ مجلس شوریٰ کو مطلع فرما رہے ہیں کہ وہ ہمہ وقت امور مدسہ کی انجام دہی سے قاصر ہیں وقت مقررہ پر آیا کریں گے۔

چوتھی دفعہ سے ساتویں دفعہ تک تمام ہی دفعات مجلس شوریٰ کی بالادستی اور مہتمم کے شوریٰ کی ماتحتی میں کام کرنے کی صراحت پر مشتمل ہیں۔

اور آٹھویں دفعہ تو مجلس شوریٰ کے ہیئت حاکمہ ہونے کیلئے بالکل صراحت کا درجہ

رکھتی ہے کیونکہ انھوں نے اپنی معروضات ممبران شوریٰ کی خدمت میں پیش کر کے اسکی منظوری لی ہے اور یہ فرمایا ہے کہ سب حضرات دستخط فرمادیں تاکہ یہ تحریر مہتمم کے پاس وثیقہ اور سند کے طور پر محفوظ رہے۔

پھر یہ کہ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب کی اس تحریر پر حضرت اقدس مولانا محمد قاسم حضرت مولانا ذوالفقار علی اور حضرت حاجی سید عابد حسین قدس اللہ اسرارہم کے دستخط ہیں، گویا اس تحریر میں شوریٰ کی بالادستی، اور شوریٰ کے ہیبت حاکم ہونے کی جہت پر اس دور کے تمام ہی اکابر کا اتفاق ہے، ان اکابر میں کوئی یہ تحریر نہیں کرتا کہ حضرت مہتمم صاحب آپ یہ کیا قلب موضوع فرما رہے ہیں، مجلس شوریٰ کا کام تو زیر غور مسائل میں مختلف جواب کو پیش کر دینا ہے باقی ان جوانب میں سے کسی ایک جانب کو ترجیح دینا تو آپ ہی کا کام ہے۔ دارالعلوم کے ابتدائی ایام میں مجلس شوریٰ کی بالادستی کی یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ تمام رودادوں میں مجلس شوریٰ کی جانب سے آئین مدرسہ کے طور پر مستقل مختلف چیزیں تسلسل کے ساتھ شائع ہوتی رہی ہیں جن میں ضروریات کے مطابق برابر اضافہ ہوتا رہا ہے۔ رودادوں میں آنے والی یہ دفعات، مجلس شوریٰ کے ہر دور میں بالادستی اور ہیبت حاکم ہونے کی حیثیت کو واضح کرتی ہیں اور ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ اکابر مرحومین رحمہم اللہ نے مفادات مدرسہ کے تحفظ کیلئے، امیہ مؤننین کے قائم مقام کی حیثیت سے ارباب حل و عقد پر مشتمل مجلس شوریٰ کی تشکیل کی تھی۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی تحریر

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے بارے میں یہ شہرت دی جا رہی ہے

کہ وہ مجلس شوریٰ کی بالادستی یا ہیبتِ حاکمہ ہونے کی جہت سے متفق نہیں تھے لیکن یہ بات حضرت اقدس کی تصریحات کے بالکل خلاف ہے، حضرت اقدس کے نقطہ نظر کی تفصیلی وضاحت تو آئندہ صفحات میں کی جائے گی، یہاں ان کی صرف ایک تحریر نقل کی جا رہی ہے، یہ تحریر اس وقت کی ہے جب حضرت حکیم الامت کے دورِ سرپرستی میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قدس سرہ کے نائبِ مہتمم مقرر کئے جانے پر ناخوشگوار ردِ عمل سامنے آیا تو بحیثیت سرپرست حضرت حکیم الامت کی جانب سے ایک اعلان عام شائع کیا گیا جو اس وقت متعدد اخبارات و رسائل میں شائع ہوا، اور اس کی اصل کاپی دارالعلوم کے محفوظ خانہ میں محفوظ ہے، اس اعلان کا متن یہ ہے۔

”اعلان عام کیا جاتا ہے کہ دارالعلوم کسی کا مملوک نہیں ہے، نہ اس کے اہتمام میں وراثت جاری ہو سکتی ہے، خاندان مولانا محمد قاسم صاحب کو دارالعلوم کے ساتھ خصوصیت بے شک حاصل ہے مگر اس کا یہ ثمرہ نہیں ہو سکتا کہ اہتمام دارالعلوم بطور وراثت اسی خاندان میں قائم رہے۔ اگر ہر زمانہ کی مجلس شوریٰ بطور حق شناسی و بخیال مہسن انتظام و مصالح دارالعلوم اس خاندان کے اہل افراد کا انتخاب کریں تو مستحسن ہے اور اگر باوجود مذکورین کی اہلیت کے کسی دوسرے شخص کا انتخاب کریں یہ بھی ان کو اختیار ہے۔“

یہ بھی اعلان کیا جاتا ہے کہ مولوی حافظ قاری محمد طیب صاحب دارالعلوم کی مدبری کے ساتھ نیابتِ اہتمام کیلئے بھی نامزد کئے گئے ہیں لیکن یہ ضرور نہیں ہے کہ وہ مہتمم بنائے جائیں یا ہمیشہ کیلئے وہ نائبِ مہتمم رہیں، مجلس شوریٰ کو ہر وقت تغیر و تبدل کا اختیار، فقط۔



امید ہے کہ اب اس معاملہ میں کسی کو کوئی شبہ نہ رہا ہوگا۔

ان ارید الا اصلاح ما استطعت و ما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت الیہ النب

کتبہ اشرف علی تھانوی سادس شعبان ۱۴۲۰ھ

اس اعلان عام میں حضرت حکیم الامت نے صراحت کے ساتھ مجلس شوریٰ کی بالادستی اور مہیت حاکم ہونے کی وضاحت فرمائی ہے، وہ ہر زمانہ کی مجلس شوریٰ کو یہ اختیار دے رہے ہیں کہ اگر المہیت کی بنیاد پر اس خاندان کے افراد کا انتخاب کریں تو بہت سن بات ہوگی لیکن المہیت کے باوجود وہ کسی دوسرے کو نامزد کریں تو اس کا مجلس شوریٰ کو اختیار ہے پھر اس کے بعد مہتمم یا نائب نامزد کرنے کے باوصف وہ تغیر و تبدل کا اختیار تسلیم فرما رہے ہیں، وہ یہ نہیں فرما رہے ہیں کہ نامزد کئے جانے کے بعد مہتمم کی حیثیت امیر کی ہو جاتی ہے اور اب وہ مجلس شوریٰ کا بھی امیر بن جاتا ہے اور شوریٰ کا کام صرف یہ رد جاتا ہے کہ زیر بحث معاملہ کے مختلف گوشوں کو امیر کے سامنے رکھ دے تاکہ امیر اپنی صوابدید اور اختیار سے پیش کردہ گوشوں میں سے کسی ایک جانب کو ترجیح دیدے۔ بلکہ حضرت حکیم الامت نے پوری طاقت کے ساتھ مہتمم کے عزل و نصب کا اختیار ہر زمانہ کی مجلس شوریٰ کو دیا ہے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ کی تحریر

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ، عوامی چندہ سے مدارس عربیہ کی بنیاد رکھنے والے اکابر میں حضرت حاجی امداد اللہ، قطب العالم حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ سے براہ راست اکتساب فیض

کرنے والے بزرگ ہیں، اس لئے مجلس شوریٰ کے بارے میں ان کی کوئی بھی تحریر ان کا اپنا اجتہاد نہیں، بلکہ اکابر سے سمجھے ہوئے طریق کار کی مضبوط شہادت ہے۔ یہاں حضرت اقدس رحمہ اللہ کی وہ تحریر دی جا رہی ہے جو مدرسہ شاہی مراد آباد میں مجلس عاملہ کی تجاویز کے خلاف بعض کارکنان کے طرز عمل پر اظہار ناراضگی کے طور پر سپرد قلم فرمائی گئی ہے، یہ اصل تحریر آج بھی مدرسہ شاہی کے مجلس شوریٰ کے ریکارڈ میں محفوظ ہے، اس کا متن یہ ہے۔

”ہر جمہوری ادارہ کی قوتِ حاکمہ مجلس ممبران ہے، یہی مجلس عوام کی نمائندہ ہے اور اسی کے ہاتھ میں تمام امور عزل و نصب ترقی و تنزل وغیرہ متعلقہ ادارہ ہیں، تمام ملازمین ادارہ خواہ مدرس ہوں یا غیر مدرس اوپر کے نیچے تک اسی مجلس کے سامنے جوابدہ اور حسب قوانین ادارہ مکلف اور پابند ہیں، کسی ملازم یا مدرس کو جائز نہیں ہے کہ جب تک وہ اس ادارہ کی ملازمت میں ہے مجلس کے احکام سے روگردانی کرے، یہی حال تمام مدارس دینیہ جمہوریہ کا۔ ممبران شوریٰ چندہ دہندگان کے نمائندہ اور ملازمان مدرسہ کے حاکم ہیں، کسی مدرس کو..... احکام مجلس شوریٰ سے سرتابی کرنا درست نہیں ہے اور نہ کوئی ایسی حرکت جائز ہے جس سے ادارہ کو نقصان اور اس کے نظم و نسق میں ابتری پیدا ہو، مجلس عاملہ، اسی مجلس شوریٰ کی مقرر کردہ مجلس ہے، اس کی سرتابی کرنا، مجلس شوریٰ حاکمہ کی سرتابی ہے۔ اس لئے ان حضرات کے مذکورہ بالا اعمال اقوال سراسر ناجائز ہیں، اگر وہ پابندی عاملہ کے احکام کی نہیں کرتے ہیں تو

ان کو ادارہ سے علاحدہ ہو جانا چاہئے، ادارہ میں رہتے ہوئے ایسے اعمال کا یا ایسے اقوال کا ارتکاب سراسر بغاوت اور عداوت اللہ و عندهاں گرفت کا موجب ہے، ان حضرات کو غور کرنا اور اپنے ان مہمل اور ناجائز امور سے تائب ہونا از حد ضروری ہے، ان کو جامعہ قاسمیہ شاہی مسجد کو نقصان پہنچانا انتہائی شرمناک اور نمک حرامی ہے۔  
والی اللہ المشتکی      ننگ اسلا حسین احمد غفرلہ

از دارالعلوم دیوبند، ۸ شعبان ۱۳۷۵ھ

غور فرمایا جائے کہ حضرت شیخ الاسلام کی تحریر میں مجلس شوریٰ کی بالادستی اور مہنیت حاکم ہونے کی کتنے جاہ و جلال اور کتنے پر شکوہ انداز میں صراحت ہے، حضرت اقدس قدس سترہ نے بھی یہ نہیں فرمایا کہ مجلس شوریٰ کا کام تجاویز اور رائے پیش کر دینا ہے اور اس میں سے انتخاب یا ترجیح کا عمل، مہتمم کے دائرہ اختیار میں ہے، بلکہ وہ یہ فرما رہے ہیں کہ عوامی چندے سے چلنے والے تمام دینی مدارس میں مجلس شوریٰ ہی حاکم ہے، اور اس کے احکام کی خلاف ورزی ناجائز ہے۔ بلکہ اس طرح کی ذہنیت رکھنے والوں پر حضرت اقدس نہایت برہم ہیں اور ان کے اعمال کو شرمناک اور نمک حرامی سے تعبیر فرما رہے ہیں۔

کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ حضرت حکیم الامت قدس سترہ تو مجلس شوریٰ کو ہر وقت تغیر و تبدل کا اختیار دے رہے ہیں اور حضرت شیخ الاسلام قدس سترہ عوامی چندہ سے چلنے والے تمام مدارس میں اوپر سے نیچے تک تمام ملازمین کو قوانین ادارہ کے مطابق مجلس کے سامنے جواب دہ قرار دے رہے ہیں اور یہ فرما رہے ہیں

کہ مجلس شوریٰ ان پر حاکم ہے، لیکن انہی دونوں بزرگوں سے نسبت طریقت اور نسبت تلمذ کا شرف رکھنے والے حضرات یہ صراحت کر رہے ہیں کہ جس دستوراسی میں مجلس شوریٰ کو حاکم اور مہتمم کو محکوم قرار دیا گیا ہے وہ غیر شرعی ہے اور اس کو تبدیل کر کے شریعت کے مطابق کرنا ضروری ہے

## دستوراسی کی تدوین کا طریقہ

حالانکہ دستوراسی بالغ نظر فقہاء کرام کے مرتب فرمودہ اسی معاہدہ شرعی کا نام ہے جس کی ایک ایک دفعہ شریعت غرار کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے اور ادارہ میں کام کرنے والے تمام کارکنان پر یا ایتھا الذین امنوا و فوا بالعقود، اے ایمان والو! معاہدات کو پورا کرو، نیز او فوا بالعہد ان العہد کان مسئولا، باہمی معاہدات کی پابندی کرو، کہ بیشک عہد کے بارے میں باز پرس ہوگی، کی رُو سے اس کی پابندی لازم ہے۔

دستوراسی، اکابر دارالعلوم میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمہما اللہ کے عہد سے حضرت شیخ الاسلام کے عہد تک مجلس شوریٰ کی تجاوز پر مشتمل ایک مضبوط دستاویز ہے، کیونکہ ابتداء میں دارالعلوم دروہست مجلس شوریٰ کی تحویل میں چلتا رہا اور جس سلسلے میں ضرورت پیش آتی رہی اکابر دارالعلوم شریعت کے مطابق احکام نافذ فرماتے رہے۔ اکابر دارالعلوم اور مجلس شوریٰ کے یہ احکام ”آئین مدرسہ“ کے نام سے سال اول کی روداد سے طبع ہوتے رہے ہیں۔ پھر ترقی پزیر دارالعلوم میں اس دستور کے باقاعدہ مرتب کرنے کی ضرورت



محسوس ہوئی تو مجلس شوریٰ کے ایک تجربہ کار اور قانونی دماغ رکھنے والے ممبر مولانا محمود احمد صاحب رام پوری نے مجلس شوریٰ کے حکم سے ایک مختصر دستور اساسی مرتب کیا، پھر کچھ دنوں کے بعد ابو حنیفہ ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب نے مجلس شوریٰ ہی کے حکم سے اس پر نظر ثانی فرما کر اس کو باقاعدہ اور مفصل بنایا، پھر ۱۳۶۲ھ کے بعد مجلس شوریٰ نے مکمل اور مفصل دستور کی ضرورت محسوس کی اور اس وقت کے مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ کو دستور اساسی مرتب کرنے کا مکلف کیا موصوف نے ۱۳۶۴ھ میں دستور مرتب فرما کر مجلس شوریٰ میں پیش کیا، موصوف نے مطبوعہ مسودہ کی ابتداء میں اس کی ترتیب و تدوین کے طریقہ پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرمایا۔

”حسب ایماں مجلس، احقر نے دستور اساسی مرتبہ مولوی محمود احمد صاحب رامپوری ممبر دارالعلوم اور آئین دارالعلوم بقدر مطبوعہ مرتبہ حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دامت برکاتہم کو سامنے رکھ کر اپنے تجربات اور مذکورہ اصول خمسہ کی روشنی میں ضروری رد و بدل اور حذف و اضافہ کے ساتھ جدید آئین کا یہ مسودہ مرتب کیا ہے“ (مسودہ دستور اساسی) مطبوعہ چند لائٹوں کے بعد مزید رقم طراز ہیں۔

”اکثر و بیشتر ترمیمات وغیرہ میں حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی رحمہما اللہ کے زمانہ کے تعامل اور مرتب شدہ قواعد کو مشعل راہ بنایا گیا ہے جس کے لئے میں نے ان دونوں زمانوں کی روداد ہائے شوریٰ کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور اپنی فہم کی رسائی تک ان میں کے طے شدہ مہمات امور کی

فہرست بنا کر اس کا اساسی اور نظری حصہ اس آئین میں لے لیا ہے۔

(مسودہ دستور اساسی ص ۳، مطبوعہ)

گویا حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ کے عہد میمنوں سے دیگر اکابر کے عہد تک کی مجلس شوریٰ کی تجاویز اور کچھ بنیادی رہنما اصول کو سامنے رکھ کر یہ دستور اساسی مرتب کیا گیا ہے، پھر مختلف مجلسوں میں اس پر بحث ہوتی رہی اور آخر ۲۲ شعبان ۱۳۶۸ھ کی مجلس شوریٰ نے، دستور اساسی کی مکمل خواندگی کے بعد طے کیا کہ یہ دستور اٹھواں ۱۳۶۸ھ سے نافذ العمل سمجھا جائے۔ اور آج تک اسی دستور کے مطابق عمل ہو رہا ہے۔

اس مبارک اور پسندیدہ دستور اساسی کے بارے میں غیر شرعی ہونے کا فتویٰ بہت بڑی جسارت معلوم ہوتا ہے جس کی حضرت حکیم الامت اور حضرت شیخ الاسلام کے منتسبین سے بالکل توقع نہیں تھی، بلکہ چندہ سے چلنے والے مدارس عربیہ کی ایک صدی سے زائد کی طویل تاریخ، اور اکابر کی تصریحات کے مطابق حقیقت یہ ہے کہ ان مدارس عربیہ کی بنیاد، محض تعلیم گاہ کے تصور سے نہیں ڈالی گئی ہے۔ ان مدارس کا حقیقی مقصد خدا کی سب سے بڑی نعمت یعنی دین کا تحفظ ہے۔ اس لئے حضرات اکابر نے ان مدارس کے نظام کار کو اس طرح مرتب فرمایا ہے۔

۱۔ ارباب حل و عقد کی ایک باقاعدہ مجلس ہوگی جو امیر المومنین کے قائم مقام کی حیثیت سے مدرسہ کے تمام معاملات میں حاکم ہوگی اور وہ چندہ کی وصولیابی اور اس کو مصارف میں صرف کرنے کی اجازت دے گی، چند ہی دن کے بعد اس مجلس کا نام "مجلس شوریٰ" ہو گیا۔

۲۔ مجلس شوریٰ روزمرہ کے کاموں کی انجام دہی اور شریعت کے مطابق صادر کردہ اپنے فیصلوں کی تنفیذ کے لئے ایک شخصیت کا انتخاب کرے گی، اس اہم کام کے لئے منتخب شخصیت کو مہتمم یا ناظم کے نام سے یاد کیا جائے گا۔

۳۔ مجلس شوریٰ کے یہی فیصلے اس سلسلہ کا دستور اساسی ہوں گے، چنانچہ روز اول سے مجلس کے صادر کردہ احکام پر غور و خوض کر کے جو قوانین یکجا کئے گئے۔ ان کا نام ”دستور اساسی“ رکھا گیا۔

حضرات اکابر قدس اللہ اسرارہم کا جاری کردہ یہ طریق کار بلا شک، شریعت کے بالکل مطابق، اور عصر حاضر کے تمام تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور کسی اجتماعی کام میں جتنے اندیشے ہو سکتے ہیں اس طریق کار میں ان تمام اندیشوں سے امکان کی حد تک تحفظ پایا جاتا ہے اور اسی لئے ہر دور کے اکابر نے اپنے اپنے رنگ میں مجلس شوریٰ کے ہیئت حاکم ہونے کی صراحت فرمائی ہے اور مہتمم کو بھی اس کے درجہ کے مطابق امیر تسلیم کیا ہے اور امور مفوضہ کی انجام دہی میں سہولت کے بقدر ان کو صاحب اختیار قرار دیا ہے۔

## زیر بحث موضوع کے تجزیہ کی صحیح بنیادیں

حضرات اکابر قدس اللہ اسرارہم کے نقطہ نظر کے خلاف، ایک دوسرا نقطہ نظر سامنے آیا ہے جس میں مہتمم کو امیر قرار دیکر مجلس شوریٰ کو اس کے تابع کر دیا گیا ہے۔ اس نقطہ نظر کا دعویٰ یہ ہے کہ صرف مہتمم ہی اولوالامر کا مصداق ہیں مجلس شوریٰ اس کا مصداق نہیں ہے، اس دوسرے نقطہ نظر کے سامنے آنے کے بعد

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان چند امور کو معین اور منقح کر لیا جائے جن پر اس بحث میں صحیح نتیجہ تک پہنچنے کا انحصار ہے۔

۱۔ صحیح نتیجہ تک پہنچنے کیلئے سب سے بنیادی بات یہ ہے کہ "اولوالامر" کے مصداق کا تعین کر لیا جائے، اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ اولوالامر کا معنی صرف مہتمم ہیں اور مجلس شوریٰ اس کا مصداق نہیں ہے تو یہ نتیجہ نکالنا بالکل درست ہوگا کہ مہتمم امیر ہیں اور مجلس شوریٰ ان کے تابع ہے اور اگر مجلس شوریٰ کو اولوالامر کے مصداق سے خارج کرنے پر کوئی دلیل قائم نہیں ہے بلکہ دلیل اس بات پر قائم ہے کہ مجلس شوریٰ اولوالامر کا مصداق ہے تو اس حقیقت کا تسلیم کرنا ناگزیر ہوگا کہ مہتمم مجلس شوریٰ کے مقابلہ پر امیر نہیں بلکہ مامور ہیں۔

۲۔ دوسری بنیاد یہ ہے کہ مہتمم اور مجلس شوریٰ کے درجہ امارت کا تعین کر لیا جائے اگر واقعی یہ بات ثابت ہو جائے کہ مہتمم کو امارت کا وہ درجہ حاصل ہے جو اسلامی حکومت میں سلطان یا امیر المومنین کو حاصل ہوتا ہے تو چونکہ امیر المومنین سے شوریٰ کی نسبت کے بارے میں دونوں موقف ہیں، صحیح اور مضبوط موقف تو وہاں بھی یہی ہے کہ مجلس شوریٰ کو اس پر بھی بالادستی حاصل ہے جیسا کہ یہ بحث تفصیل سے آرہی ہے، لیکن ایک کمزور موقف امیر المومنین کی بالادستی کا بھی ہے اس لئے اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ مہتمم کو امیر المومنین کے درجہ کی امارت حاصل ہے تو واقعہً اس بحث کی گنجائش نکل آئے گی کہ مہتمم بالادست ہیں یا مجلس شوریٰ، لیکن اگر مہتمم کے لئے امیر المومنین کا درجہ امارت ثابت نہ کیا جاسکے تو ان کی نسبت سے مجلس شوریٰ کی بالادستی یا زیردستی کی بحث بالکل زائد بحث ہوگی کیونکہ ماتحت امر اپر کسی بھی طرح کی



نگرانی قائم کرنے کے جواز میں اختلاف رائے نہیں ہے۔

درجہ امارت کا تعین بھی دشوار نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی آسان صورت یہ ہے کہ مہتمم کے دائرہ خدمات کو اسلامی حکومت کے نقشہ میں رکھ کر قیاس کر لیا جائے کہ وہ کس درجہ کے امیر ہیں، مثلاً حکومت کے عہدے داروں میں یہ بات طے شدہ ہے کہ مہتمم امیر المومنین نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق شعبہ تعلیم سے ہے، شعبہ تعلیم میں بھی ان کی حیثیت مرکزی یا صوبائی وزیر کی نہیں ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ وہ ایک بڑی سے بڑی درسگاہ کے ناظم اعلیٰ ہیں، اس لئے اگر مہتمم کا درجہ امارت معین ہو جائے تو مجلس شوریٰ کی نسبت سے ان کے امیر یا مامور ہونے کی بحث میں صحیح نتیجہ تک پہنچنا بہت آسان ہو جائے گا

۳۔ تیسرا وہ بنیادی نقطہ جس سے زیر بحث موضوع میں صحیح نتیجہ تک پہنچنا آسان ہو جائے یہ ہے کہ شوریٰ کے سلسلے میں قرآن کریم میں دو آیات ہیں، ایک آیت کا تعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے ہے۔ یعنی شاورہم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ، اور دوسری آیت یعنی و امرہم شوریٰ بینہم عام مومنین سے متعلق ہے، اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے متعلق مشورہ کے حکم کی تیقین مقصود ہو تو آیت شاورہم فی الامر کو بنیاد بنایا جائے اور عام مسلمانوں سے متعلق مشورہ کی تفصیلات معلوم کرنا ہوں تو امرہم شوریٰ کو بنیاد بنانا چاہئے۔

اگر شاورہم کو عام مسلمانوں کے لئے مشورہ کے حکم کی بنیاد بنایا جائے گا تو صحیح نتیجہ تک پہنچنے کیلئے احتیاط کے بہت سے تقاضوں کا عمل میں لانا ضروری

ہو جائے گا۔ مثلاً شاد و رھد کے صیغہ امر کو امام شافعی رحمہ اللہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے استحباب پر محمول فرمایا ہے، لیکن عام امرار کے حق میں مشورہ کے استحباب کا قول کرنے والوں نے اس احتیاط کو ملحوظ نہیں رکھا کہ شاد و رھم کا صیغہ امر صرف حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے استحباب پر محمول ہے دیگر امرار کیلئے نہیں۔

نیز یہ کہ قرآن کریم کی آیات سے استنباط معانی کے وقت، اصول فقہ کے معین کردہ صحیح طریقہ کار کی پیروی بھی ضروری ہے۔

۴۔ صحیح نتیجہ تک پہنچنے کیلئے چوتھی اہم بنیاد یہ ہے کہ عزمت میں مذکور عزم کے معنی مرادی کے تعین میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ تفسیر، اور عام مفسرین کرام کی بیان کردہ تشریحات کی پابندی کی جائے اور اگر مفہوم لغوی کے توسع کے مطابق ایسے معنی مراد لئے جائیں جو صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر منطبق ہوں تو انھیں دیگر امرار کے لئے عام نہ کیا جائے کیونکہ نبوت کا منصب سب سے بالاتر منصب ہے اور کمالات انسانیت میں اس کا کوئی بدل نہیں یہ خالص عطیہ خداوندی ہے، اس لئے اگر عزم کے معاملہ میں پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خصوصیت کے بیش نظر اہل مشورہ پر فوقیت حاصل ہو تو اس میں کوئی استبعاد نہیں لیکن عزم کے اس معنی مرادی کو دیگر امرار و سلاطین کے حق میں عام کرنا درست نہ ہوگا۔

۵۔ مجلس شوریٰ اور اہتمام کی بالادستی اور زیردستی کی اس بحث میں پانچویں بنیاد ہے دستور اساسی یعنی دستور اساسی کے تحت چلنے والے مدارس کا حکم ان مدارس سے

مختلف ہو گا جن کا کوئی دستور نہیں ہے، غیر دستوری مدارس میں شوریٰ اور اہتمام کی بحث کا جو بھی فیصلہ ہو، لیکن دستور اساسی کے تحت چلنے والے مدارس میں اہتمام اور شوریٰ کی حیثیت کا تعین دستور اساسی سے ہو جائے گا۔

زیر بحث موضوع میں صحیح نتیجہ تک پہنچنے کے لئے ان چند بنیادوں کی اجمالی نشاندہی کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قابل اعتماد علماء و مفسرین کے حوالوں سے ان مضامین کو منقح کرنے کی کوشش کی جائے۔

## آیت پاک میں اولوالامر سے کیا مراد ہے؟

قرآن کریم میں اللہ اور رسول کی اطاعت کے ساتھ، اولوالامر کی بھی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

یا ایہا الذین آمنوا اطیعوا اللہ  
واطیعوا الرسول واولی الامر منکم  
فان تنازعتم فی شئی فردوه الی  
اللہ والرسول  
(سورۃ النساء آیت ۵۹)

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو،  
اور رسول کی اطاعت کرو اور تم میں جو اولوالامر  
میں ان کی اطاعت کرو۔ پھر اگر کسی معاملہ میں  
اختلاف ہو جائے تو اللہ اور رسول کی طرف  
مراجعت کرو۔

اس آیت پاک میں اللہ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، پھر رسول اکرم ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، پھر اولوالامر کی اطاعت کو بھی رسول کی اطاعت کے ساتھ شامل کر کے، اس کو واجب قرار دیا گیا ہے، لیکن اولوالامر سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں متقدمین کے عہد ہی سے مختلف اقوال ملتے ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے

کہ اس موقع پر چند تفاسیر کا خلاصہ پیش کر دیا جائے۔

۱۔ احکام القرآن میں امام ابو بکر جصاص المتوفی ۳۷۹ھ نے یہ قول نقل کئے ہیں، کہ کچھ حضرات نے اولوالامر کا مصداق علماء و فقہاء کو قرار دیا ہے اور کچھ حضرات نے مختلف مقامات پر جہاد کے لئے جانے والے سرتوں کے امرار کو اس کا مصداق بتایا ہے۔ پھر صاحب کتاب نے فیصلہ کیا ہے کہ اولوالامر سے ان دونوں معنی کے مراد لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ (احکام القرآن ج ۲ ص ۲۱۱ ملخصاً)

۲۔ تفسیر جامع احکام القرآن میں علامہ قرطبی المتوفی ۷۱۱ھ نے اولوالامر کے مصداق میں پانچ احتمالات کا ذکر کیا ہے۔ اہل قرآن اور اہل علم، فقہاء و علماء، تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، صرف حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما اور اولوالعقل والرای الذین یدبرون امر الناس وہ ارباب عقل و دانش اور اصحاب رائے جو لوگوں کے معاملات کی گریہ اپنے ناخن تدبیر سے کھولتے ہیں۔ پھر صاحب کتاب نے اپنے ذوق اور مختصر بحث کے ذریعہ پہلے اور دوسرے معنی کو بقیہ معانی پر ترجیح دی ہے۔ (تفسیر قرطبی ص ۲۵۹ تا ص ۲۶۱ ملخصاً)

۳۔ تفسیر کبیر میں امام فخر الدین رازی المتوفی ۸۰۶ھ کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ آیت اصول فقہ کے اکثر حصہ پر مشتمل ہے، کیونکہ فقہاء کرام یہ فرماتے ہیں کہ اصول شریعت چار ہیں، کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع اور قیاس، یہ آیت ترتیب و اران چاروں اصول کو ثابت کرتی ہے، کیونکہ اطیعوا اللہ سے کتاب اللہ، اطیعوا الرسول سے سنت رسول اللہ کے بارے میں وضاحت کے ساتھ حکم دیا گیا ہے اور اولی الامر منکم اجماع امت کے محبت ہونے پر دلالت

کرتا ہے، اور فان تنازعتم فی شئی فردوا الی اللہ والرسول قیاس کے محبت ہونے کی دلیل ہے، امام رازی رحمہ اللہ کی یہ بحث ان کی جلالت علم کی آئینہ دار ہے۔

تفسیر کبیر از ص ۱۴۷ تا ص ۱۴۹ ملخصاً،  
اس بحث کے دوران امام رازی نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ کہا جاسکتا ہے کہ مفسرین نے تو اولی الامر سے دیگر معانی مراد لئے ہیں کہ خلفاء راشدین، یا امراء و حکام، یا علماء کرام مراد ہیں یا روافض کے قول کے مطابق ائمہ معصومین مراد ہیں، مگر آپ کی بیان کردہ مراد تو امت کے بیان کردہ معانی اور اقوال سے بالکل الگ ہے، اس لئے اجماع امت کے خلاف ہونے کی بنیاد پر اس کو باطل ہی کہا جائے گا، پھر اس کا جواب دیتے ہیں۔

والجواب انه لا نزاع ان جماعة من الصحابة والتابعين حملوا قوله اولی الامر منكم علی العلماء فاذا قلنا المراد منه جميع العلماء من اهل العقد والحل لم يكن هذا اقوالاً خارجاً من اقوال الآئمة بل كان هذا اختياراً لاحد اقوالهم وتصحيحاً له بالحجة القاطعة۔ (تفسیر کبیر ص ۱۴۹)

جواب یہ ہے کہ اس میں تو کوئی اختلاف نہیں کہ صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت نے اولی الامر منكم سے علماء کو مراد لیا ہے، اس لئے اگر ہم یہ کہیں کہ اس سے تمام لوہاب حل و عقد علماء مراد ہیں، تو یہ قول امت کے اقوال سے الگ قول نہیں ہوگا، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ امت کے مختلف اقوال میں ایک قول کو لیا گیا ہے، اور دلیل قطعی سے اس کو صحیح قرار دیا گیا ہے۔

گویا امام رازی رحمہ اللہ کے نزدیک اولو الامر سے، ارباب حل و عقد علماء



کی وہ جماعت مراد ہے جن سے اجماع منعقد ہوتا ہے اور اسی قول کو انھوں نے مختلف دلائل پیش کر کے راجح قرار دیا ہے۔ غور فرمایا جائے کہ جب ارباب حل و عقد کی اجماعی طاقت تک مراد لینے کی گنجائش ہے تو کسی بھی جماعت کو مراد لینے میں کیا مانع ہے اور مجلس شوریٰ کو بہتیت حاکمہ قرار دینے میں کیا دشواری ہے؟

۴۔ ملا جیون رحمہ اللہ نے تفسیرات احمدیہ میں دونوں معنی، علماء و حکام بیان کرنے کے بعد محاکمہ فرمایا ہے۔

والحق ان المراد به كل اولی الحكم  
اماماً کان او امیراً سلطاناً کان  
او حاکماً عالماً کان او مجتهداً،  
قاضیاً کان او مفتیاً علی حسب  
مراتب التابع والمتبوع لان النص  
مطلق فلا یقید من غیر دلیل  
الخصوص۔

حق یہ ہے کہ اولی الامر سے تمام ارباب حکم کو مراد لیا جاسکتا ہے، امام ہو یا اس کے ماتحت امیر سلطان ہو یا اس کے ماتحت حکام، عالم ہو یا مجتہد، قاضی ہو یا مفتی، تابع اور متبوع میں فرق مراتب کی رعایت کرتے ہوئے سب مراد میں شامل ہیں اس لئے کہ قرآن کے الفاظ مطلق ہیں۔ اس لئے تخصیص کی معتبر دلیل کے بغیر ان میں

(التفسیرات الاحمدیہ ص ۱۶۹) قید کا اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔

ملا جیون کی اس عبارت میں تین باتیں خصوصی توجہ کی طالب ہیں۔

(الف) پہلی بات یہ ہے کہ ان الفاظ میں تمام اہل حکومت آجاتے ہیں، امام یا اس کے ماتحت حکام، علماء و مجتہدین اور قاضی اور مفتی، سب ہی مراد لئے جاسکتے ہیں گویا اپنے مفہوم لغوی کے اعتبار سے یہ لفظ "اولی الامر" جہاں جہاں منطبق ہے، اس کو مراد لینے میں کوئی تنگی نہیں، اب اگر کسی ادارہ میں یہ طے کر لیا جائے کہ یہاں

کسی جماعت کی ہیئت اجتماعی کا حکم نافذ ہوگا تو اس میں کوئی مانع نہیں۔

(ب) دوسری بات علی حسب مراتب التابع والمتبوع میں ہے کہ ان تمام حکام و امراء وغیرہ کے درمیان درجہ بندی ضروری ہوگی، امیر المومنین یا سلطان کا دائرہ حکم بہت وسیع ہے، لیکن ماتحت حکام کو اپنے دائرہ میں رہنا ہوگا، اگر کسی شخص کو چند لوگوں کے لئے "اولوالامر" کی حیثیت دی گئی ہے، لیکن وہ اپنے بالادستوں کی حیثیت سے متبوع نہیں ہے بلکہ تابع اور ماتحت ہے، تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنے بالادستوں کی ماتحتی میں کام کرے، اس کا یہ کہنا کہ میں اولوالامر میں شامل ہوں اس لئے میرے اوپر کسی کی بالادستی قائم نہیں کی جاسکتی غلط ہو جائے گا۔

(ج) تیسری بات لان النص مطلق الخ میں ہے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ، معنی مرادی پر دلالت کرنے میں اگر مطلق ہوں تو دلیل خصوصی کے بغیر قید کا اضافہ درست نہیں، لہذا لفظ اولی الامر جب مطلق ہے تو اس سے تمام ہی طبقات مراد لئے جاسکتے ہیں، علماء، فقہاء اور حکام سب ہی حسب مراتب مراد میں شامل ہوں گے، کسی خاص طبقہ کے لئے معین کرنے کا دعویٰ، دلیل کے بغیر قابل قبول نہیں، یعنی کسی ادارے میں کام کرنے والے تمام کارکنان کے لئے ناظم یا مہتمم کی حیثیت اولوالامر کی ہے درست ہے لیکن مہتمم کے حق میں مجلس شوریٰ اولوالامر نہیں ہے اس کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ دلیل اس پر قائم ہے کہ روزاؤل سے وہ ایک قانون ساز اور صاحب امر جماعت ہے اور عہد اکابر سے لیکر آج تک تعامل، دستور اساسی، اور اکابر کی تحریرات کی رو سے اسکے احکام نافذ ہیں

۵۔ ابن کثیر میں ہے۔

قال ابن عباس واولی الامر منکم، یعنی اہل الفقہ والدین وکذا قال مجاہد وعطاء، واولی الامر منکم یعنی العلماء والظاهر والله اعلم انها عامۃ فی کل اولی الامر من الامراء والعلماء کما تقدم (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۱۷۸)

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا واولی الامر منکم سے مراد اہل فقہ اور اہل دین ہیں مجاہد اور عطاءؓ نے بھی یہی فرمایا ہے، اور اولی الامر منکم سے مراد علماء ہیں اور اس سے مراد بظاہر۔ واللہ اعلم۔ یہ ہے کہ یہ کلمہ تمام اولو الامر کو عام ہے خواہ وہ علماء ہوں یا امراء، جیسا کہ گذر چکا ہے۔

ابن کثیر کے ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ کلمہ اولو الامر کو تمام ہی علماء و امراء کے لئے عام قرار دیا جائے گا، گویا اگر مہتمم اپنے ماتحتوں کے لئے اولو الامر ہیں، اور یہ بات صحیح ہے تو مجلس شوریٰ مہتمم کے حق میں یقیناً اولو الامر ہے اور یہ معنیٰ مراد لینا بالکل درست ہوگا۔

۶۔ تفسیر المنار میں سید رشید رضا مصری رحمہ اللہ نے، شیخ محمد عبده کی طرف منسوب کر کے لکھا ہے۔

قال رحمه الله انه فكر في هذه المسألة من زمن بعيد فانتهی به الفكر الى ان المراد باولی الامر جماعة من اهل الحل والعقد من المسالین (تفسیر المنار ج ۵ ص ۱۸۱)

شیخ محمد عبده نے فرمایا کہ انھوں نے عرصہ دراز تک اس مسئلہ پر غور و فکر کیا اور غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ "اولو الامر" سے مراد مسلمانوں کی اہل حل و عقد کی جماعت ہے۔

شیخ محمد عبدهؒ نے "اولو الامر" کے معنی مرادی میں ارباب حل و عقد کی جماعت کی تعیین کر دی، پھر علامہ رشید رضا مہری نے اپنے استاد کے قول کو امام رازی رحمہ اللہ کے استدلال سے مدلل اور منقح کرنے کی کوشش فرمائی۔  
 ۱۔ تفسیر الجواہر میں شیخ طنطاوی لکھتے ہیں۔

وقولہ (اولی الامر منکم) ہم  
 اهل الحل والعقد فی الامم  
 الاسلامیۃ الذین یکون الامر  
 بینہم شوری ویکون الراى  
 الغالب معمولاً بہ وال فی  
 الامر للعہد والمعہود ذللی  
 فی قولہ تعالیٰ۔ وامرہم شوری  
 بینہم۔ فہذا ہوا الامر المذکور  
 ہہنا۔ (تفسیر الجواہر للطنطاوی ج ۲ ص ۵۴)

ارشاد باری اولی الامر منکم میں اولو الامر  
 سے مراد، اہم اسلامیہ میں پائے جانے والے  
 وہ ارباب حل و عقد ہیں جو اپنے امور،  
 شوری کے ذریعہ طے کرتے ہیں اور اس میں  
 اکثریت کی رائے پر عمل کیا جاتا ہے، یہاں  
 الامر میں جو ان ہے وہ عہد خارجی کا ہے  
 جس سے مراد وہ امر ہے جو امرہم شوری  
 بینہم میں مذکور ہوا ہے، وہی امر یہاں  
 بھی ذکر کیا گیا ہے۔

علامہ طنطاوی نے اولو الامر کے معنی مرادی کی تعیین میں مجلس شوریٰ ہی کی  
 صراحت فرمادی، ان کی تفسیر کا مفہوم یہ ہے کہ اولو الامر میں جو لفظ الامر  
 آیا ہے یہ دراصل وہی امر ہے جو امرہم شوریٰ بینہم میں بھی مذکور ہے۔  
 اس لئے اولو الامر انہی لوگوں کی جماعت کو کہا جائے گا جو اپنے امور میں شوریٰ  
 کے ذریعہ فیصلہ کرتے ہیں۔

متقدّمین و متاخرین اور عصر حاضر کی ان چند تفاسیر کا خلاصہ نقل کرنے کا

مدعا صرف یہ ہے کہ اولوالامر کی مراد کی تعیین میں مختلف اقوال ہیں، اس لئے یہ دعویٰ کرنا کہ مدارس عربیہ کے نظام کار میں مہتمم توالوالامر میں آتے ہیں، مجلس شوریٰ نہیں آتی ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی تائید نہ اولوالامر کے معنی لغوی سے ہوتی ہے اور نہ تفسیر کی کتابوں میں جو بحث کی گئی ہے اس سے اس موقف کو ثابت کیا جاسکتا ہے۔

## اولوالامر کا اصل مصداق فرد و جماعت دونوں ہو سکتے ہیں

کلمہ "اولوالامر" سے افراد مراد لینے کے سلسلے میں کوئی اختلاف نہیں اس لئے اس مضمون کو حوالوں کے ساتھ نقل کرنے کی ضرورت نہیں البتہ یہ مناسب ہوگا کہ اس موقع پر اولوالامر سے جماعت مراد لینے والے چند مفسرین کی عبارت نقل کر دی جائے۔

۱۔ احکام القرآن میں امام ابو بکر جصاص نے روافض کے رد میں لکھا ہے۔

روافض کی یہ جماعت کہتی ہے کہ ارشاد	زعمت هذه الطائفة ان المراد
باری واولی الامر منکم سے مراد حضرت	بقوله تعالى واولی الامر منکم
علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں، مگر یہ	علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ
تاویل فاسد ہے اس لئے کہ اولی الامر	وهذا تاویل فاسد لان اولی الامر
جماعت کا نام ہے اور حضرت علی بن ابی طالب	جماعة وعلی بن ابی طالب جل احد
تو ایک ہی فرد ہیں۔	(احکام القرآن ص ۲۱)

امام ابو بکر جصاص نے تردید تو روافض کی فرمائی ہے، کہ ان لوگوں نے



اولوالامر سے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات کو مراد لیا ہے۔ لیکن قرآن کریم کے الفاظ ان معنی مرادی کا ساتھ نہیں دیتے، کیونکہ اولو جمع کا صیغہ ہے جس کی مراد جماعت ہونی چاہئے، جبکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ایک ہی ذات گرامی کا نام ہے بہر حال مفسر مذکور کے ارشاد کے مطابق اولوالامر سے جماعت مراد لینے کی صراحت ہو گئی۔  
۲۔ امام ابو بکر جصاص سے زیادہ واضح تعبیر امام رازی کے یہاں پائی جاتی ہے، امام رازی نے بھی ان روایات کی تردید فرماتے ہوئے جو اولوالامر سے مراد ائمہ معصومین کو لیتے ہیں، یہ ارشاد فرمایا ہے کہ روایات کا اولوالامر سے، ائمہ معصومین مراد لینا غلط ہے کیونکہ

انہ تعالیٰ امر بطاعة اولی الامر،  
واولوالامر جمع وعندہم لایکون  
فی الزمان الواحد الا امام  
واحد حمل الجمع علی الفرد خلا الظاہ  
(تفسیر کبیر منہاج ج ۵)  
اللہ تعالیٰ نے اولوالامر کی اطاعت کا حکم  
دیا ہے اور اولوالامر جمع کا لفظ ہے، اور  
روایات کے یہاں ایک وقت میں ایک  
ہی امام ہوتا ہے اور جمع کے لفظ کو فرد کے  
اوپر محمول کرنا، ظاہر کے خلاف ہے،

مفہوم یہ ہوا کہ اولوالامر سے، ائمہ معصومین کو مراد نہیں لیا جاسکتا، دلیل یہ  
ہے کہ لفظ اولو جمع کا صیغہ ہے، اور جمع سے مراد وہ معنی ہونے چاہئیں جن میں  
جمع ہونے کی شان ہو، فرد پر جمع کا اطلاق بالکل ظاہر کے خلاف ہے۔

اسی لئے امام رازی کا رجحان اولوالامر کے سلسلے میں یہ ہے کہ اس سے  
مسلمانوں کی وہ جماعت مراد ہے جن کے ایک موقف کو اختیار کر لینے سے اجماع  
امت منعقد ہو جاتا ہے، بہر حال امام رازی کے ارشاد کے مطابق اولوالامر سے مراد

جماعت ہے، فرد نہیں۔ اس لئے مناسب ہوگا کہ مدارس عربیہ کے نظام کاریں اس سے مہتمم مراد نہ لیا جائے، کیونکہ وہ فرد واحد ہے، بلکہ اس سے مراد مجلس شوریٰ ہی کو لیا جانا چاہئے کیونکہ وہ اولوالامر کی جماعت ہے۔

۳۔ جماعت مراد لینے والے مفسرین میں سید رشید رضا مصری، اور علامہ طنطاوی کا نام بھی اہم ہے، اس لئے کہ ان دونوں مفسرین نے جماعت ہی نہیں، بلکہ شوریٰ کی صورت میں قائم ہونے والی جماعت کو مراد لیا ہے، سید رشید رضا مصری تفسیر المنار میں لکھتے ہیں۔

یہ وہ بات ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہم پر، مسائل سے متعلق حکمت سے لبریز اس آیت کی تفسیر کے وقت کھولی ہے، اس سے آیت کے معنی روشن ہو جاتے ہیں اور مفسرین کے اقوال میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح حاصل ہو جاتی ہے کہ تمام مسلمانوں پر اللہ کی اطاعت، کتاب اللہ پر عمل کرنے کی صورت میں واجب ہے، اور رسول کی اطاعت، ان کی سنت کا اتباع کرنے کی صورت میں واجب ہے اور ارباب حل و عقد پر مشتمل علماء و رؤساء کی قابل اعتماد جماعت اولی الامر کی اطاعت شوریٰ کے ذریعہ وضع کردہ، شہری، عدالتی

هذا ما فتح الله به علينا عند تفسير هذه الآية الحكيمة من المسائل التي يتجلى به معناها والترجيح بين اقوال المفسرين فيها انه يجب على جميع المؤمنين طاعة الله بالعلم بكتابه وطاعة رسوله باتباع سنته وطاعة جماعة اولي الامر وهم اهل الحل والعقد من علماء الامة ورؤسائها الموثوق بهم عند ما فيما يضعونه لها بالشورى من الاحكام المدنية

اور سیاسی احکام کے اتباع کی صورت  
میں واجب ہے۔

والقضائیة والسیاسیة

(تفسیر المنارج ۵ ص ۲۲۱)

علامہ رشید رضا، اگرچہ اولوالامر سے وہ بالادست مجلس ثوری مراد لے رہے ہیں جو اسلامی حکومت میں سلطان پر بھی تفوق رکھتی ہے، لیکن واضح ترین بات یہ ہے کہ جب اقتدار اعلیٰ یعنی سلطان پر بھی مجلس ثوری کو بالادستی حاصل ہے تو مدارس عربیہ کے نظام کار میں اس کی بالادستی میں کیا شک و شبہ کیا جاسکتا ہے۔  
۴۔ علامہ طنطاوی لکھتے ہیں۔

غور کا مقام ہے کہ باری تعالیٰ نے سورۃ نساء کی آیت یا ایہا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم میں کیا ارشاد فرمایا؟ یہ اولوالامر کون ہیں یہ وہی ہیں جو مسلمانوں کے درمیان اہل ثوری کے نام سے معین ہیں جن کا ذکر اس سے پہلے کی مکی سورت میں۔ امرهم شورى بینہم۔ کے اندر ہو چکا ہے۔ اسلئے ہر اسلامی مملکت میں مجلس ثوری ہونی چاہئے اور بالفاظ دیگر مجلس نمائندگان ہونی چاہئے یہ مجلس مملکت کے معاملات میں فیصلہ کن قوت کی مالک ہو۔ تاکہ وہ مصلحت اور شرع کے

انظر ماذا قاله الله في سورة النساء۔ يا ايها الذين امنوا اطيعوا الله واطيعوا الرسول واولى الامر منكم۔ ومن هم اولوالامر هم المعهودون عندهم هم اهل الشورى المذكورون في السورة النازلة قبلها في مكة۔ وامرهم شورى بينهم۔ فليكن في كل بلد اسلامي مجلس للشورى وبعبارة اخرى نواب وهذا المجلس لها القول الفصل في امر البلاد فليفعل ما يشاء

ولیحکم بہا یرید مطابق جو چاہے عمل کرے، اور جو چاہے

(تفسیر الجواهر للطنطاوی ج ۳ ص ۵۶) فیصلے نافذ کرے۔

علامہ طنطاوی بھی اولوالامر سے جماعت ہی مراد لے رہے ہیں، اور جماعت کے ساتھ اس کو مجلس شوریٰ، یا عوامی مجلس نمائندگان کی صورت میں متعین کر کے اس کے احکام کو واجب التعمیل قرار دے رہے ہیں۔ اس لئے اس قول کے مطابق بھی مدارس عربیہ کے نظام کاریں، اولوالامر کا مصداق مجلس شوریٰ ہی کو ہونا چاہئے۔

بات مفصل ہو جائے گی ورنہ دیگر مفسرین کے اقتباسات بھی دے جاسکتے ہیں، مقصود یہ ہے کہ ۱۳۰۲ھ میں امام ابو بکر جصاص، پھر ۱۳۰۳ھ میں امام رازی، پھر تیرہویں اور چودہویں صدی میں شیخ محمد عبدہ، علامہ رشید رضا، اور علامہ طنطاوی، اولوالامر سے جماعت مراد لینے کے حق میں ہیں، فرق یہ ہے کہ امام رازی نے اس کو مسلمانوں کی اجماعی طاقت پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور مفتی محمد عبدہ وغیرہ اس کو خلیفہ پر بالادستی رکھنے والی قانون ساز مجلس شوریٰ پر منطبق کر رہے ہیں۔

قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ نے بھی "اولوالامر" کے معنی کی وضاحت میں صیغہ جمع کے ساتھ "علماء ربانی" کو مراد لیا ہے۔

ماحصل آیت این است کہ اطاعت آیت کا حصاصہ یہ ہے کہ اہل امر کی اطاعت  
اہل امر باید کرد، مگر چہ ضرور است کہ کی جائے، مگر یہ کیا ضروری ہے کہ اہل

امر سے مراد، امیر اور امام لئے جائیں بلکہ  
علماء و ربانی بھی مراد ہو سکتے ہیں  
جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب کی  
حیثیت اللہ اور رسول کے ادا امر و  
نواہی کو مخلوق تک پہنچاتے ہیں اور اسی  
وجہ سے وہ مخلوق کیلئے مطاع ہو گئے ہیں۔

مراد از اہل امر، امیر و امام باشند، بلکہ علماء  
ربانی باشند کہ بہ نیابت حضرت رسول  
صلی اللہ علیہ وسلم ادا امر و نواہی نبوی و  
خداوندی بخلاق می رسانند و بہ ہمیں وجہ  
مطاع خلاق گردیدہ باشند۔

قاسم العلوم ص ۲۰۷

ایک صفحہ کے بعد ارشاد فرماتے ہیں۔

اور شاید اسی وجہ سے، اس آیت کے بعد  
دوسرا جملہ لایا گیا ہے جو پہلی آیت کی نسبت  
سے، ہمارے بیان کردہ اشارہ کے بارے  
میں شرح و تفسیر کا درجہ رکھتا ہے۔ میری  
مراد ہے جملہ فان تنازعتم فی شئی فردوہ  
الی اللہ والرسول ان کنتم توؤمنون  
باللہ والیوم الآخر۔

و بہ ہمیں وجہ غالباً پس ازیں آیت، جملہ دیگر  
آوردہ اند کہ بمنزلہ شرح و تفسیر است  
بہ نسبت آیت اولی دربارہ اشارہ مذکور  
اعنی جملہ فان تنازعتم فی شئی فردوہ  
الی اللہ والرسول ان کنتم توؤمنون  
باللہ والیوم الآخر۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہمارا ذکر کردہ مطلب، اس دوسرے جملہ پر  
غور کرنے کے بعد، علم الیقین سے حق الیقین  
تک پہنچ جاتا ہے۔

مطلب مذکور پس از مطالعہ جملہ لاحقہ،  
از علم الیقین بحق الیقین می رسد  
(ایضاً ص ۲۰۹)

مراد یہ ہے کہ چونکہ کتاب و سنت کی طرف مراجعت کا کام صرف علماء ہی کر سکتے  
ہیں، اور نزاع کی صورت میں صرف یہی حکم دیا گیا ہے اس لئے "اولوا الامر" سے علماء



مراد لینا بالکل درست بلکہ اولیٰ، بلکہ یقین کے درجہ میں صحیح ہے۔

## خلاصہ بحث

ہمیں اس موضوع پر محاکمہ یا تقابلی مطالعہ کرنا نہیں ہے اور نہ ہم کسی ایک معنی کو دوسرے پر ترجیح دینے کی سعی کر کے بحث کا دروازہ کھولنا چاہتے ہیں بلکہ ان چند بحثوں کے نقل کرنے کا مدعا یہ واضح کرنا ہے کہ اولوالامر کے معنی مرادی کی تعیین میں متعدد باتیں کہی گئی ہیں، اس سے خلیفۃ المومنین یا سلطان یعنی اسلامی اقتدار کا سب سے اونچا منصب بھی مراد لیا گیا ہے اور ماتحت امر اور حکام بھی تمام صحابہ کرام بھی مراد لئے گئے ہیں اور حضرت ابو بکرؓ و حضرت عمرؓ بھی، ائمہ اجتہاد بھی مراد لئے گئے ہیں اور علماء و مشائخ بھی، پھر یہ کہ ان اہل مناصب اور علماء کو انفرادی حیثیت سے بھی مراد لیا گیا ہے۔ اور ان کی جماعت کو بھی، جماعت سے جماعت امت کے انعقاد کی صلاحیت رکھنے والی جماعت بھی مراد لی گئی ہے۔ اور اسلامی حکومت میں خلیفہ پر بالادستی رکھنے والی ارباب حل و عقد کی مجلس شوریٰ بھی غرض متعدد احتمالات ہیں اور کسی بھی احتمال کو نہ از روئے لغت غلط کہا جاسکتا ہے۔ نہ از روئے شرع، کیونکہ لغت میں بھی ان معانی کی گنجائش ہے، اور علماء کرام نے قرآن فہمی کا جو معیار مقرر فرمایا ہے اس کی رو سے بھی ہر معنی کی گنجائش ہے۔

**تمام اولوالامر یکساں نہیں ہیں**

نیز یہ کہ ہم ان تمام ہی اقوال کے مطابق "اطاعت اولی الامر" کے حکم خداوندی کی تعمیل کر سکتے ہیں اور اس کی بہت آسان صورت یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کے ارشاد کے مطابق جس شخص کو جس جگہ اولوالامر قرار دیا گیا ہے اس کے دائرے کو متعین کریں اور اس دائرے میں سب ماتحت اس کی اطاعت کو ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر قبول کریں، اس سلسلے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سب سے زیادہ واضح ہے۔

الاکلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ فالامام الذی علی الناس راع وهو مسئول عن رعیتہ والرجل راع علی اہل بیتہ وهو مسئول عن رعیتہ ..... والمرأۃ راعیۃ فی بیت زوجها وولدہ وھی مسئوۃ عنہم وعبد الرجل راع علی مال سیدہ وهو مسئول عنہ، الا فکلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔

(بخاری ج ۲ ص ۱۵۷)

خبردار کہ تم میں سے ہر انسان ذمہ دار اور نگران ہے اور اپنی زیر نگرانی تمام چیزوں کیلئے جواب دہ ہے چنانچہ وہ امام جو عام انسانوں کا نگران ہے وہ اپنی رعایا کے بارے میں جواب دہ ہے، اور مرد اپنے اہل خانہ کا نگران ہے اور اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے، اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور اولاد کی نگران ہے، اور اس سلسلے میں جواب دہ ہے، اور انسان کا غلام، آقا کے ماں کا نگران ہے اور اس سلسلے میں جواب دہ ہے۔ خبردار تم میں سے ہر انسان مردار اور نگران ہے اور اپنی زیر نگرانی تمام چیزوں کے بارے میں جواب دہ ہے۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک میں پوری وضاحت کے ساتھ تفصیل کی گئی ہے کہ جس انسان کی زیر نگرانی جو چیزیں ہیں وہ اس دائرہ

میں ذمہ دار بھی ہے اور جواب دہ بھی ہے اور اس کو اپنے اوپر عائد ذمہ داریوں کو پورا کرنا چاہئے، اس ارشاد میں نیچے سے اوپر تک تمام ذمہ داریوں کیلئے راعی کا ایک ہی لفظ بولا گیا ہے، لیکن ظاہری بات ہے کہ ان سب کے دائرے الگ الگ اور کم و بیش ہیں۔ فتح الباری میں ہے۔

قال الخطابی اشترکوا ای الامام الاعظم والرجل ومن فی التسمیة ای فی الوصف بالراعی ومعانیہم مختلفة فرعاية الامام الاعظم حیاطة الشریعة باقامة الحدود والعدل فی الحكم ورعاية الرجل اہلہ سیاستہ لامرہم والصلحہم حقوقہم ورعاية المرأة تدبیر امر البیت والاولاد والخدم والنصیحة للزوج فی کل ذلک و رعایة الخادم حفظ ما تحت یدہ والقیام بما یجب علیہ من خدمتہ

خطابی نے کہا کہ سب بڑا امام اور صاحب خانہ اور جن جن کا روایت میں ذکر آیا یعنی ان کا راعی (ذمہ دار) ہونا بیان کیا گیا وہ سب راعی کے اطلاق میں مشترک ہیں مگر ان کے معانی الگ الگ ہیں، امام المؤمنین کے راعی ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ حکومت عدل اور حدود کو قائم کر کے شریعت کی حفاظت کرے، صاحب خانہ کے راعی ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ گھروالوں کے معاملات کی تدبیر کرے۔ اور ان کے حقوق ادا کرے عورت کے راعی ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ گھر کے معاملات، اولاد اور خدام کے سلسلے میں شوہر کی خیر خواہ ہو، اور خادم کے راعی ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ جو اس کے ہاتھ میں ہے اس کی حفاظت کرے۔ اور اس کے ذمہ

(فتح الباری ج ۳ ص ۱۳۱)

جو خدمت واجب ہوتی ہے اس کی ادائیگی کرے۔  
 الگ الگ اور کم و بیش ذمہ داریاں رکھنے والے یہ ذمہ دار (راعی) یکساں  
 حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ ان میں بذیہ طور پر فرق مراتب ہے، لیکن جس انسان کا  
 جو دائرہ کار ہے وہ اس سلسلے میں اولوالامر ہے اوپہا تختوں کے لئے اس کے  
 احکام کا ماننا واجب ہے۔ البتہ یہ وضاحت ضروری ہے کہ کسی شخص کے خاص  
 دائرے میں اولوالامر ہونے کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اب اس کے اوپر  
 کسی کی نگرانی نہیں ہے۔ اور وہ کسی کا ماتحت نہیں۔ یعنی مثلاً مدارس عربیہ کے  
 نظام کار میں مہتمم کے درجہ کا اولوالامر ہو جانا اس کا تقاضا نہیں کرتا کہ اب اس  
 کے اوپر کسی کی نگرانی قائم نہیں ہو سکتی، بلکہ فتح الباری میں صاف ہے۔

ولا يلزم من الاتصاف بكونه  
 راعياً ان لا يكون مَرعياً  
 باعتبار آخر رفق الباری ج ۱۳ ص ۱۱۱  
 کسی انسان کے راعی (بالادست) ہونے  
 سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ وہ کسی دوسرے  
 اعتبار سے مرعی (ماتحت) نہ بن سکے۔

عمدة القاری شرح بخاری میں اس سے بھی زیادہ وضاحت سے موجود ہے۔  
 فان قيل اذا كان كل من  
 هؤلاء راعياً فمن المرعى،  
 اجيب هو اعضاء نفسه و  
 جوارحه وقواه وحواسه  
 او الراعى يكون مرعياً  
 باعتبار اخر ككون الشخص  
 اگر یہ کہا جائے کہ جب یہ سب ہی راعی،  
 (بالادست) ہیں تو مرعی (زیر دست) کون  
 رہا۔ جواب دیا جائیگا کہ مرعی، خود اس کے  
 اعضاء و جوارح، اور اس کے قویٰ اور حواس  
 ہیں۔ یا جواب یہ دیا جائے گا کہ راعی، دوسری  
 جہت سے مرعی بن سکتا ہے۔ مثلاً ایک

مَرَعِيًّا لِّلْاِمَامِ رَاعِيًّا لِّاَهْلِهِ  
شخص امام کی نسبت سے مرعی، اور اپنے

عُمْدَةُ الْقَارِي ۲۶۸ ج ۳  
اہل خانہ کی نسبت سے راعی ہے

گویا مدارس عربیہ کے نظام کاریں بھی یہ بالکل درست ہے کہ مہتمم میں دو حیثیتیں ہوں، ماتحتوں کے اعتبار سے وہ اولوالامریہ ہیں۔ لیکن مجلس شورئی کی نسبت سے ان کی حیثیت مامور کی ہے، غرض ایک ہی شخص میں دونوں حیثیتوں کا ہونا فتح الہیائی اور عینی سے ثابت ہے۔

## یہ محاسبہ، دُنیا و آخرت دونوں میں ہے

اسی مُحْكَمِ رَآءِی کے ساتھ آپ نے یہ بھی واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ حُكْمِ مَسْئُول، ہر انسان سے اس کی ذمہ داریوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ یہ سوال دنیا میں بھی ہے اور آخرت میں بھی، پروردگار عالم بھی ہر انسان سے یہ محاسبہ فرمائے گا، اور بندگانِ خدا بھی اپنی اپنی حدود میں رہتے ہوئے یہ محاسبہ کریں گے۔ غلام کا محاسبہ آقا کرے گا۔ عورت سے محاسبہ اس کا شوہر کرے گا۔ اور ماتحت اولوالامر سے محاسبہ، ان سے بالادست اولوالامر کریں گے۔ اور جو سب سے بڑی طاقت یعنی امیر المؤمنین ہے۔ اس سے محاسبہ عوامی طاقت یا عوامی نمائندے مجلس اولوالامر کے ممبران کریں گے۔

قیامت کے دن جواب دہی اور مسئولیت کی بات تو بالکل واضح ہے کیونکہ تمام شارحین حدیث آخرت کی مسئولیت کے باب میں اس روایت پر متفق ہیں اور ہر معاملہ میں آخرت کی جواب دہی اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔



اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولَٰئِكَ كَانَ عِنْدَ مَسْئُولٍ -

برہ دنیا کی مسئولیت کا اس روایت سے تعلق، تو بعض محدثین کرام نے

اسی روایت کو دنیا کی مسئولیت سے بھی متعلق کیا ہے، مثلاً امام بخاری رحمہ اللہ

نے اس روایت کو کتاب الاحکام میں باب اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی

الامر منکم کے تحت نقل کیا ہے، جس کا صاف مفہوم یہ ہے کہ امام بخاری روایت

میں ذکر کردہ راعیوں کو اولوالامر سمجھ رہے ہیں، اور کتاب الاحکام میں اس کو ذکر

کرنے کا اشارہ یہ ہے کہ وہ دنیا کی مسئولیت کا تعلق بھی روایت سے مان رہے

ہیں، چنانچہ حضرت علامہ کشمیری قدس سرہ اس باب پر لکھتے ہیں۔

هذا الحديث يتعلق بالديانات      یہ حدیث دیانات سے متعلق ہے لیکن بخاری

وقد عقل المصنف باباً للحکم      نے اس پر حکم کا ایک باب لگایا ہے۔ یعنی

فلعله لم يفرق بينهما -      کتاب الاحکام میں ذکر کیا ہے۔ اشارہ یہ معلوم

ر فیض الباری جلد ۴ ص ۴۹۸      ہوتا ہے کہ وہ دونوں کے درمیان فرق

نہیں کرنا چاہتے۔      ※ ※ ※ ※ ※

علامہ بدرالدین عینی کا ارشاد اور زیادہ واضح ہے، وہ اسی روایت کے

تحت لکھتے ہیں۔

فكل من كان تحت نظره      جس انسان کی زیر نگرانی جو چیز ہو تو وہ اس کے

شئ فهو مطلوب بالعدل      سلسلے میں عدل اختیار کرنے اور اس کے دین،

فيه والقيام بمصالحه في دینه      دنیا اور متعلقات کے بارے میں مصلحتوں

ودنیاه و متعلقاته، فان      کے مطابق عمل کا پابند ہے۔ چنانچہ اگر اس نے

وفي ما عليه من الرعاية حصل  
له الحظ الا وفروا الجزاء  
الاكبر وان كان غير ذلك  
طالبه كل احد من رعيته  
بحقه -

نگرانی کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری کو پورا کیا۔  
تو اس کو پورا حصہ اور بڑی سے بڑی جزا  
ملے گی، اور اگر دوسری صورت ہوئی تو اس کی  
رعایا میں سے ہر شخص کو اپنے حق کے مطالبہ کا  
اختیار ہوگا۔

(عمدة القاری ج ۳ ص ۳۶۷)

یعنی ہر شخص اپنے ذمہ داریوں کو صحیح طور پر ادا کرنے کا مکلف ہے۔ یہ  
ذمہ داریاں دین کی بھی ہیں اور دنیا کی بھی، انہی ذمہ داریوں کی ادائیگی پر دنیا و  
آخرت کی فلاح موقوف ہے، اور اگر ان کی ادائیگی میں کوتاہی کی گئی تو آخرت  
میں پروردگار عالم باز پرس فرمائے گا، اور دنیا میں ہر صاحب حق کو اپنے جائز  
حقوق کے مطالبہ کی اجازت ہے، خلافت راشدہ کے دور میں امیر المومنین کے،  
عوام کے سامنے جواب دہ ہونے کی پوری تفصیل کر دی گئی ہے، طبقات ابن سعد  
میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلافت کا بارگراں سنبھالنے کے بعد  
جو پہلا خطبہ دیا اس میں ارشاد فرمایا۔

ایہا الناس! انی قد ولّیت علیکم  
ولست بخیرکم فان احسنت  
فاعینونی وان اسأت  
فقومونی الخ (بخوارہ فتح الکرم ص ۲۶)

حضرات! میں تم پر حاکم مقرر کیا گیا ہوں، اور  
میں تم میں سب سے بہتر نہیں ہوں اگر میں  
اچھا کام کروں تو میری مدد کرنا، اور اگر  
برائی کی طرف جاؤں تو مجھے سیدھا کر دینا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی بار بار عام مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے یہ

فرمایا کہ اگر تم میرے اندر کجی کا احساس کرو تو مجھے سیدھا کر دینا، حضرت عمرؓ کے عہد میں عام مسلمانوں کو خلیفہ وقت اور دیگر امار کے سامنے اپنی بات کہنے کی جتنی آزادی تھی وہ سب تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہے، صرف مرد ہی نہیں بلکہ عورتوں نے بھی براہ راست بعض معاملات میں حضرت عمرؓ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے۔ اثنیٰ اللہ یا عمر، عمر! اللہ سے ڈرو۔

اسلامی حکومت کی صحیح تصویر خلافت راشدہ ہی میں ملتی ہے کہ وہاں ہر عام انسان کو اپنے حقوق کے مطالبہ کا پورا اختیار دیا گیا، رہا ماتحت امار کا معاملہ تو ان کے سلسلے میں معاملہ اور زیادہ آسان ہے کہ براہ راست بھی مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔ اور بالادست حکام کے یہاں مرافعہ کی بھی آزادی ہے۔

## اولوالامر کے درمیان فرق مراتب کی تفصیل

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بالادست اور ماتحت اولوالامر کے درمیان فرق مراتب کیلئے: اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں ایک نہایت قدیم اور معتبر کتاب، الاحکام السلطانیہ کے چند مضامین کا خلاصہ پیش کر دیا جائے، تاکہ یہ بات بالکل واضح ہو جائے کہ تمام اولوالامر کے حقوق یکساں نہیں ہیں۔ ان کے اختیارات میں بھی فرق ہے اور ان کا دائرہ خدمات بھی ایک دوسرے سے ممتاز ہے۔

اس طرح یہ بات بھی منقح کی جا سکے گی کہ مدارس عربیہ کے نظام کار میں ہستم کی حیثیت، امراء سلطنت میں کس امیر سے مشابہت رکھتی ہے اور مجلس شوریٰ کی

کیا حیثیت ہے؟ کیونکہ ہندوستان کے مدارس عربیہ کی موجودہ صورت حال میں مہتمم اور مجلس شوریٰ کی تفصیلات متقدمین کی کتابوں میں تو درکنار، متاخرین کے یہاں بھی بالکل مذکور نہیں ہیں، کیونکہ یہ صورت حال، عالم اسلام میں پہلی ہی بار پیش آئی ہے، اُن کے بارے میں حکم شرعی معلوم کرنے کیلئے اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ متقدمین و متاخرین نے عہدیداروں کے بارے میں جو تفصیلات قلمبند کی ہیں ان پر قیاس کیا جائے کہ مہتمم کی امارت کس نوع کی ہے اور مجلس شوریٰ کی کیا نوعیت ہے؟ یا پھر دوسری صورت یہ ہے کہ فقہار کے یہاں ذکر کردہ اصولی بحثوں کو ان پر منطبق کر کے احکام کا استخراج کیا جائے۔

## الاحکام السلطانیہ کے پہلے باب کا خلاصہ

شیخ ابوالحسن ماوردی المتوفی ۴۵۰ھ نے الاحکام السلطانیہ کے پہلے باب میں امامت کبریٰ اور خلافت عالیہ سے بحث کی ہے اور بیس صفحات میں مندرجہ ذیل عنوانات پر سیر حاصل کلام کیا ہے، امامت کبریٰ کا شرعی حکم، امامت کبریٰ کے مقاصد، اس کا وجوب، اس کے انعقاد کی شرطیں، تقریر امام کی جائز صورتیں یعنی ارباب حل و عقد کے ذریعہ انتخاب، یا ولیعہدی کی صورت میں نامزدگی، ولیعہد نامزد کرنے کے احکام، امام کی ذمہ داریاں، امام کے حقوق، اور دیگر قیمتی مضامین قلمبند فرمائے ہیں، اس باب کے آخر میں شیخ ابوالحسن ماوردی لکھتے ہیں۔

"احکام امامت کی تفصیل کے بعد جو ہم نے بیان کی کہ مذہب و ملت کی تمام دینی و دنیاوی مصلحتیں منصب امام ہی سے وابستہ ہیں، اب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ

امام منصبِ امامت پر فائز ہونے کے بعد، اپنے اختیارات چار طرح کے عہدیداروں میں تقسیم کر دیتا ہے:

پہلی قسم میں وہ عہدیدار ہیں جن کو عام خدمات کیلئے اختیاراتِ عامہ سپرد کئے جاتے ہیں، یہ وہ وزراء ہیں جو بلا تخصیص تمام امور میں امام کی نیابت کرتے ہیں۔ دوسری قسم میں وہ عہدیدار ہیں جن کو خاص خدمات کیلئے عام اختیارات دئے جاتے ہیں ان میں صوبوں اور شہروں کے امراء شامل ہیں اس لئے ان کی امارت اگرچہ مخصوص حد میں ہوتی ہے مگر ان کو اس محدود خدمت کیلئے عام اختیارات دئے جاتے ہیں۔

\*\*\*

\*\*\*

تیسری قسم میں وہ عہدیدار ہیں کہ جن کو عام خدمات کیلئے خاص اختیارات دئے جاتے ہیں جیسے قاضی القضاة، نقیب شکر، محافظ سرحد، مالگذاری کا محصل اعلیٰ، صدقات کا محصل اعلیٰ، یہ عہدیدار اپنے اپنے مخصوص شعبوں میں عام اور کلی اختیار رکھتے ہیں۔

فَالْقِسْمُ الْاَوَّلُ مِنْ تَكُونُ  
وَلَايَتِهِ عَامَةً فِي الْاَعْمَالِ  
الْعَامَةِ وَهُمْ الْوُزَرَاءُ لِأَنَّهُمْ  
يَسْتَنَابُونَ فِي جَمِيعِ الْأُمُورِ  
مِنْ غَيْرِ تَخْصِيصٍ وَالْقِسْمُ  
الثَّانِي مِنْ تَكُونُ وَلَايَتِهِ  
عَامَةً فِي أَعْمَالٍ خَاصَّةٍ وَ  
هُمْ أُمَرَاءُ الْأَقَالِيمِ وَالْبُلْدَانِ  
لَا نَظَرَ فِي مَا خَصَّوْا بِهِ  
مِنْ الْأَعْمَالِ عَامٍ فِي جَمِيعِ  
الْأُمُورِ۔

القسم الثالث من تكون ولايته  
خاصة في الأعمال العامة و  
هم مثل قاضي القضاة ونقيب  
الجيش وحامى الثغور ومستوفى  
الخارج وجابى الصدقات لان  
كل واحد منهم مقصور على نظر  
خاص في جميع الأعمال۔



والقسم الرابع من تكون ولايته خاصة في اعمال خاصة وهم مثل قاضي بلد او اقليم او مستوفى خراجہ او جابی صدقات او حامی ثغرہ او نقیب جنده لان كل واحد منهم خاص بالنظر مخصوص العمل۔ (الاحكام السلطانيہ ص ۱۲۷) ہیں۔

چوتھی قسم میں وہ عہدیدار ہیں جن کو خاص خدمات کیلئے، محدود اختیارات دئے جاتے ہیں۔ جیسے کسی صوبہ یا شہر کا قاضی، یا اسی مخصوص خطہ کی مالگزاری کا افسر یا محصل صدقات یا اس کی سرحد کا محافظ یا وہاں کی فوج کا نقیب، اس لئے کہ ان سب کو خاص خدمات کیلئے محدود اختیارات دئے جاتے ہیں۔

ابو الحسن ماوردی کے علاوہ، قاضی ابو علی الحنبلی نے بھی اپنی کتاب الاحکام السلطانیہ میں عہدے داروں کی یہ تفصیل انہی الفاظ میں قلمبند کی ہے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ امیر المومنین یا خلیفہ کو منصب خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد چونکہ تنہا کام کرنا ممکن نہیں ہے، ذمہ داریاں بہت ہیں اور کام زائد ہیں اس لئے امور سلطنت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کیلئے وہ مختلف عہدیدار مقرر کر سکتے ہیں۔ ان عہدیداروں کو بنیادی طور پر چار انواع میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ عمومی خدمات کی انجام دہی کیلئے غیر محدود اور وسیع اختیارات رکھنے والے عہدیدار، اور خاص خدمات کی انجام دہی کیلئے غیر محدود اختیارات رکھنے والے عہدے دار، عمومی خدمات کیلئے، محدود اختیارات رکھنے والے عہدے دار، اور خاص خدمات کیلئے، محدود اختیارات رکھنے والے عہدیدار، اس اجمالی فہرست ہی سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ ہر قسم کی امارت، چوتھی قسم سے مشابہت رکھتی ہے

کیونکہ وہ خاص خدمت، یعنی امور تعلیم کے سلسلے میں، محدود اختیار، یعنی درگاہ کی سربراہی کیلئے امیر منتخب کئے گئے ہیں، جب کہ مجلس شوریٰ، اولوالامر کی وہ مجلس ہے جو ہندوستان میں اسلامی حکومت کے نہ ہونے کی وجہ سے قائم مقام امیر المومنین کی حیثیت سے ان امور تعلیم کی انجام دہی کی اجازت دے رہی ہے جیسا کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب کی علمی مراسلت سے واضح کیا جا چکا ہے۔ لیکن ہم اس بحث کو مزید منقطع کرنے کیلئے اور چند اقتباسات نقل کریں گے جن میں وزارت کی اقسام، ان کے حکم اور وزراء کے اختیارات اور ان کے درمیان امتیاز ظاہر کیا گیا ہے، تاکہ مدارس عربیہ کے نظام کار کے عہدے داروں کے اختیارات کو بالکل آئینہ کی طرح صاف کر دیا جائے۔ شیخ ماوردی لکھتے ہیں۔

والوزارة علی ضربین، وزارة	اور وزارت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وزارت
تفویض ووزارة تنفیذ اما	تفویض۔ اور دوسری وزارت تنفیذ
وزارة التفویض فهو ان	وزارت تفویض کے معنی یہ ہیں کہ امام ایسے
يستوزر الامام من يفوض	شخص کو وزیر بنائے جو اپنی رائے سے
اليه تدبیر الامور برایه	معاملات کی تدبیر کرے اور اپنی ہی سواہد
وامضاءها علی اجتہادہ	سے اس کو نافذ کرے اور اس طرح کی
ولیس یمتنع جوازہ	وزارت کے جواز کی ممانعت نہیں ہے
الوزارة الم	✱ ✱ ✱ ✱ ✱

والاحکام السلطانیہ ص ۷۱

✱ ✱ ✱ ✱ ✱

وزارت تفویض کے معنی یہ ہوتے کہ امام وسیع اختیارات کے ساتھ منصب وزارت سپرد کر دے کہ وزیر اپنی رائے اور صوابدید سے معاملات کا فیصلہ اور نفاذ کرے، اس وزارت کی حقیقت یہ ہے کہ امام بڑی حد تک اپنے اختیارات وزیر کی طرف منتقل کر دیتا ہے، وزارت تفویض کی تعریف کے بعد مصنف نے اُسکے جواز کیلئے شرعی دلائل قائم کئے ہیں، پھر اس منصب کیلئے منتخب کئے جانے والے انسان کے اوصاف سے بحث کی ہے، پھر یہ لکھا ہے کہ وزارت تفویض کیلئے نامزدگی کن الفاظ کے ذریعہ عمل میں آتی ہے، پھر ایک فصل میں تفصیل سے یہ بتلایا گیا ہے کہ وزیر تفویض کو امام المومنین کے ساتھ کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے پھر امامت اور وزارت کے فرق کو واضح کرنے کیلئے لکھا ہے۔

وإذا تقرر ما تنعقد به وزارة  
التفویض فالنظر فیها وان  
كان علی العموم معتبر بشرطین  
یقع الفرق بهما بین الامة  
والوزارة . احدهما یختص  
بالوزیر وهو مطالعة الامام  
لما امضاه من تدبیر وانفذه  
من ولاية وتقلید لئلا یصیر  
بالاستبداد كالامام .  
والثانی مختص بالامام وهو  
جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ وزارت تفویض  
اس طرح منعقد ہو جاتی ہے تو اگرچہ اس وزارت  
کو عمومی اختیارات حاصل ہوتے ہیں مگر اس  
میں دو شرطیں ملحوظ رہتی ہیں جن سے اہمیت  
اور وزارت کا فرق باقی رہتا ہے ان میں  
پہلی شرط وزیر کے ساتھ خاص ہے کہ  
وہ جو تدبیر اختیار کرے اور جو اختیارات  
استعمال کرے اور جو تقرر کرے وہ امام کے  
سامنے پیش کرتا رہے تاکہ وہ امام کی طرح  
خود مختار نہ ہو، اور دوسری شرط امام کے ساتھ

ان یتصفہ افعال الوزير  
وتدبیرہ الامور لیقر منها  
ما وافق الصواب ویستلک  
ما خالفہ

خاص ہے کہ وزیر کی تمام کارروائیوں اور  
اس کی تمام تدبیرات پر نظر رکھے تاکہ  
ان میں جو ٹھیک ہوں ان کو برقرار  
رکھے، اور جو نامناسب ہوں ان کی تلافی

(الاحکام السلطانیہ ص ۲۵) کر دے۔

اس عبارت میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ وزیر تفویض  
کو اگرچہ عمومی اختیارات دئے جاتے ہیں لیکن وہ ہر حال میں امیر المومنین کا  
ماتحت ہے اس لئے وزیر تفویض کے لئے ضروری ہے کہ وہ تمام معاملات  
امیر المومنین کے سامنے پیش کیا کرے۔ اور خود امیر المومنین کی ذمہ داری ہے کہ  
وہ وزیر کے تمام افعال اور اس کی تمام کارروائیوں کی نگرانی کرتا رہے،  
تاکہ امت کے تمام کام حسن تدبیر، سلیقہ اور باہمی تعاون کے ساتھ انجام  
پاتے رہیں۔

پھر اسی فصل میں امیر المومنین اور وزیر تفویض کے درمیان منسرق  
کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

وکل ما صح من الامام صح  
من الوزير الاثلاثۃ اشياء  
احدھا ولاية العهد فان  
للامام ان یعهد الی من یری  
ولیس ذلک للوزير، والثانی

وہ تمام کارروائیاں جو امام کی جانب سے  
درست قرار پاتی ہیں۔ وزیر تفویض کی جانب  
سے بھی درست قرار پائیں گی، البتہ تین چیزوں  
میں فرق ہوگا۔ پہلی بات یہ کہ اگر امام کسی  
کو مناسب سمجھے تو ولی عہد مقرر کر سکتا ہے،

للامام ان يستعفى الامة من  
الامامة وليس ذلك للوزير  
والثالث ان للامام ان يعزل  
من قلده الوزير وليس للوزير  
ان يعزل من قلده الامام  
( الاحكام السلطانية ص ۲۶ )

وزیر کو اس کی اجازت نہیں، دوسرے یہ کہ امام امت  
کے سامنے امامت سے اپنا استعفیٰ پیش کر سکتا ہے  
وزیر کو امام کی جانب سے استعفیٰ دینے کا حق نہیں۔  
تیسرے یہ کہ امام وزیر کے مقرر کردہ عہدیداروں کو  
معزول کر سکتا ہے، وزیر امام کے مقرر کردہ  
عہدیداروں کو برطرف نہیں کر سکتا۔

اس عبارت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اگرچہ وزیر تفویض کو امام کی جانب سے  
کلی اختیارات دئے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود، ولیم عہد کی نامزدگی، امامت سے  
استعفیٰ اور عہدیداروں کے تقرر کے سلسلے میں امام کو وزیر تفویض پر بالادستی حاصل  
رہتی ہے، اس بحث کے بعد وزارت تنفیذ کے بارے میں لکھا ہے۔

اما وزارة التنفيذ فحكمها  
اضعف وشروطها اقل لان  
النظر فيها مقصور على رأي الامام  
وتدبيره وهذا الوزير وسط  
بينه وبين الرعايا والولاية يورى  
عنه ما امر وينفذ عنه ما  
ذكر ويمضى ما حكم ويخبر  
بتقليد الولاية وتجهيز الجيوش  
ويعرض عليه ما ورد في مهم

زہی وزارت تنفیذ تو اس کا اقتدار کمزور اور  
اس کی شرطیں کم ہیں، اسلئے اس منصب کی  
کارگزاری امام کی رائے پر موقوف اور اس کی  
تدبیر پر منحصر رہتی ہے اور یہ وزیر امام اور رعایا اور  
وایوں کے درمیان واسطہ ہوتا ہے وہ امام کے  
اوامر و احکام اور اس کی ہدایات کو نافذ کرتا ہے  
وایوں کے تقرر سے امام کو باخبر رکھتا ہے فوجوں  
کی تیاری سے مطلع کرتا ہے اور جواہم واقعات یا نازہ  
حادثات پیش آتے رہتے ہیں وہ امام کے سامنے



وتعبد ومن حدث مسلم  
ليعمل فيه ما يورث به فهو  
معين في تنفيذ الامور  
ليس بوال عليها ولا متقلدا  
لها. فان شورك في الراي  
كان باسم الوزارة اخص  
وان لم يشارك فيه كان  
باسم الواسطة والسفارة  
اشبه - (الاحكام السلطانية ص ۲)

پیش کرتا رہتا ہے تاکہ امام کے حکم کے  
مطابق کارروائی عمل میں لائے، گویا وزیر  
تنفيذ، امور کے نافذ کرنے میں مددگار ہے  
وہ خود با اختیار نہیں ہے معاملات کا ذمہ دار  
نہیں ہے، پھر اگر وہ رائے میں بھی شریک  
کیا جاتا ہے تو اس کو وزیر کہنا مناسب ہے  
اور اگر وہ رائے میں شریک نہیں کیا جاتا  
تو اس کو واسطہ اور سفیر کے نام سے یاد  
کرنا موزوں ہوگا۔

اس عبارت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ وزیر تنفيذ کے کام کرنے کا کیا طریقہ ہے،  
پھر اس کی بھی دو صورتیں ہیں کہ اگر نفاذ احکام کے ساتھ وہ رائے اور مشورہ میں بھی  
شریک رہتا ہے تو اس کو وزیر کے نام سے موسوم کرنا قرین عقل ہے، لیکن اگر وہ  
رائے اور مشورہ میں بھی شریک نہیں کیا جاتا بلکہ صرف احکام کے نفاذ کا کام اس کے  
سپرد رہتا ہے تو اس کی وزارت برائے نام ہے، ایسے وزیر تنفيذ کو تو محض واسطہ  
ہی قرار دیا جائے گا۔ پھر صاحب کتاب نے چند سطروں کے بعد ان دونوں وزارتوں  
کے درمیان فرق کو واضح کیا ہے۔

ويكون الفرق بين هاتين  
الوزارتين بحسب الفرق  
بينهما في النظرين وذلك  
ان دونوں وزارتوں کے اختیارات میں  
اتنا ہی فرق ہے جتنا ان کے شرائط  
میں ہے۔ اور یہ چار صورتوں میں

من اربعة اوجه: احدها  
انه يجوز لوزير التفويض  
مباشرة الحكم والنظر في  
المطالب وليس ذلك لوزير  
التنفيذ. والثاني انه يجوز  
لوزير التفويض ان يستبد  
بتقليد الولاية وليس ذلك  
لوزير التنفيذ. والثالث انه  
يجوز لوزير التفويض ان ينفرد  
بتسيير الجيوش وتدبير  
الحروب وليس ذلك لوزير  
التنفيذ. والرابع انه يجوز  
لوزير التفويض ان يتصرف  
في اموال بيت المال بقبض  
ما يستحق له ويدفع ما يجب  
فيه وليس ذلك لوزير التنفيذ  
(الاحكام السلطانية ص ۲۸)

نمایاں ہوتا ہے، ایک یہ کہ وزیر تفویض  
کیلئے خود احکام کی تنفیذ اور مقدمات کے  
تصفیہ کی اجازت ہے جب کہ وزیر تنفیذ  
کیلئے ایسا کرنا جائز نہیں۔ دوسرے یہ کہ وزیر  
تفویض کو وایوں کے تقرر کرنے کی مستقل  
طور پر اجازت ہے، وزیر تنفیذ کیلئے ایسا  
کرنا جائز نہیں۔

تیسرے یہ کہ وزیر تفویض کیلئے فوجوں کو  
محاذ پر روانہ کرنے، اور جنگ کے تمام  
انتظامات خود انجام دینے کی اجازت ہے،  
وزیر تنفیذ کیلئے اس کی اجازت نہیں۔

چوتھے یہ کہ وزیر تفویض کو بیت المال  
کے خزانے پر اقتدار حاصل ہوتا ہے،  
وہ سرکاری مطالبہ وصول کرنے اور جو سرکار  
پر واجب الادا ہے اس کی ادائیگی کا حق  
رکھتا ہے، وزیر تنفیذ کو اس کا حق  
نہیں ہے۔

امیر المومنین، وزیر تفویض اور وزیر تنفیذ کے درمیان فرق مراتب کی ان تصریحات  
سے یہ بات تو بالکل واضح ہو گئی کہ تمام امرار کے اختیارات یکساں نہیں ہوتے،

پھر ان وزراء کے ماتحت جو عہدیدار ہوں گے، ان کے بارے میں حقوق یا اختیارات میں اور زیادہ تحدید کرنا ضروری ہو گا۔ کیونکہ اختیارات دائرۃ کار کے مطابق دئے جاتے ہیں۔ اس فرق مراتب سے یہ بات خود بخود ثابت ہو جاتی ہے کہ مدارس عربیہ کے نظام کار میں مہتمم کو امیر قرار دیکر، اس کو مدارس کے تمام امور میں دروبست وسیع اختیارات کا دعویٰ درست نہیں ہے۔ بلکہ یہ بات بہت ضروری ہے کہ مجلس شوریٰ اور مہتمم کے بارے میں طے کیا جائے کہ ان دونوں کی امارت، مذکورہ بالا امارت میں سے کس کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے تاکہ اس کے مطابق حکم لگایا جائے۔ یہ بات پہلے واضح کی جا چکی ہے کہ ہندوستان میں اسلامی اقتدار کے زوال کے بعد، سب سے پہلی کوشش اقتدار کی بازیابی کیلئے کی گئی اور ہندوستان کا طول و عرض ان مجاہدین کی سرگرمیوں کی جولان گاہ بن گیا۔ جن کے خون سے تحریر کی ہوئی داستانِ حریت، ذروں کے صفحات میں نقش ہے، حضرت مولانا عبید اللہ صاحب کابیان ہے کہ اکابر علماء کی زیر قیادت، دہلی کے قرب و جوار میں شتر بار معرکہ کارزار گرم ہوا جن میں شاملی کے مورچہ کی کچھ تفصیلات محفوظ ہیں۔ لیکن اسلامی اقتدار کی بازیابی سے مایوسی، بلکہ قید و بند اور مقدمات کی طرح طرح کی پریشانیوں اور ابتلاء کے بعد اکابر نے اسلامی اقدار، مسلم تہذیب و تمدن اور اسلامی علوم اور دین و مذہب کے تحفظ کیلئے مدارس عربیہ کا جال بچھا دینا ضروری سمجھا، لیکن اس کام کیلئے سب سے پہلی مشکل مالیات کی فراہمی کی تھی، اس کے لئے انھوں نے بہت غور و خوض اور مشورے کے بعد سلطان یا امیر المومنین کے قائم مقام کی حیثیت سے مجلس اولوالامر قائم کی تاکہ ارباب حل و عقد اور اولوالامر کی مجلس کی جانب سے مقرر کردہ امیر کو نام

مسلمانوں سے چند دھول کرنے اور اس کو مصارف خیر میں صرف کرنے کا شرعی جواز حاصل ہو جیسا کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس الشریعہ کے حوالوں سے یہ بات ثابت کی جا چکی ہے۔

ارباب حل و عقد پر مشتمل مجلس شوریٰ جو قائم مقام امیر المومنین کی حیثیت سے کسی دینی درس گاہ کیلئے عہدے دار مقرر کر رہی تھی، اس لئے جائز تھا کہ وسیع اختیاراً دے کر وزیر تفویض کی طرح کام لے۔ یا محدود دائرے میں اختیارات سپرد کرے اور وزیر تنفیذ کی طرح کام کا مکلف کرے، روزاؤل سے قائم شدہ تعامل اور اکابر کی تصریحات سے یہ بات صاف ہے کہ مجلس شوریٰ نے مہتمم کو دروبست اختیارات تفویض نہیں کئے ہیں، بلکہ وہ وزیر تنفیذ کی طرح مہتمم سے کام لے رہی ہے، جیسا کہ آگے یہ بحث صاف ہو جائے گی۔

مہتمم اور مجلس شوریٰ کی شرعی حیثیت کی مکمل وضاحت کیلئے الاحکام السلطانیہ ہی سے ایک اور بحث نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، سرکاری دفاتر کے بیان میں "تقرر اور عزل" کی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

واما القسم الثالث فيما اختص بالعمال من تقليد وعزل فيشتمل على ستة فصول. احدها ذكر من يصح منه تقليد العمال وهو معتبر بنفوذ الامر وجواز النظر نكل من جاز نظره في عمل نفذت تيسرى قسم میں عالموں کے عزل و نصب کے خصوصی احکام ہیں، اور یہ چھ فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل میں ان لوگوں کا بیان ہے جن کی جانب سے عمال کا تقرر درست ہے تقرر، حکم کے نفاذ اور نگرانی کے جواز پر موقوف ہے۔ اس لئے جس شخص کا کسی کام پر مقرر ہونا

فیہ اوامرہ وصح منہ تقلید  
العمال علیہ . وھذا یکون من  
احد ثلاثہ : اما من السلطان  
المستولی علی کل الامور واما من  
وزیر التفویض واما من عامل  
عام الولایۃ کعامل اقلیم او مصر  
عظیم یقلد فی خصوص الاعمال  
عاملا فاما وزیر التنفیذ فلا  
یصح منہ تقلید عامل الابد  
المطالعة والاستثمار. (ص ۲۳۷)

درست ہے تو اس کے احکام وہاں نافذ  
ہوں گے اور اس کی جانب سے عاملوں کا تقرر  
درست ہوگا۔ اور وہ ان تین کی طرف سے  
ہو سکتا ہے، یا بادشاہ کی جانب سے جسے ہر  
طرح کا اختیار ہے یا وزیر تفویض کی جانب سے  
یا کسی صوبہ یا بڑے شہر کے عام اختیار رکھنے والے عامل  
کی جانب سے جو خاص خاص کاموں کیلئے عامل مقرر  
کر سکتا ہے، رہا وزیر تنفیذ تو اس کی جانب سے کسی  
عامل کا تقرر درست نہیں، الا یہ کہ وہ بالادست  
حاکم کے سامنے پیش کرے یا اس کے اجازت سے تقرر کرے

اس عبارت میں واضح کیا گیا ہے کہ عزل و نصب کا اصول کیا ہے۔ اور  
اس کی بنیادی طور پر تشریح کی گئی ہے کہ جہاں جس کی کارروائی نافذ العمل ہے  
اور جہاں اس کے احکام واجب التعمیل ہیں اس کی جانب سے کیا جانے والا تقرر  
درست ہے۔

مدارس عربیہ کے نظام کار میں مجلس شوریٰ کی کارروائی کے نافذ العمل ہونے  
کی یہ دلیل کافی ہے کہ ہندوستان میں یہ ارباب حل و عقد کی وہ مجلس شوریٰ ہے  
جس نے قائم مقام امیر المومنین کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھالی ہے۔ مدارس  
عربیہ کا نظام کار مرتب کیا ہے، اور کچھ عامل مقرر کر کے ان کو اموال کی وصولیابی  
اور مصارف خیر میں صرف کرنے کی اجازت دی ہے۔



پھر اس عبارت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ عزل و نصب کی یہ اجازت امیر المومنین وزیر تفویض اور صوبے یا بڑے شہروں کے خصوصی اختیارات رکھنے والے علموں کو دی جائے گی، وزیر تنفیذ یا دوسرے کارکنان کو یہ حق نہیں ہے۔ مدارس عربیہ کے نظام کار میں ان تینوں میں سے کوئی ایک بھی موجود نہیں ہے۔ ہاں امیر المومنین کے قائم مقام کی حیثیت سے مجلس شوریٰ، اور مجلس شوریٰ کی جانب سے محدود اختیارات رکھنے والے امیر مہتمم موجود ہیں۔ اس لئے مدارس عربیہ میں یا تقرر شوریٰ کی جانب سے درست ہوگا، یا شوریٰ نے اگر یہ اختیار مہتمم کو دیا ہے، تو ان کی جانب سے بھی درست قرار پائے گا۔

## تمام امار پر نگرانی قائم کرنے کی صراحت

یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ وزیر تفویض سے نیچے تک تمام ہی امار کی حیثیت ماتحتوں کی نسبت سے امیر کی ہے اور بالادستوں کی نسبت سے یہ تمام عہدیدار ماتحت ہیں، ان تمام عہدیداروں کو جن حدود میں امور کی انجام دہی کا مکلف کہا جائے۔ ان کے لئے اس کی پابندی ضروری ہوگی، ان تمام ہی کارکنان اور عہدیداروں کے بارے میں آگے یہ وضاحت کی گئی ہے۔

فان قلد علیہ مشرف کان	اگر ان عہدیداروں میں سے کسی پر نگرانی مقرر
العامل مباشر العمل وکان	کر دیا جائے تو امور کی انجام دہی خود عامل
المشرف مستوفی الہ بمنع	ہی کرے گا، اور مشرف کی ذمہ داری یہ ہوگی
من زیادة علیہ او نقصان	کہ اس سے پورا کام لے۔ حدود سے تجاوز

منہ او تفرد بہ ۲۴ نہ کرنے دے، کام میں کوتاہی یا ڈکٹیٹر بننے سے روکتا رہے۔

مدارس عربیہ کے نظام کا میں نگرانی کا یہ عمل بھی دوسری اصطلاح مقرر کر کے وجود میں آیا ہے، خاص حالات میں مہتمم پر صدر مہتمم، یا سرپرست کا کام نگرانی ہی رہا ہے کہ امور مفوضہ کی انجام دہی خود مہتمم کرتے رہے۔ لیکن صدر مہتمم اور سرپرست ان کے احوال کی نگرانی فرماتے رہے، مزید وضاحت کے لئے لکھا گیا ہے۔

و حکم المشرف یخالف حکم صاحب البرید من ثلاثة اوجه احدها انه ليس للعامل ان ينفرد بالعمل دون المشرف وله ان ينفرد به دون صاحب البرید والثانی ان للمشرف منع العامل مما اسد فيه وليس ذلك لصاحب البرید والثانی ان المشرف لا يلزمه الاخبار بما فعله العامل من صحيح وفاسد اذا انتهى اليه ويلزم صاحب البرید

نگراں اور خبر رساں کے درمیان تین باتوں میں حکم کا فرق ہے، ایک یہ کہ کسی کارکن کے لئے نگرانی کے علی الرغم کارروائی کا حق حاصل نہیں جب کہ کارکن خبر رساں کے بغیر کارروائی کا مجاز ہے، دوسرے یہ کہ نگرانی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کارکن کو نادرست کاموں سے روک دے، خبر رساں کو یہ حق نہیں ہے، تیسرے یہ کہ نگرانی حکام بالا کو غلط اور صحیح دونوں طرح کے کاموں کی رپورٹ دینے کا مکلف نہیں جب کہ خبر رساں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ کارکن کے ہر صحیح اور غلط کام کی اطلاع دے، کیونکہ نگرانی کی خبر شکایت

الاخبار بما فعله العامل من محم  
کادر جبہ رکھتی ہے، اور خبر رساں  
وفا سدلان خبر المشرفا مستعدا  
کی خبر، محض اطلاع کادر جبہ  
و خبر صاحب البرید انہاء منہا  
رکھتی ہے۔

اس عبارت میں نگران اور خبر رساں کے درمیان فرق واضح کیا گیا ہے،  
اور نگرانی قائم کرنے کے بعد، تمام کارکنان کیلئے اس کے احترام اور پابندی کو  
ضروری قرار دیا گیا ہے، اس دور میں نگرانی کے قیام کی سب سے زیادہ ضرورت  
پڑ گئی ہے۔ تاکہ کارکنان خطا اجتہادی کے طور پر یا عہد اکوئی نامناسب کارروائی  
نہ کر سکیں۔

## خلاصہ بحث

اولوالامر کے معنی اور مصداق کے بارے میں پیش کی گئی معروضات اور  
امیر المؤمنین اور دیگر امار کے بارے میں پیش کردہ تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے  
۱۔ قرآن کریم کی آیت پاک اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی  
الامر منکم میں لفظ اولوالامر سے علماء و فقہار بھی مراد ہو سکتے ہیں، امیر المؤمنین  
اور ان کے ماتحت دیگر امار بھی مراد ہو سکتے ہیں، اجماع امت کی طاقت رکھنے  
والی علماء و فقہار کی جماعت بھی ہو سکتی ہے، اور امیر المؤمنین یا دوسرے امار پر  
بالادستی رکھنے والی ارباب حل و عقد پر مشتمل مجلس شوریٰ بھی مراد ہو سکتی ہے۔  
۲۔ امیر المؤمنین اپنی طویل الذیل ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے  
ماتحت امار مقرر کر سکتے ہیں، جن میں وزیر تنفیض بھی ہے۔ وزیر تنفیذ بھی  
صوبوں اور بڑے شہروں کے عمال بھی ہیں، اور ان ماتحت امار کے اختیارات

میں یکسانیت نہیں ہے بلکہ جس امیر کو جتنا اختیار دیا جائے ان کے لئے اس کی پابندی ضروری ہے۔

۳۔ ان تمام عہدیداروں میں امیر المومنین کے بعد سب اہم منصب وزیر تفویض کا ہے، لیکن وزیر تفویض کیلئے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی تمام کارروائیوں کی امیر المومنین سے توثیق کراتا ہے، اور خود امیر المومنین کی ذمہ داری ہے کہ وہ وزیر تفویض کے کاموں پر نظر رکھیں۔

۴۔ وزارت کی ایک مستقل قسم وزیر تنفیذ بھی ہے کہ امیر المومنین اپنے اختیارات منتقل نہ کریں بلکہ اپنے احکام کی تنفیذ کے لئے کوئی وزیر یا چند وزراء مقرر کریں اور سلطنت کا کام چلائیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وزیر تنفیذ کو شریک مشورہ کر لیا جائے اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ مشورہ میں بھی شریک نہ کیا جائے۔

۵۔ ماتحت امراء کے اختیارات یکساں نہیں ہوتے بلکہ ان میں تمام امراء ماتحتوں کی نسبت سے بالادست اور امیر، اور بالادستوں کی نسبت سے ماتحت اور مامور شمار کئے جاتے ہیں، اور ہر شخص کو اپنے بالادست اولوالامر کی اطاعت واجب ہے۔

۶۔ ان ماتحت امراء میں سے ہر ایک کے اوپر مشرف اور نگراں کا مقرر کرنا شرعاً درست ہے اور اگر کسی پر نگرانی قائم کر دی گئی ہو تو نگراں کیلئے عامل کے تمام کاموں کی نگرانی کرنا ضروری ہے اور عامل کو نگراں کے بغیر خود مختار ہو کر امور کی انجام دہی کی اجازت نہیں۔

ان بنیادی باتوں کے بعد اب دیکھنا یہ ہے کہ عوامی چندہ کے ذریعہ چلنے

والے مدارس عربیہ کے نظام کار میں مہتمم اور مجلس شوریٰ کی امارت کس درجہ کی ہے تاکہ یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ ان میں کس امیر کے کتنے اختیارات ہیں۔

یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ ہندوستان میں اسلامی اقتدار کے ختم ہونے کے بعد، ارباب حل و عقد کو اسلام کی بقا، اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی اقدار کے تحفظ کی فکر دامگیر ہوتی تو انھوں نے عربی مدارس کا قیام تجویز کیا۔ لیکن اس اقدام کیلئے پہلے ہی مرحلہ پر مالیات کی فراہمی کا مسئلہ سامنے آیا تو انھوں نے قرآن کریم کے حکم کے مطابق ایک مجلس اولی الامر قائم کی جو عوامی چندے کو وصول کرنے اور پھر اس کو مصارف میں صرف کرنے کی اجازت دے تاکہ مالیات فراہم کرنے والے، اگرچہ سلطان وقت کی سرپرستی سے محروم ہوں مگر سلطان کا انتخاب کرنے والے، ارباب حل و عقد اور اولو الامر پر مشتمل مجلس شوریٰ کی اجازت سے یہ کام انجام دے سکیں۔

اولو الامر کی اس مجلس شوریٰ کے سامنے متقدمین کی تحقیق کے مطابق وزیر تفویض، وزیر تنفیذ اور دیگر عہدیداروں کی نظیریں تھیں، ان عالی مقام، روشن دماغ، نبض شناس اور عبقری صفت ارباب زہد و تقویٰ نے غور و فکر کے بعد طے کیا کہ انھیں مدارس عربیہ کے محدود دائرہ کار میں وزیر تفویض کی ضرورت نہیں بلکہ وہ کسی شخص کو وزیر تنفیذ کی طرح نامزد کر کے کام چلا سکتے ہیں جو مجلس شوریٰ کے احکام کی پابندی کے ساتھ مدارس عربیہ کا نظام چلائے، جیسا کہ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب مہتمم دوم کے اصول ہشتگانہ سے واضح ہے کہ ابتداءً امور حسنیہ تک میں مجلس شوریٰ ذخیل تھی، پھر



دارالعلوم کے قیام کے پانچ سال کے بعد ۱۲۸۹ھ میں مہتمم دوم کی عرضداشت پر مہتمم کو امور جزئیہ کی انجام دہی کا اختیار دیا گیا اور جیسا کہ اس وقت کے دستور اساسی میں تصریح ہے کہ مہتمم وسیع اختیارات رکھنے والے امیر نہیں ہیں بلکہ ان کو مجلس ثوری کی جانب سے محدود اختیارات دئے گئے ہیں جن کو دفعہ وار دستور اساسی میں واضح کر دیا گیا ہے اور یہ وہ دستور اساسی ہے جس کے بارے میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ شہادت موجود ہے کہ اس کو حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی قدس سرہما کے زمانہ سے آخر ورتک کی مجلس ثوری کی بنیادی تجاویز سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے اور جس کی پابندی اوفوا بالعہد اور اوفوا بالعقود کی نصوص کی رو سے تمام کارکنان کیلئے وجوب کا درجہ رکھتی ہے۔

اس لئے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ مدارس عربیہ کے نظام کار میں مجلس ثوری، صرف مشورہ دینے والی جماعت کا نام نہیں بلکہ حقیقت یہ ارباب حل و عقد اولوالامر کی وہ جماعت ہے جو باہمی مشورہ کے بعد احکام نافذ کرتی ہے جس کی ہر تجویز اور ہر فیصلہ واجب التعمیل ہے، اور مہتمم کی حیثیت ماتحتوں کی نسبت سے امیر کی ضرور ہے، لیکن مجلس ثوری کے مقابل اس کی حیثیت اس وزیر تنفیذ سے زائد کی نہیں جس کو شریک مشورہ بھی کیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ دستور اساسی میں اس کی صراحت ہے کہ مہتمم بحیثیت عہدہ، مجلس ثوری کا ممبر ہو گا۔ اور شاید شریک مشورہ بھی حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب کی اس عرضداشت کے بعد کیا گیا ہے۔ جس میں

انھوں نے یہ کہا تھا کہ مجلس شوریٰ کے جلسوں میں مہتمم کو بھی شریک کیا جائے، اور یہی وجہ ہے کہ مجلس شوریٰ سال میں دو بار اجلاس منعقد کرنا ضروری خیال کرتی ہے تاکہ وزیر تنفیذ کو وقتاً فوقتاً ہدایات دی جاتی رہیں، بلکہ ہنگامی حالات میں یہ اجلاس کسی وقت بھی بلا یا جاتا ہے۔

ان معروضات سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ جن مقالہ نگاروں نے مہتمم کو امیر کی حیثیت دیکر، مجلس شوریٰ کو اس کے ماتحت قرار دیا ہے انھوں نے مفسرین کرام کی بیان کردہ اولوالامر کی تفسیروں پر غور نہیں کیا، اور نہ متقدمین کے یہاں اسلامی حکومت کے عہدیداروں اور ماتحت امار کے درمیان فرق مراتب کی بحث کو ملحوظ رکھا، جس کی وجہ سے وہ ایک زبردست خطا اجتہادی میں مبتلا ہو گئے کہ انھوں نے مہتمم کو امیر المومنین کی طرح عام اختیارات سپرد کرنے کا قول کیا، پھر جن مدارس عربیہ میں سابقہ مجلس شوریٰ کو توڑ کر، نئی مجلس شوریٰ کی نامزدگی، اور اس کے ساتھ اس کے ہیبتِ حاکم نہ ہونے کی تصریح کی گئی انھوں نے خطا اجتہادی سے بھی بڑی غلطی کا ارتکاب کیا کہ مفازہ نگار کے یہاں تو خطا اجتہادی قرار دیکر موقف کو ہلکا کرنے کی گنجائش بھی ہے، لیکن اس کو عملی طور پر قبول کر لینا، اور مفادات کی بنیاد پر اکابر کے پسندیدہ طرز عمل کی خلاف ورزی کرنا، ایسے اقدامات ہیں جن کی کسی بھی صورت ہمت افزائی نہیں کی جاسکتی۔

## اسلام میں شوریٰ کا مقام

مدارس عربیہ کے نظام کار میں شوریٰ کی حیثیت پر مشتمل ان معروضات کے

بعد اب اس موضوع کا تفصیلی جائزہ باقی رہ جاتا ہے کہ شوریٰ کا اسلام میں کیا مقام ہے۔ اسلام کی بنیادی چیزوں یعنی کتاب و سنت میں اس کے بارے میں کیا احکام ہیں، ان احکام کی کیا نوعیت ہے؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے باری تعالیٰ کے حکم شاورہم فی الامر کی تعمیل کس طرح فرمائی ہے اور عہد رسالت میں شوریٰ کا کیا طریقہ رہا، علماء متقدمین و متاخرین نے کتاب و سنت اور عہد رسالت کی عملی تفصیلات سے کیا مسائل مستنبط فرمائے اور اسلامی ذخیرہ علوم و فنون میں اس موضوع پر کیا لکھا گیا، خلافت راشدہ کے عہد مبارک میں شوریٰ کے حکم کی تعمیل کس طرح کی گئی، اختلاف رائے کی صورت میں فیصلے تک پہنچنے کا کیا طریقہ اختیار کیا گیا۔ اور سب سے زیادہ ضروری بات یہ کہ ان تمام تفصیلات میں ہمارے لئے کیا ہدایت ہے کہ ہم مدارس عربیہ کے نظام کار میں مجلس شوریٰ کو کیا اہمیت دیں۔

## شوریٰ کے لغوی معنی

لفظ شوریٰ، باب نصر ینصر کا مصدر ہے، اس کے لغوی معنی ہیں شہد کے چھتے سے شہد نچوڑنا، اس مادہ سے باب افعال میں اشارہ، باب استفعال میں استشارة، اور باب مفاعلة میں مشاورۃ کا استعمال ہوتا ہے، اشارہ بصلہ علی کے معنی ہیں مشورہ دینا، استشارة کے معنی ہیں مشورہ طلب کرنا اور مشاورۃ کے معنی ہیں۔ باہم بیٹھ کر مشورہ کرنا، ثلاثی سے یہ مادہ مشورہ کے معنی میں مستعمل نہیں ہے، بس اس کا مصدر شوریٰ، مشورہ کے

معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

## مشورہ کی اہمیت، عقل انسانی کی نظر میں

مشورہ کی حقیقت یہ ہے کہ مشورہ کی صلاحیت رکھنے والے ایک سے زائد افراد کسی ایسے معاملہ میں جس کے حسن و قبح کے بارے میں دُورائے ہو سکتی ہوں۔ یکجا بیٹھ کر غور و فکر کریں اور ایک دوسرے کے علم، تجربہ، عقل اور قوت استنتاج سے استفادہ کریں۔

پیغمبران عالی مقام کے علاوہ۔ جنہیں وحی خداوندی کی بنیاد پر دوسرے انسانی عقل و شعور سے استفادے کی ضرورت نہیں۔ دنیا کے کسی بھی مسافر اور کسی بھی دانشور کو مشورے کے نتیجہ خیز عمل سے بے نیاز نہیں سمجھا جاسکتا، شور کا مادہ اگر چھتہ سے شہد بخوڑنے کے معنی میں مستعمل ہے تو مشورہ بھی افکار انسانی کے جمع کردہ مفید ترین تجربات ہی کو بخوڑنے کا مفید اور شیریں عمل ہے۔

مشورہ کا عمل، غور و فکر کے سمندر میں غواصی سے کم نہیں ہے، عقل انسانی کی وسعتوں کا احاطہ دشوار ہے اسلئے جب کوئی تنقیح طلب مسئلہ ارباب شوریٰ کے سامنے پیش ہوتا ہے تو وہ خدا کی عطا کردہ علم کی گہرائی میں غواصی کرتے ہیں اور وہاں سے وہ آبدار موتی نکال کر لاتے ہیں جس سے انسانیت کا حریم زندگانی منور ہو جاتا ہے۔

مشورہ علم و فن کی فضائے بسیط میں، عقاب فکر و شعور کی اس کامیاب

پرواز کا نام ہے جس کی گرفت سے مسائل کا کوئی مرغ پرواز، آزاد نہیں رہتا، اس لئے جب اہل شوریٰ دور تر مسائل پر کمند فکر ڈالتے ہیں تو مسائل خود گرفتاری کی پیش کش کرتے ہیں۔

اسی لئے دنیا کے تمام علمی طبقے اور دانشور، انسانی زندگی کی ابتداء سے مشورے کی افادیت پر اتفاق رکھتے ہیں، علمی دنیا کے تمام قدیم و جدید فکری مجموعوں میں مشورے کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے، انسان کے پاس تقدیر میں کی علمی وراثت کے طور پر جتنا سرمایہ محفوظ ہے ان سب میں مشورہ کی افادیت و اہمیت پر اتفاق رائے پایا جاتا ہے، حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی مہتمم سادس نے اپنی کتاب "تعلیمات اسلام" میں عربی ادب کی کتابوں سے دور جاہلیت سے لیکر دور اسلام تک کے اہل عقل، اصحاب تدبیر، ارباب سلطنت اور مفکرین انسانیت کے افکار و خیالات نقل کر کے اس حقیقت کو ثابت فرمایا ہے کہ انسانیت کا کوئی طبقہ بھی مشورے کی خیر کثیر کا منکر نہیں ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر انسان، مشورہ کا اہل نہیں ہوتا، مشورہ صرف عالی دماغ، روشن ضمیر اور باکردار انسانوں کا صحیح حق ہے، مسئلہ کتنا ہی پیچیدہ اور تاریک ہو لیکن جب وہ روشن دماغ اور باکردار انسانوں کی عقل کی قندیلوں کے درمیان رکھ دیا جاتا ہے تو اس کے تمام پہلو روشنی میں آجاتے ہیں، تاریکیاں کا فورہ ہونے لگتی ہیں، گتھیاں سلجھ جاتی ہیں۔ اور بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔



اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مشورہ ہر شخص کو نہیں دیا جاتا، بلکہ دُنیا کے باشعور انسان اپنی قیمتی رائے کا اظہار صرف انہی لوگوں کے سامنے کرتے ہیں جن پر انھیں اعتماد ہو، اچھا مشورہ بازارِ علم و فن کا وہ قیمتی جوہر ہے جس کی قیمت کا اندازہ صرف جوہری ہی کر سکتا ہے۔

نیز اہل عقل کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ مشورہ ہر معاملے میں نہیں کیا جاتا، جو معاملات طے شدہ ہوں، جن باتوں کی مذہب میں وضاحت کر دی گئی ہو یا جو چیزیں عقل انسانی کی کسوٹی پر آ کر نکھر چکی ہوں، ان کے سلسلے میں مشورہ نہ صرف یہ کہ بے ضرورت بلکہ تضییعِ اوقات ہے، ہاں اگر مسئلہ میں خفا ہے تو وہاں مشورہ نہ کرنا اپنے آپ کو خیرِ کثیر سے محروم رکھنے کے مرادف ہے

## مَشَوْرَہ شَرِعیّت کی نظر میں

شرعیّتِ محمدیہ، جو نوعِ انسانی کیلئے خداوندِ عالم کا عطا کردہ آخری دین ہے اس میں بھی اس کی اہمیت پر پورا زور دیا گیا ہے، اس سلسلے میں قرآنِ کریم میں دو آیتیں ہیں، ایک آیت میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب فرما کر حکم دیا گیا ہے۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ، فَإِذَا

عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ۔

(سُورَةُ آلِ عِمْرَانَ آیت ۱۵۹)

اور آپ امور میں صحابہ سے مشورہ فرمایا

کریں اور جب مشورہ کے بعد آپ کسی

چیز کا عزم فرمائیں تو اللہ پر توکل کر کے

اقدام فرمایا، کریں

چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم خداوندی کی اس طرح تعمیل کی کہ صحابہ کرام کے بیان کے مطابق آپ سے زیادہ مشورہ کرنے والا کوئی نہیں تھا، آپ کے مشورہ فرمانے کی تفصیلات اور اس سے متعلق بحثیں آئندہ صفحہ ۱۱۰ میں پیش کی جا رہی ہیں۔ اور جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مشورہ کا حکم ہے تو امت بدرجہ اولیٰ اس کی پابند ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں دوسری جگہ مومنین کے اوصاف حمیدہ بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ  
وَاقَامُوا الصَّلَاةَ وَ  
أَمْرَهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ  
وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ۝

اور وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب کا حکم مانا  
اور جنہوں نے نماز کو قائم رکھا اور جو  
آپس کے مشورے سے کام کرتے ہیں، اور  
جو ہمارے دئے ہوئے رزق کو خرچ کرتے  
ہیں۔

(سورۃ الشوریٰ آیت ۳۸)

چنانچہ مومنین نے مشورہ طلب امور میں شوریٰ کے ذریعہ فیصلے کو جو ان کا پہلے سے معمول تھا، نہایت مضبوطی کے ساتھ معمول زندگی بنالیا۔ اس کی تفصیلاً بھی آئندہ پیش کی جا رہی ہیں۔ کیونکہ امرہم شوریٰ بینہم میں اگرچہ مقامِ مدح میں جملہ خبریہ تھا، لیکن باری تعالیٰ کا کسی وصف کو مقامِ مدح میں واجباً کے درمیان ذکر فرمانا، اس کے تاکید کی حکم کیلئے کافی ہے، امام ابو بکر جصاص المتوفی ۳۸۵ھ نے نہایت مختصر اور جامع الفاظ لکھے ہیں۔

یدل علی جلالة موقع المشورة  
لذکرہا مع الایمان واقامة  
ایمان اور اقامت صلوٰۃ کے ساتھ مشورہ کا  
ذکر کرنا مشورہ کی اہمیت اور جلالتِ شان

الصَّلَاةُ وَبَدَّلَ عَلَىٰ أَمَامُورٍ بِهَا  
(احکام القرآن ج ۳ ص ۳۸۶)  
کی دلیل ہے اور اس بات کی دلیل ہے  
کہ ہم کو مشورہ کا حکم دیا گیا ہے۔

قرآن کریم کے ان احکام کے ساتھ حدیث پاک میں مشورہ کی اہمیت پر  
پورا زور دیا گیا ہے۔ جیسا کہ آئندہ صفحات میں یہ بحث آ رہی ہے، فقہار اور  
مفسرین نے اس موضوع کا حق ادا کیا، اور اس حکم خداوندی کے ہر پہلو کی  
خوب خوب تنقیح فرمادی۔

## قرآن کریم میں شوری کا حکم تفصیلاً پر مشتمل نہیں

مگر اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ عرض کرنا ہے کہ تفصیل و اجمال کے اعتبار  
سے تمام احکام شرعیہ کا انداز یکساں نہیں ہے۔ بلکہ بہت سے مقامات پر  
شریعت جزئیات تک کی تفصیل کر دیتی ہے اور کتنے ہی مقامات پر مختلف  
حکمتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے قواعد کلیہ یا اصولی رہنمائی کی صورت میں حکم دیا  
جاتا ہے۔ عبدالوہاب خلاف اپنی مشہور کتاب اصول الفقہ میں لکھتے ہیں۔

احکام القرآن ثلاثة، اعتقادية،	احکام قرآن تین طرح کے ہیں۔ اعتقادی
خلقية، عملية والاحکام العملية	اخلاقی اور عملی، پھر عملی احکام دو نوع
تنظم نوعین، العبادات والمعاملات	پر مشتمل ہیں، عبادات اور معاملات
والمعاملات في اصطلاح العصر	اور معاملات عصر حاضر کی اصطلاح
الحديث ينقسم الى سبعة الاحوال	میں سات طرح کے ہیں۔ شخصی احوال
الشخصية، الاحکام المدنية،	دیر سنل لا، شہری احکام تعزیری

احکام، مرافعہ (عدالتی کارروائی)،  
کے احکام قانونی اور دستوری احکام دول  
اور ملکی احکام اور اقتصادی احکام

※ ※ ※ ※

الاحکام الجنائیة، احکام  
المرافعات، الاحکام الدستورية،  
الاحکام الدولية، الاحکام  
الاقتصادية - (اصول الفقه خلاصہ)

اس تفصیل کے بعد رقم طراز ہیں۔

آیات احکام کا استقرار کرنے والوں پر  
واضح ہے کہ قرآن کریم کے احکام عبادات  
کے باب میں تفصیلی ہیں، اسی طرح شخصی  
احوال اور وراثت کے احکام بھی تفصیلی  
ہیں اس لئے کہ اس نوع کے اکثر احکام  
تعبدی ہیں، عبادات اور شخصی احوال کے  
علاوہ جو شہری، تعزیری، دستوری  
اور ملکی احکام ہیں وہ عام قواعد اور  
اساسی اصول کی صورت میں ہیں اور  
ان کے بارے میں قرآن کریم نے جزوی  
تفصیلات شاذ و نادر ہی بیان کی ہیں سچے  
کہ یہ احکام معاشرے اور ماحول  
اور مصلحتوں کی تبدیلی کے ساتھ تبدیل  
ہو جاتے ہیں۔

من استقرأ آیات الاحکام  
یتبین ان احکامہ تفصیلیة  
فی العبادات وما یلحق بہا  
من الاحوال الشخصية والموارث  
لان احکام هذا النوع تعبدی  
واما فيما عدا العبادات والاحوال  
الشخصية من الاحکام المدنية  
والجنائیة والدستورية و  
الدولية فاحکامہ فیہا  
قواعد عامة ومبادئ  
اساسية ولم يتعرض فیہا  
لتفصیلات جزئية الا فی  
النادر لان هذه الاحکام  
بتطور البیئات والمصالح  
(اصول الفقه خلاصہ)

ان عبارتوں سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ تمام احکام کی نوعیت یکساں نہیں ہے، کہیں شریعت تفصیل کرتی ہے اور کہیں اجمال سے کام لیتی ہے، اور اجمال سے کام لینے کی بنیاد مجبوری یا معاذ اللہ کوتاہی نہیں بلکہ اس کی بنیاد یہ ہے کہ یہ احکام ضروریات اور معاشرے کی تبدیلی کے سبب جزوی ترسیم کے متقاضی ہیں، ان احکام میں شریعت کے بنیادی مقاصد اور اساسی حکم کو برقرار رکھتے ہوئے، تفصیلات کی تعیین میں حالات کی رعایت ملحوظ رکھی جاتی ہے۔

## اجمالی احکام کی چند نظیریں

اصولی طور پر عبدالوہاب خلاف کی عبارت میں ایسے مقامات کی وضاحت کر دی گئی ہے جہاں شریعت نے جزوی تفصیلات کے بجائے اصولی رہنمائی کو کافی سمجھا ہے کہ تمدنی، تعزیری، دستوری اور ملکی احکام میں عام طور پر جزوی تفصیلات کی تعیین نہیں کی گئی ہے۔ لیکن مناسب ہو گا کہ اس سلسلے میں چند نظیریں پیش کر دی جائیں۔ مثلاً قیام عدل ہے قرآن کریم کا حکم ہے۔ اعدواہو اقرب للتعوی، عدل اختیار کرو کہ یہ تقویٰ سے بہت قریب ہے، لیکن قیام عدل کی جزوی تفصیلات بیان نہیں کی گئی ہیں، الطرق الحکمیۃ میں علامہ ابن قیم لکھتے ہیں۔

شریعت کے حکم عدل کا مقصد اللہ کے

بندوں کے درمیان عدل قائم کرنا اور

لوگوں کا انصاف پر قائم رہنا ہے۔

ان مقصودہ اتانہ العدل

بین عبادہ و قیام الناس

بالقسط، فای طریق استخراج



بها العدل والقسط فهي من الدين ليست مخالفة له ،  
(الطرق الحكمية ص ۱۲)

پھر جس راستے سے بھی عدل و انصاف کو لایا جائے وہ دین ہی کا حصہ ہوگا۔  
دین کے خلاف نہ ہوگا۔

اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بھی اسی نوع کی مثال ہے۔ دستور القرآن میں ہے۔

ليس في القرآن تحديد لكيفية القيام بهذا الواجب وقد يتبادر من هذا ان الكيفية متروكة لحكمة المسلمين و طرح فهم۔

قرآن کریم میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی کی کیفیت کی حد بندی نہیں کی گئی، اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کیفیت کو مسلمانوں کی مصلحت اور حالات کی بنیاد پر بیان نہیں کیا گیا ہے۔

(بجوال حالات زمانہ کی رعایت ص ۶)

مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی، اصلاح و دعوت کے بارے میں لکھتے ہیں

اصلاح و دعوت کی کوئی خاص شکل یا متعین میدان یا لگابندھا کوئی ایسا نظام نہیں ہے جس کو تبدیل کرنا یا جس سے ہٹنا ناجائز ہو بلکہ یہ ان فرائض دینیہ میں سے ہے جن کا کوئی متعین نظام یا خاص شکل منصوص نہیں ہے۔ (دستور حیات ص ۲۳)

اس طرح کے احکام کی فہرست پیش کی جاسکتی ہے، خلافت و حکومت یا امامت کا قیام واجب ہے مگر اس کی کوئی معین صورت، منصوص نہیں، محکمہ قضا کا قیام ضروری ہے اور اس کی تفصیلات منصوص نہیں، طلب علم

فریضہ ہے اور اس کی خاص شکل معین نہیں، جہاد فرض ہے اور اس کا خاص طریقہ کار منصوص نہیں، کیفیت احسان کا حصول مطلوب ہے اور اس کے حصول کا کوئی خاص طریقہ منصوص نہیں وغیرہ۔

## شوریٰ کے احکام بھی تفصیلی نہیں ہیں

شوریٰ کا حکم بھی انہی احکام میں سے ہے، قرآن کریم میں دو جگہ اصولی طور پر تاکید فرمادی گئی ہے، کہ ایک جگہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ آپ بھی مشورہ فرمائیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں ذکر فرمایا گیا کہ ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں، روایات میں بھی اصولی طور پر فرمایا گیا ہے کہ خلافت مشورے کے بغیر نہیں ہے۔ فرد واحد کی رائے نافذ کرنے کے بجائے فقہاء و عابدین کے مشورے سے بات طے کی جائے وغیرہ، لیکن اس کے باوجود شوریٰ کا کوئی معین طریق کار منصوص نہیں ہے۔ بلکہ شوریٰ کے وجوبی حکم کی تعمیل میں جو صورت بھی اختیار یا جو تجویز کر لی جائے، حکم خداوندی کی تعمیل ہو جائے گی، علامہ رشید رضا مصری۔ الاعتصام کے حاشیہ پر لکھتے ہیں۔

بے شک اللہ تعالیٰ نے دین کو بحیثیت دین

اصولی اور فروعی طور پر مکمل فرمادیا ہے

چنانچہ ان (منصوص احکام میں) اجتہاد اور

قاس کے ذریعہ کوئی اضافہ یا کمی

ان الله قد اكمل الدين

من حيث هو دين اصولا

وفروعا فلا يجوز ان يزاد

فيه بالاجتهاد والقياس كما

نہیں کی جاسکتی، رہا دین کا شہری یا انتظامی  
حیثیت سے مکمل ہونا تو وہ ان اصول  
ثابتہ کی صورت میں ہے جو ان جزئیات  
کی رہنمائی کرتے ہیں جو زمانہ کی تبدیلی کے  
ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہیں جیسے شوریٰ کا  
بنیادی حکم اور ارباب حل و عقد کی اطاعت  
کا بنیادی حکم، ان احکام میں جو خلاف  
شیخ نہ ہوں یہی قول مختار ہے۔

لايجوز ان ينقص منه، واما  
الكمال من حيث هو شريعة  
مدنية سياسية فبالاصول  
الثابتة الهادية الى الفروع  
التي تختلف باختلاف الزمان  
كاصل الشورى وطاعة اهل  
الحل والعقد فيما لا يخالف  
الشرع. هذا هو المختار

(حاشیہ الاعتصام ج ۲ ص ۳۵۳)

عصر حاضر کے نامور عالم شیخ ابو زہرہ مصری بھی تصریح فرماتے ہیں کہ شوریٰ  
کا حکم اسی شان کا حامل ہے۔

بے شک قرآن کریم نے شوریٰ کے ذرائع  
وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کئے جیسا کہ  
عدالت کو وجود میں لانے کے ذرائع کی وضاحت  
نہیں کی بلکہ اس کو انسانوں کی صوابدید پر چھوڑ  
دیتا کہ وہ مقصد تک بدرجہ اتم پہنچانے والے  
اچھے سے اچھے وسائل اختیار کر سکیں اور اسلئے  
کہ شوریٰ کے وسائل، جماعتوں کے بدلنے  
سے بھی بدل جاتے ہیں، لوگوں کے احوال کے

ان القرآن لم يبين وسائل  
الشورى كما لم يبين وسائل  
تحقيق العدالة بل ترك ذلك  
لتقدير الناس لينتهجوا  
احسن الوسائل التي توصلهم  
الى المطلوب على الوجه الاكمل  
ولان وسائل الشورى تختلف  
باختلاف الجماعات وباختلاف

احوال الناس وبأخلاف العصور      اختلاف سے بھی بدل جاتے ہیں، اور زمانہ کی  
(امول الفقہ الوزرہ ۹۵)      تبدیلی سے بھی بدل جاتے ہیں۔

ان حوالوں سے یہ بات معلوم ہوتی کہ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ  
شریعت نے عبادات اور شخصی احوال کے علاوہ، بہت سی سیاسی، تمدنی، دستوری  
اور تعزیری احکام میں تفصیلات بیان نہیں کی ہیں اور شوری بھی انہی احکام  
میں سے ہے جس میں شریعت نے جزئیات کی تفصیل کا اہتمام نہیں کیا اور اس  
کی بنیاد نعوذ باللہ کوئی مجبوری یا کوتاہی نہیں بلکہ اس کی بنیاد تغیر پذیر انسانی  
معاشرے کی رعایت ہے کہ اصولی طور پر مشورہ کو ضروری قرار دیدیا گیا۔ اور  
تفصیلات کو حالات زمانہ کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے طے کرنے کی اجازت  
مرحمت فرمادی۔

لیکن یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ تفصیلات کی تعیین کا عمل بھی ایک مشوار  
عمل ہے، اور اصالتاً یہ عمل، قواعد کلیہ پر جزئیات کی تطبیق کا عمل ہے جس کے  
لئے خاص شرائط اور قوت اجتہاد کی ضرورت ہے، اسلئے ضروری ہو گا کہ  
عصر حاضر کے علماء و مفکرین، متقدمین کی متعین کردہ راہوں کے علاوہ نئی  
راہیں تلاش نہ کریں، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں —۔ لن  
یصلح اخر هذه الامة الا بما صلح به اولها کہ اس امت کا آخری طبقہ  
بھی انہی بنیادوں پر صلاح سے ہمکنار ہو سکتا ہے جن بنیادوں پر امت کے  
اولین طبقہ کو صلاح کی دولت نصیب ہوئی ہے۔

شوری، عقل و شریعت دونوں ہی کے اتفاق سے ایک قابل تعریف

وصف ہے لیکن اس دور میں ایک بالکل نیا نقطہ نظر سامنے آیا ہے کہ شوری محض مستحب ہے اور اس استحباب پر عمل کر لینے کیلئے چند اہل مشورہ سے تبادلہ خیال کافی ہے، اس کے بعد امیر المومنین سے لیکر ماتحت امارت تک سب کو یہ اختیار تمیزی حاصل ہے کہ وہ شوریٰ میں پیش کردہ مختلف زاویوں میں سے کسی ایک زاویہ کو ترجیح دیدیں۔ بلکہ خود امیر بھی چونکہ شوریٰ کا ایک فرد ہے اس لئے اگر وہ اپنی ہی رائے کو ترجیح دینا مناسب سمجھے تو یہ بھی خلاف شرع نہیں کیونکہ اس کی رائے بھی اہل شوریٰ ہی میں سے ایک کی رائے ہے۔

لیکن اس نقطہ نظر کی وکالت کرنے والے حضرات نے غور نہیں فرمایا کہ امار کو علی الاطلاق اتنی آزادی دینے کا مفہوم تو یہ ہوگا کہ شورا بیت کا وصف ممدوح استبداد بالرائے کی صورت میں تبدیل ہو جائے گا جس سے بچنے کے لئے شوریٰ کا حکم دیا گیا تھا، یعنی قرآن کریم تو مقام مدح میں یہ کہہ رہا ہے کہ ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں لیکن اس نئے نقطہ نظر کے مطابق، شوریٰ کا تو صرف قالب رہا کہ چند لوگ ایک جگہ بیٹھے ہوئے نظر آئے، روح تو استبداد بالرائے میں تبدیل ہو گئی کہ بالآخر فیصلے کی زمام فرد واحد کے ہاتھ میں آگئی۔

حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحب قدس سرہ اور حضرت مولانا محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک فتویٰ میں لکھتے ہیں۔

”عام امار کے متعلق کیسے کہا جاسکتا ہے کہ ارشاد وہی ہے جو امام یا



امیر کی رائے ہے بلکہ واقعاتِ عالم اس کے خلاف شہادت دیتے ہیں۔ مزید برآں یہ کہ امرہم شوریٰ جو بینہم کی قید بھی رکھتا ہے بچے یعنی ہوگا، قاضی بیضاوی جن کے الفاظ آیت شادہم کی تفسیر میں موہم واقع ہوئے ہیں وہ امرہم شوریٰ کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔  
 لا ینفردون برأی حتی یتشاوروا ویجتمعوا علیہ (بیضاوی ص ۲۷)  
 گویا موجب مدح یہی جسر ہے کہ انفرادی رائے پر عمل نہیں ہوتا بلکہ مشاورت کے بعد جو اجتماعی رائے ہوتی ہے اس پر عمل ہوتا ہے۔  
 (فتویٰ مطبوعہ اخبار الجمعیتہ اکتوبر ۱۹۳۵ء)

امیر قرار دیکر فرد واحد کے ہاتھ میں زمام کار دینے والے نقطہ نظر میں بھی یہی ہوا ہے کہ شوریٰ کے بارے میں قرن اول اور متقدمین کی تصریحات کی پابندی نہیں کی گئی، کیونکہ شوریٰ کے مقابلہ پر تمام امرار کی اتنی مطلق العنانی کا ثبوت خیر القرون یا متقدمین کے یہاں نہیں ملتا، اور جن جزوی واقعات سے یہ نقطہ نظر اپنی تائید کر رہا ہے ان میں سے بعض واقعات کا تو شوریٰ سے تعلق ہی نہیں ہے جیسے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ، اور بعض واقعات کا شوریٰ سے ربط ضرور ہے جیسے حبشہ اسامہؓ کی روانگی یا مانعین زکوٰۃ سے قتال کے واقعات، لیکن ان واقعات میں فیصلے کی بنیاد امیر کا اختیار نہیں، بلکہ فیصلے کی بنیاد کتاب و سنت کی طرف مراجعت ہے۔ شوریٰ سے ربط رکھنے والے واقعات پر بحث آئندہ صفحات میں اپنی جگہ آ رہی ہے۔ لیکن حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ شوریٰ کی بحث سے اصلاً مربوط ہی نہیں ہے اسلئے

اس کا تذکرہ شوری کی بحثوں کے درمیان نہیں آئے گا، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں اختصار سے یہیں عرض کر دیا جائے۔

## حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ

حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ یہ ہے کہ جب ان کو حضرت عائشہؓ نے خرید کر آزاد کیا وہ اس وقت حضرت مغیث رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں۔ اسلام کے قانون کے مطابق انھیں خیالِ عتق یعنی یہ اختیار ملا کہ غلامی کے زمانہ کے نکاح کو چاہیں تو باقی رکھیں اور چاہیں تو فسخ کر دیں، حضرت بریرہؓ نے اسلام کا عطا کردہ حق استعمال کیا اور اپنا نکاح فسخ کر لیا، حضرت مغیثؓ کو ان سے بہت تعلق تھا وہ اتنے پریشان ہوئے کہ مدینہ طیبہ کی گلیوں میں روتے پھرتے تھے۔ اسی حالت میں انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپ بریرہ سے میرے بارے میں سفارش فرمادیں، ابو داؤد میں ہے:

عن ابن عباسؓ ان مغیثا کان

عبد ا فقال یا رسول اللہ !

اشفع لی الیہا۔ قال رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم یا بریرۃ

اتقی اللہ۔ فانہ زوجک والی ولدک

فقاالت یا رسول اللہ ! انا امرنی

قال لا انا انا شافع (ابو داؤد ج ۳)

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ

حضرت مغیث غلام تھے، انھوں نے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ بریرہ

سے میری سفارش فرمادیں، تو آپ نے بریرہ سے

فرمایا کہ بریرہ! اللہ سے ڈر، وہ تیرا شوہر ہے

ہے اور تیرے بچوں کا باپ ہے، حضرت بریرہ

نے پوچھا کیا آپ مجھے حکم فرما رہے ہیں؟

آپ نے فرمایا نہیں، میں صرف سفارش کر رہی ہوں

روایت نقل کرنے کا منشا یہ ہے کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طور پر حضرت بریرہ سے بات نہیں کی، بلکہ حضرت مغیث کی درخواست پر آپ نے حضرت بریرہ کو سمجھایا، اس سمجھانے کی جو تفصیلات حدیث پاک کی عام کتابوں میں ملتی ہیں وہ یہ ہیں کہ آپ کی فہمائش یا سفارش کے بارے میں حضرت بریرہؓ نے یہ استفسار کیا انا مرنی، یعنی کیا یہ آپ کا حکم ہے؟ اگر حکم ہے تو بسر و چشم قبول کروں گی، لیکن آپ نے جواب دیا۔ لا انا انا شافع، بخاری شریف ج ۲، میں، مسند احمد ج ۱۵، ج ۱، ابن ماجہ کتاب الطلاق میں شافع کے بجائے اشفع، یعنی صیغہ اسم فاعل کے بجائے، مضارع کا صیغہ ہے۔ گویا حدیث پاک کی مشہور کتابوں میں مشورہ کا کہیں ذکر نہیں، شفاعت اور سفارش کا ذکر ہے، امام بخاری نے عنوان بھی باب شفاعۃ النبی فی زوجہ بریرہ منعقد کیا ہے، علامہ ابن حجرؒ نے انا انا اشفع پر تحریر فرمایا ہے۔

ای اقول ذلک علی سبیل  
یعنی میں یہ بات تم سے سفارش کے  
الشفاعة له (فتح الباری منہجہ ۳) طور پر کہہ رہا ہوں۔

علامہ عینی نے بھی اس روایت سے سفارش کے متعدد مسائل پر استدلال کیا ہے، مشورہ کے کسی بھی مسئلہ پر ان حضرات میں سے کسی نے استدلال نہیں فرمایا اور یہ طے شدہ بات ہے کہ شفاعت اور مشورہ میں بڑا فرق ہے شفاعت کی حقیقت معلوم ہو جائے تو فرق خود بخود واضح ہو جائے گا۔ کشاف اصطلاحات الفنون میں شفاعت کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔

الشفاعة بالفتح وتخفيف الفاء شفاعت دشین کے فتح اور فاء کی تخفیف

ہی سوال فعل الخیر وترک  
الضرر عن الغير لاجل الغير علی  
سبیل التضرع۔

کے ساتھ عاجزی کے طور پر دوسرے کی  
خاطر، دوسرے کے بارے میں، بھلائی کا  
سلوک کرنے یا نقصان سے دست بردار  
ہونے کے سوال کو کہتے ہیں۔

رکشاف اصطلاحات الفنون ۶۶۲

یعنی اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص سے کسی تیسرے شخص کے بارے میں  
نفع پہنچانے یا اس کو نقصان سے محفوظ رکھنے کا عاجزی کے طور پر سوال کرے تو  
اس کو شفاعت کہتے ہیں، علامہ زمخشری نے شفاعت کی تعریف اس طرح کی ہے۔

الشفاعة الحسنه هی التي

شفاعت حسد وہ ہے جس میں کسی مسلمان

روعی بہا حق مسلم و دفع بہا

بھائی کے حق کی رعایت ملحوظ ہو اور شفاعت

عنه شر او جلب الیہ خیر و

کے ذریعہ اس سے کسی شر کو دور کیا گیا ہو یا

ابتغی بہ وجہ اللہ ولم توخذ

اس کے لئے کسی خیر کو مائل کیا گیا ہو اور

علیہ رشوة وکانت فی امر

مقصد محض رضائے خداوندی ہو، کوئی ثروت

جائز لا فی حد من حدود

نہ لی گئی ہو، معاملہ فی نفسہ جائز ہو، حدود

اللہ ولا فی حق من الحقوق

خداوندی یا حقوق خداوندی سے اس کا

والسیئة ما کان بخلاف ذلک

تعلق نہ ہو اور شفاعت سیئہ وہ ہے جو

رالکشاف ۵۴۹ ج ۱

اس کے برخلاف ہو۔

غور کر لیا جائے کہ شفاعت کی حقیقت میں، مشورہ کا کوئی ذکر نہیں ہے

اور اگر اس طرح غور فرمایا جائے کہ شفاعت بارگاہ خداوندی میں بھی ہوتی ہے

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بارگاہ خداوندی میں شفاعت فرمائیں گے، صغیرنی میں

فوت ہونے والے بچے بارگاہ خداوندی میں شفاعت کریں گے، تو مضمون اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے کہ مشورہ کی حقیقت، شفاعت سے بالکل الگ ہے ورنہ اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ یہ شفاعت کرنے والے پروردگار کو مشورہ دے رہے ہیں بلکہ جن روایات میں انما انا شافع کا لفظ آ رہا ہے اگر ان کو اصل قرار دیا جائے تو انما چونکہ کلمہ قصر بھی ہے اور مقصور علیہ انما کے جملوں میں ہمیشہ وجوباً مؤخر ہوتا ہے۔ تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ میں یہ حکم نہیں دے رہا ہوں بلکہ اس معاملہ میں میری حیثیت صرف شفاعت کنندہ کی ہے، یعنی میں اس وقت پیغمبر کی حیثیت سے، حاکم کی حیثیت سے یا مشیر کی حیثیت سے گفتگو نہیں کر رہا ہوں۔ اس وقت میری حیثیت صرف سفارش کرنے والے کی ہے۔ اس لئے اگر انما انا شافع کو اصل تعبیر قرار دیا جائے تو اس میں خود مشورہ کی حیثیت کی نفی ہے۔

اور اگر بالفرض تسلیم ہی کر لیا جائے کہ سفارش کی بعض صورتیں، مشورے کی بعض صورتوں سے مشابہت رکھتی ہیں تو حضرت بریرہ کے واقعہ میں یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ اس کا تعلق نبی زندگی اور اخلاق کی تلقین سے ہے، یہ کوئی دستوری یا قانونی بات نہیں ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے حجتہ اللہ البالغہ میں ایک مستقل بحث کی ہے کہ شریعت میں دو طرح کے علوم بیان فرمائے گئے ہیں اور دونوں میں فرق ہے۔

اعلم ان الشارح افادنا      شارع نے ہمیں دو طرح کے علوم عطا  
نوعین من العلم متمائزین      کئے ہیں جن کے احکام الگ الگ ہیں جن



کے محل الگ الگ ہیں، ایک مصالح اور  
مفاسد کا علم ہے یعنی وہ چیزیں جن کا تعلق  
نفس کی تہذیب سے ہے کہ دنیا و آخرت  
میں نفع پہنچانے والے اخلاق اختیار کرنے  
چاہئیں اخ اور دوسرے علوم ہیں  
جن کا تعلق شرائع اور حدود سے  
ہے اخ اور اس دوسری قسم کا  
تعلق، ملی سیاست کے قوانین  
سے ہے۔

بأحكامها متباينين في منازلها  
فأحد النوعين علم المصالح و  
المفاسد أعني ما بينه من تهذيب  
النفس باكتساب الأخلاق  
النافعة في الدنيا أو في الآخرة  
والنوع الثاني علم الشرائع و  
الحدود الأخ و مرجع هذا  
النوع إلى قوانين السياسة  
المالية بحجة الله البالغة بهذا

اس لئے یہ طے کرنا ضروری ہے کہ حضرت بریرہؓ سے کی گئی سفارش کا  
تعلق، اخلاق سے ہے یا قوانین سے، خیار علق کا قانون چونکہ حضرت بریرہ  
استعمال فرما چکی ہیں، اس لئے اس سلسلے میں اب جو بات ان سے کی جا رہی  
ہے اس کا تعلق، اخلاق کی تلقین ہی سے مانا جائے گا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اول تو حضرت بریرہؓ کے واقعہ میں شوریٰ کا ذکر نہیں،  
شفاعت کا ہے۔ اس لئے اس واقعہ سے مشورہ کے کسی بھی جز پر استدلال  
درست نہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر توسع کے طور پر یہاں مشورہ مان بھی لیا جائے  
تو اس کا تعلق اخلاق سے ہے قوانین سے نہیں۔

وَالْعِلْمُ عِنْدَ اللَّهِ

## شوری پر اجمالی تبصرہ

شوری کے بارے میں کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس پر علماء امت نے روشنی نہ ڈالی ہو، کیونکہ قرآن کریم میں اس سلسلہ میں دو آیات ہیں اور احادیث پاک میں بھی اس کی بہت اہمیت بیان کی گئی ہے، ان آیات و احادیث کے ذیل میں متقدمین سے لے کر متاخرین تک، محدثین و مفسرین کرام نے منہجورے کے موضوع پر بہت قیمتی ذخیرہ قلمبند فرمایا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مجلس شوریٰ کا اصل مسئلہ امیر المؤمنین یعنی حکومت اسلامیہ کے سب سے بڑے منصب یا سلطان وقت سے متعلق ہے کیونکہ علماء تفسیر کے علاوہ تمام علماء نے شوریٰ کی بحث، خلافت کی بحث کے ساتھ کی ہے، علماء تفسیر یہ بحث دونوں آیات کے تحت کرتے ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں تو مشورہ کا حکم عام بھی دیا ہے۔ لیکن خلافت کے ساتھ اس کا رابطہ آپ کے ارشادات میں بھی ہے کہ میں اگر مشورہ کے بغیر کسی کو نامزد کرتا تو عبد اللہ بن مسعود کو خلیفہ بنا دیتا، حضرت عمر نے بھی یہی ارشاد فرمایا کہ شوریٰ کے بغیر اگر کسی کی بیعت کی جائے گی تو وہ قابل قبول نہ ہوگی۔ غرض یہ ہے کہ شوریٰ کا اصل تعلق خلافت عالیہ سے ہے اور یہ بحث وہیں کی ہے کہ شوریٰ کو خلیفہ پر بالادستی حاصل ہے یا خلیفہ کو شوریٰ پر خلیفہ کے بارے میں دونوں ہی نقطہ نظر پائے جاتے ہیں، مگر در نقطہ نظر خلیفہ کی بالادستی کا ہے۔ اور راجح نقطہ نظر مجلس شوریٰ کی بالادستی کا ہے کیونکہ خیر الثقون خلافت راشدہ اور قرن اول کے تمام علماء کا اتفاق رائے معلوم ہوتا ہے کہ

مجلس شوریٰ یا ارباب حل و عقد کی مجلس امیر المومنین پر بھی بالادست ہے۔

لیکن ماتحت امراء کے بارے میں دورانے نہیں ہیں، انھیں ہر طرح پابند کیا جاسکتا ہے، ہر ماتحت امیر اپنے بالادستوں کا مامور ہوتا ہے اور اس کے لئے اپنے بالادستوں کے سامنے جواب دہ ہونا ناگزیر ہے، کسی بھی امیر کے بارے میں نگرانی قائم کی جاسکتی ہے اور اس ماتحت امیر کے لئے ضروری ہوگا کہ مشرف یا نگران کے بغیر کوئی اقدام نہ کرے، اس لئے اگر کسی ماتحت امیر پر مجلس شوریٰ یا ارباب حل و عقد کی مجلس اولوالامر کو بالادستی دیدی جائے تو اس کے جواز میں نہ شرعاً کوئی کلام ہے اور نہ عقلاً کوئی اشکال ہے۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ امیر المومنین یا ماتحت امراء کے حق میں مشورہ کی اہمیت کیسے کم کی جاسکتی ہے جب کہ قرآن کریم میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ آپ صحابہ کرام سے مشورہ فرمایا کریں، آپ کو یہ حکم بصیغہ امر دیا جا رہا ہے، مفسرین کی ایک بڑی جماعت اس صیغہ امر کو وجوب پر محمول کر رہی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ غیر منصوص مسائل میں احکم الحاکمین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مشورہ کا پابند بنا رہا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورے کے اس حکم کی اتنی پابندی فرمائی ہے کہ روایات میں یہ تصریح موجود ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مشورہ کا پابند کوئی نہیں تھا۔ مفسرین کرام تصریح کر رہے ہیں کہ مشورہ آپ کیلئے بھی ضروری تھا۔ اور مشورے کے بعد جو عزم کا تذکرہ ہے اس میں بھی یہ وضاحت کر رہے ہیں کہ یہ عزم مشورے سے آزاد نہیں ہے۔ بلکہ یہ وہ عزم ہے جو مشورے سے پیدا

ہوا ہے۔ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نقل فرماتے ہیں کہ عزم کے معنی ہیں اہل رائے سے مشورہ لینا، اور پھر اس کا اتباع کرنا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ غیر منصوص مسائل میں مشورے کی مجلس نہیں جوڑے ہو اس کو اللہ کے اعتماد پر نافذ فرمائے اور اس سلسلے میں مشورہ یا کسی اور چیز پر اعتماد نہ فرمائے کیونکہ مشورہ تو صرف مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے طریق کار کے تعین کے لئے تھا۔ جب مشورہ کے بعد طریق کار متعین ہو گیا تو اب اس کے نفاذ میں اللہ سے مدد طلب فرمائیے۔

اور اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ آیت پاک میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے مشورہ کا حکم محض استحباب کیلئے ہو جیسا کہ بعض مفسرین کا خیال ہے اور یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عزم، فیصلے کیلئے شوری پر غالب ہے تب بھی یہ بات بالکل طے شدہ ہے کہ یہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے، آپ کی کتنی ہی خصوصیات ایسی ہیں جن میں امت بلکہ انسانیت کا کوئی فرد شریک نہیں، مشورہ حقیقت حال کی تنقیح کی کوشش تھا اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا نے وہ علوم عطا فرمائے ہیں کہ ساری دنیا کے عقلاء کے حصہ میں اس کا ذرہ بھی نہیں آیا، آپ کو وحی جیسے طاقتور ذریعہ معلومات پر دسترس حاصل ہے، عقل و دانش کے سلسلے میں آپ کو وہ تفوق عطا کیا گیا ہے جو کسی فرد بشر کا حصہ نہیں اس لئے مشورہ کے باب میں بھی آپ کے ساتھ کسی اختصاص یا امتیاز کا معاملہ کیا جائے تو اس میں کوئی استبعاد نہیں، البتہ آپ کی اس خصوصیت میں دوسرے حضرات کو شامل کرنا یا شامل سمجھنا، اور عزمت

کے صیغہ خطاب کو دیگر امرار و سلاطین کے لئے عام کرنا، عقل شریعت، اصول فقہ اور تصریحات علماء کے خلاف ہوگا۔

عہد رسالت کے فوراً بعد خلافت کا انعقاد بھی شوریٰ سے ہوا اور خلافت کے تمام امور مشورہ سے انجام پاتے رہے، ہر نئے پیش آمدہ مسئلے میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے شوریٰ کی پابندی فرمائی، اپنے آخری وقت میں انھوں نے مسلمانوں سے مشورہ کرنے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر فرمایا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلافت کے بارے میں بھی تصریح فرمادی کہ شوریٰ کے بغیر اس کا انعقاد نہیں ہوتا۔ اور تمام امور سلطنت باہمی مشورہ، اور شوریٰ کی بنیاد پر طے ہوتے رہے، پورا نظام خلافت شوریٰ کی بنیاد پر استوار فرمانے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دوسرے خلیفہ کے انتخاب کے لئے آخری وقت میں چھ سات نفری شوریٰ مقرر فرمائی جس نے حضرت عثمانؓ کا انتخاب کیا، حضرت عثمانؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ اپنے پورے عہد خلافت میں شوریٰ پر عمل فرماتے رہے۔

پھر خلافت عابیہ کا انعقاد اگر مجلس شوریٰ کی ماتحتی میں ہوتا ہے تو کیا دلیل قائم ہے کہ اس کی بقا اس پر موقوف نہ ہو، یقیناً اسکی بقا اس کی حیات اس کا فروغ اور اس کا بار آور اور امت کے لئے مفید اور مثمر خیرات ہونا بھی مشورے کی بالادستی میں مضمر ہے، یہ کوئی دانشمندی نہیں ہے کہ خلافت کی آفرینش تو مجلس شوریٰ کے بطن سے ہو لیکن وجود میں آنے کے بعد اسے شوریٰ سے بے نیاز کر دیا جائے، بلکہ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ جب حکومت کا سب سے بڑا کام اور اقتدار انسانی کا سب سے بڑا محل مجلس شوریٰ کے ہاتھوں تعمیر ہو رہا ہو تو اس کے نیچے کے



تمام مرحلے بھی شوریٰ ہی کے زیر اثر، زیر نگیں اور زیر قیادت انجام پذیر ہوں گے جیسا کہ خلافت راشدہ کے زریں عہد میں غیر منصوص جزئیات کا حکم معلوم کرنے کیلئے شوریٰ کی پابندی کی گئی۔

بلکہ یہ کہنا بجا ہو گا کہ خلافت راشدہ میں غیر منصوص مسائل کے سلسلے میں شوریٰ کے ذریعہ حکم معلوم کرنے کی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی روش سے امت کو آئندہ کام کرنیکا طریقہ معلوم ہوا۔ ائمہ مجتہدین نے انہی کے طریقے سامنے رکھ کر اجتہاد و استنباط احکام کے اصول مرتب فرمائے، کیونکہ صحابہ کرام کے سامنے اجتہادی اور اختلافی معاملات میں حکم شریعت معلوم کرنے کیلئے قرآن کریم کا بیان کردہ یہ اصول تھا۔

فان تنازعتم فی شئی فردوہ الی اللہ والرسول۔  
اگر کسی چیز کے بارے میں تمہارے درمیان اختلاف ہو جائے تو خدا اور رسول خدا

(سورۃ النساء آیت ۵۹) کی طرف رجوع کر کے حکم معلوم کرو۔

چنانچہ صحابہ کرام ہی کی مجتہدانہ بصیرت سے کتاب و سنت کی طرف مراجعت کے اصول متعین ہوئے جو قیامت تک پیش آنے والی تازہ جزئیات کا حکم معلوم کرنے کا ذریعہ بنے، کیونکہ صحابہ کرام کے دور میں ارباب شوریٰ کی پوری کوشش یہی رہتی کہ ہر معاملہ میں کتاب و سنت کا حکم معلوم کیا جائے۔

کہیں شوریٰ میں کتاب و سنت کا صریح حکم سامنے آجاتا، حکم کی صراحت نہ ملتی تو قواعد کلیہ کے تحت لا کر حکم معلوم کیا جاتا، کبھی کوئی نظیر سامنے آجاتی اور ایک نظیر کا حکم دوسری نظیر پر قیاس کر لیا جاتا، کبھی حکم منصوص کی علت کا

استخراج کر کے تعدیہ کیا جاتا اور اگر ایسا جزئیہ ہوتا جس کا تعلق انتظام وغیرہ سے ہو اور کتاب و سنت میں اس کا حکم معلوم نہ ہو سکے تو مشورہ میں جو طے ہو جاتا امیر المومنین کو اس کے نفاذ میں تاثر نہ ہوتا۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ شوریٰ منعقد ہوئی ہو اور اہل شوریٰ کی رائے کو اہمیت نہ دی گئی ہو بلکہ خلیفہ نے اپنے اختیار تمیزی سے کسی رائے کو ترجیح دیدی ہو۔

عصر حاضر میں غیر منصوص جزئیات کا حکم معلوم کرنے کے لئے، کتاب و سنت کی مراجعت کے باب میں شوریٰ کا کام بہت آسان ہو گیا ہے کیونکہ ائمہ مجتہدین نے جتنی بھی جزئیات مدون فرمائی ہیں وہ سب کتاب و سنت کی طرف مراجعت اور غیر منصوص مسائل میں حکم شرعی کو معلوم کرنے کی سعی مشکور ہی کا دوسرا نام ہیں۔

شوریٰ پر اجمالی تبصرے کے بعد اب عہد رسالت میں مشورہ، خلافت راشدہ میں شوریٰ، سلطان سے شوریٰ کی نسبت، دیگر امراء کیلئے شوریٰ کا حکم اختلاف رائے کی صورت میں فیصلے کا طریقہ اور مشورہ طلب امور کی وضاحت وغیرہ پر الگ الگ قدرے تفصیلی کلام کا آغاز کیا جاتا ہے۔ اللہم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعه والباطل باطلا وارزقنا اجتنابه

## رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے مشورہ کا حکم

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تمام تر امتیازی شان کے باوصف ان تمام معاملات میں مشورہ فرماتے رہے جن میں وحی کے ذریعہ کوئی حکم بیان نہیں

فرمایا گیا۔ اور آپ کی اس سنت سے تمام صحابہ کرام واقف تھے، آپ صحابہ کرام سے کچھ ارشاد فرماتے یا ان کو کوئی ہدایت دیتے تو وہ سب پہلے یہ استفسار فرماتے کہ آپ کا یہ ارشاد وحی کی بنیاد پر ہے کہ ایک جانب کے علاوہ دوسری جانب غور و فکر کی گنجائش نہیں یا اس سلسلے میں کوئی گنجائش ہے اگر آپ ارشاد فرمادیجئے کہ یہ ہدایت حکم خداوندی کی بنیاد پر ہے تو بطیب خاطر اس کی تعمیل کی جاتی اور اگر آپ توسع کا اظہار فرماتے تو صحابہ کرام اپنی رائے پیش کرتے اور بسا اوقات آپ صحابہ کرام ہی کی رائے کو ترجیح دیتے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طرز عمل اس بنیاد پر تھا کہ خداوند عالم نے آپ کو خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

فبما رحمة من الله لنت لهم  
ولو كنت فظا غليظا القلب  
لا نفضوا من حولك، فاعف  
عنهم واستغفر لهم وشاؤهم  
في الامر فاذا عزممت  
فتوكل على الله۔  
(سورة آل عمران آیت ۱۵۹)

سو یہ اللہ کی رحمت ہی ہے کہ آپ ان کے  
حق میں نرم خو واقع ہوئے ہیں اور اگر آپ  
تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ آپ کے پاس  
سے منتشر ہو جاتے، تو آپ ان کو بخا فرما دیں  
ان کے لئے استغفار کریں اور ان سے کام  
میں مشورہ فرمایا کریں، پھر آپ کام کا عزم کریں  
تو اللہ پر بھروسہ کریں۔

اس آیت پاک میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے  
حق میں تین باتوں کا حکم دیا گیا ہے کہ آپ ان کو معاف فرمادیں ان کے لئے  
پروردگار عالم سے مغفرت کی دعا فرمائیں اور معاملات میں ان سے مشورہ

فرمایا کریں اور مشورے کے ذریعہ جو عزم قائم ہو جائے تو اللہ پر توکل کر کے اقدام فرمائیں۔ تفسیر قرطبی میں علامہ محمد بن احمد القرطبی المتوفی ۷۱۱ھ اس آیت پاک میں دئے گئے تینوں احکام کے بارے میں لکھتے ہیں۔

قال العلماء امر الله تعالى  
نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم  
بہذہ الاوامر التي ہی بتدبیر  
بلیغ الخ (تفسیر قرطبی ص ۲۴۹)  
علماء کہتے ہیں کہ پروردگار نے حضور پاک  
صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیت میں جن اوامر  
کا حکم دیا ہے ان میں اصولی بلاغت کے  
مطابق تدریج ملحوظ ہے۔

کہ سب سے پہلے یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ آپ ان حضرات کی ان لغزشوں کو معاف  
فرمادیں جو ان سے حقوق رسالت کی ادائیگی میں ہوئی ہیں۔ اس معافی کے بعد  
صحابہ کرام کی شان میں اضافہ ہوا تو حکم دیا جا رہا ہے کہ حقوق خداوندی کی ادائیگی  
میں ہونے والی تقصیرات کے سلسلے میں استغفار فرمائیں، پھر جب یہ مقام بھی  
حاصل ہو گیا تو فرمایا جا رہا ہے کہ اب یہ معاملات میں مشورے کے اہل ہو گئے ہیں  
وشرطی لمخصاص ۲۴۹ ج ۴

قرطبی کی اس عبارت میں امر اللہ تعالیٰ نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم  
بہذہ الاوامر بتلارہا ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو فاعف واستغفر  
اور شاورہم، صیغہ امر کے ذریعہ جو خطاب کیا گیا ہے اس سے مفہم وجوب  
کی طرف جارہے ہیں۔

امام فخر الدین رازی المتوفی ۸۰۷ھ ان تینوں صیغوں کے بارے میں  
الگ الگ اس طرح رقمطراز ہیں، فاعف کے بارے میں لکھتے ہیں۔

(فاعف عنهم) ایجاب للعفو  
 علی الرسول علیہ السلام  
 تفسیر کبیر ص ۶ ج ۵  
 واستغفر پر لکھتے ہیں۔

امرہ بالاستغفار لاصحاب  
 الکبائر واذا امرہ بطلب المغفرة  
 لا يجوز ان لا یجیبہ الیہ  
 لان ذلک لا یلیق بالکریم  
 ص ۶۸ ج ۵

تیسرے صیغہ شاور ہم کے بارے میں لکھتے ہیں۔

ظاہر الامر للوجوب فقوله  
 وشاورهم، یقتضی الوجوب  
 ص ۶۹ ج ۵

تقاضا وجوب ہے اس لئے ان صیغوں کے ذریعہ جو حکم سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم  
 کو دیا جا رہا ہے اس کا تقاضا وجوب ہونا چاہئے، اور ان احکام میں ایک حکم مشورہ کا بھی ہے

**رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے مشورہ کے مقاصد**

رہا یہ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مشورہ کا حکم دیا گیا ہے اس کے اسباب



اور مقاصد کیا تھے؟ یعنی مشورہ گو کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی ضروری قرار دیا گیا۔ لیکن آیا اس کا مقصد صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی دل جوئی اور عزت افزائی تھا، یا ان کے مشورہ کو کوئی اہمیت بھی حاصل تھی اور ان کی رائے کے مطابق عمل درآمد بھی کیا جاتا تھا؟ اس سلسلے میں مفسرین کرام نے نہایت تفصیلی گفتگو کی ہے، امام ابو بکر جصاص المتوفی ۳۷۹ھ اس آیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

یہ جائز نہ ہو گا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دئے گئے مشورہ کے حکم کے بارے میں یہ سمجھا جائے کہ وہ محض دلجوئی اور صحابہ کی عزت افزائی کیلئے تھا اور یہ کہ مشورہ کا مقصد یہ تھا کہ امت ایسے معاملات میں اس سنت کی اقتدار کرے، اسلئے کہ اگر صحابہ کرام کو یہ معلوم ہو کہ وہ امور مشورہ طلب کا حکم معلوم کرنے میں جو قوت استنباط صرف کریں گے اور دریافت طلب معاملات میں جو درست رائے قائم کرنے کی کوشش کریں گے وہ نہ عمل میں لائی جائے گی اور نہ اس کو کسی درجہ میں قبول کیا جائے گا تو اس میں کسی طرح کی دل جوئی یا عزت افزائی نہیں ہے، بلکہ

و غیر جائز ان یكون الا امر  
بالمشاورة على جهة تطيب  
نفوسهم ورفع اقدارهم ولتقتدى  
الامة به في مثله لانه لو كان معلوما  
عندهم انهم اذا استفرغوا جهودهم  
في استنباط ما شوروا فيه و  
صواب الراى فيما سئلوا عنه ثم  
لم يكن ذلك معمولا عليه ولا  
ملتقى منه بالقبول لوجه لم يكن  
في ذلك تطيب نفوسهم  
ولا رفع لاقدارهم بل  
فيه ايحاء شهم واعلامهم  
بان آراءهم غير مقبولة

ولا معمول علیہا فہذا تاویل

بلکہ اس میں تو انہیں وحشت میں مبتلا

ساقط لامعنیٰ لہ

کرنا ہے اور ان کو یہ بتلانا ہے کہ ان

( احکام القرآن ص ۲ ج ۲ )

کی رائے نامقبول اور ناقابل عمل ہے اسلئے

آیت کے یہ معنیٰ قرار دینا درست نہیں۔

اس کا مفہوم یہ ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جس مشورے کا حکم دیا

گیا تھا وہ بڑائے نام نہیں تھا کہ امور مشورہ طلب میں، مشورہ دہندگان کو مشورہ

کا مکلف بھی کیا جائے اور ان کی رائے کو کوئی اہمیت حاصل نہ ہو، بلکہ امیر کو یہ

اختیار دیدیا جائے کہ وہ اقلیت، اکثریت یا اپنی رائے میں سے کسی بھی جانب کو قبول

کرنے کے مجاز ہوں، کیونکہ ایسا کرنے میں اہل مشورہ کو وحشت میں مبتلا کرنا لازم

آتا ہے۔

اس کا واضح مفہوم یہ ہوا کہ مشورہ کا مقصد یہ تھا کہ زیر غور مسئلہ کا شورائی

کے ذریعہ حل تلاش کیا جائے اور مشورہ میں جو بات منفع ہو کر سامنے آئے،

اس کو قبول کرنے میں پس و پیش نہ کیا جائے، کیونکہ اس طریق کار میں رائے

کی اہمیت باقی رہتی ہے اور اسی میں اہل شورائی کی عزت افزائی اور دل جوئی کا

مضمون پایا جاتا ہے۔

یہ بات صرف ابو بکر حباص ہی نہیں، بلکہ شمس الائمہ کے یہاں بھی موجود

ہے، اور اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ ہے۔

قال شمس الائمہ رحمہ اللہ، شمس الائمہ نے ارشاد فرمایا، کہ جو لوگ

ولا معنیٰ لقول من يقول انما یہ کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ

كَانَ يَسْتَشِيرُهُمْ فِي الْأَحْكَامِ

لَتَطْيِيبَ قُلُوبَهُمْ لِأَنَّهُ كَانَ

الْوَحْيَ ظَاهِرًا مَعْلُومًا مَا كَانَتْ

يَسْتَشِيرُهُمْ وَفِيهَا كَانَ يَسْتَشِيرُهُمْ لَا يَخْلُو

إِمَّا أَنْ كَانَ يَعْمَلُ بِرَأْيِهِمْ أَوْ لَا يَعْمَلُ. فَإِنْ

كَانَ لَا يَعْمَلُ بِرَأْيِهِمْ وَكَانَ

ذَلِكَ مَعْلُومًا لَهُمْ فَلَيْسَ فِي

هَذِهِ الْإِسْتِشَارَةِ تَطْيِيبُ

النَّفْسِ بَلْ هِيَ نَوْعٌ مِنَ

الْإِسْتِهْزَاءِ وَظَنُّ ذَلِكَ

بِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

مَحَالٌ. (كشف بزدوں ص ۲۱۱ ج ۲)

سے مشورہ ان کی دل جوئی کے لئے کیا

کرتے تھے وہ بے معنی بات ہے، اسلئے

کہ جن امور میں آپ کے پاس وحی ہوتی

تھی ان میں مشورہ نہیں فرماتے تھے اور جن معاملہ

میں مشورہ فرماتے تھے دو حال خالی نہیں، ان کی برابر

عمل فرماتے تھے، یا عمل نہیں فرماتے

تھے، اگر عمل نہیں فرماتے تھے اور یہ بات

صاحب کرامؐ کو بھی معلوم تھی تو اس طرح کے

مشورے میں دلجوئی نہیں ہے بلکہ یہ تو استہزاء

کا ایک طریقہ ہوا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کے بارے میں اس طرح کا گمان کرنا

محال ہے

شمس الائمہ رحمہ اللہ نے بات بالکل واضح فرمادی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کے بارے میں یہ تصور کرنا کہ آپ کسی معاملہ میں مشورہ فرمائیں اور اس مشورہ کو

اہمیت نہ دیں، یہ بات ناممکن ہے، بلکہ یہ تو بدترین مذاق ہوا جس کی توقع

آپ کی ذات گرامی سے نہیں ہونی چاہئے۔

پھر آگے چل کر ارشاد فرماتے ہیں۔

یہ بات واضح ہے کہ آپ کے مشورہ کا مقصد

مختلف پہلوؤں کو قریب لانا اور رائے کو

وَبَيِّنَ لَهُمْ مَا يَتَنَبَّهُونَ عَلَيْهِمْ فِي الْأَشْيَاءِ الَّتِي كَانُوا يُخْفَوْنَ عَنْهَا

لِقَرِيبِ الْوَجْهِ وَتَخْمِيرِ الرَّأْيِ

علی ما کان یقول المشورۃ تلقیح  
العقول وقال من الحرمان  
تستبیر ذاری ثم قطیعه  
( بحوالہ بالا ص ۲۱۱ )

پختہ کرنا ہوتا تھا جیسا کہ آپ فرماتے تھے  
کہ مشورہ، انسانی عقول کو بار آور کرنے  
کی کوشش کا نام ہے اور آپ فرماتے  
کہ دانشمندی یہ ہے کہ ذی رائے سے مشورہ

کرو، پھر اس کی اطاعت کرو۔

گو یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورے کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ اہل مشورہ  
کو جمع کیا مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا اور پھر خصوصی اختیارات استعمال کر کے  
جس رائے کو مناسب سمجھا اختیار کر لیا، کیونکہ ابو بکر جصاص کے نقطہ نظر سے یہ  
طریق کار، وحشت انگیز ہے اور شمس الائمہ کی تعبیر کے مطابق یہ ایک بدترین  
مذاق ہے جس کی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے امید نہیں  
کی جاسکتی۔ بلکہ مشورہ کا طریقہ یہ ہے کہ ارباب مشورہ کی رائے کو پوری اہمیت  
دی جائے اور مشورہ میں جو بات طے ہو جائے اس کے مطابق عمل درآمد کیا جائے۔

## حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورے کے مزید فائدے

مشورہ کا اصل فائدہ تو یہی تھا کہ زیر بحث مسئلہ کے تمام پہلوں کو کھرجاتے اور  
جو بات اہل مشورہ کی رائے سے طے ہو جاتی اس پر عمل درآمد کیا جاتا۔ لیکن رسول اکرم  
صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ میں اور بھی فوائد تھے، اس موضوع پر امام فخر الدین رازی  
نے مفصل کلام کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام سے مشورہ فرمانے میں صحابہ کرام کی

عزت افزائی ہوگی، درجات میں ترقی ہوگی اور اس طرح صحابہ کرام کی محبت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ جائے گی وہ آپ کی فرماں برداری میں خلاص پیشہ ہو جائیں گے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ اگرچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عقل و دانش میں تمام انسانوں سے زیادہ باکمال تھے۔ لیکن بہر حال مخلوق کے علوم محدود ہوتے ہیں اس لئے بعید نہیں ہے کہ کسی دوسرے انسان کے دل میں ایسی بات آجائے جو آپ کے دل میں نہ آئی ہو خصوصاً دنیوی معاملات میں ایسا ہو جانا ناممکن نہیں ہے خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ما تشاور قوم الا هدوا لا رشدا امرہم یعنی جو لوگ بھی مشورہ کریں گے انھیں اپنے معاملات میں رشد و صواب کی رہنمائی منجانب اللہ کی جائے گی۔

۳۔ حسن اور سفیان بن عیینہ کا ارشاد ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کا یہ حکم اس لئے دیا گیا تھا تاکہ امت اس سلسلے میں آپ کی اقتدا کرے اور یہ مشورہ آپ کی امت کا طریقہ کار بن جائے۔

۴۔ چوتھا فائدہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے احد کے معاملہ میں مشورہ فرمایا، صحابہ نے مدینہ طیبہ سے باہر نکلنے کا مشورہ دیا جبکہ خود آپ کا میلان مدینہ میں رہ کر مقابلہ کرنے کا تھا، لیکن جب آپ نے صحابہ کرام کے مشورہ کے مطابق مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کیا تو دوسری صورت حال سامنے آئی، اب اگر آپ صحابہ کرام سے مشورہ کرنا ترک فرما دیتے تو خیال ہو سکتا تھا کہ آپ کا دل صحابہ کرام کے مشورہ کے سبب پیش آمدہ صورت حال سے متاثر ہے



اس لئے احد کے واقعہ کے بعد پروردگار عالم نے حکم دیا کہ آپ ان صحابہ کرام سے مشورہ فرمایا کریں تاکہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ آپ کے دل پر اس واقعہ کا کوئی اثر باقی نہیں ہے

۵۔ پانچویں مصلحت یہ ہے کہ آپ ان سے مشورہ فرمایا کریں، اس لئے نہیں کہ آپ کو ان کی رائے کی ضرورت ہے بلکہ ضرورت یہ ہے کہ خود ان حضرات کے عقل و شعور، فہم و ادراک اور محبت و اخلاص کے پیمانے مقرر ہو جائیں اور آپ ان کے درجات کے مطابق ان کے ساتھ پیش آیا کریں

۶۔ چھٹی بات یہ کہ مشورہ کا حکم اس لئے نہیں دیا گیا کہ آپ کو اس کی ضرورت ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آپ مشورہ فرمائیں گے تو تمام حضرات مشورہ طلب معاملہ میں بہتر صورت تک پہنچنے کی کوشش کریں گے اور اس طرح بہتر طریق کار کی تلاش میں ایک ایسا روحانی توافقی حاصل ہو جائے گا جس سے مقصد تک رسائی میں سہولت ہوگی۔

۷۔ ساتویں مصلحت یہ کہ جب پروردگار عالم نے پیغمبر علیہ السلام کو ان حضرات سے مشورہ کا حکم دیا تو اس سے واضح ہوا کہ ان بزرگوں کی خدا کے یہاں بھی قدر و منزلت ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں بھی عزت کا مقام حاصل ہے اور دوسکروگوں کے نزدیک بھی قدر و قیمت ہے۔

۸۔ آٹھویں مصلحت یہ ہے کہ شاہوں کے یہاں بھی مشورہ مہمات امور میں صرف خصوصی مقربین سے کیا جاتا ہے، صحابہ کرام سے لغزش ہوئی اور انھیں اللہ نے معاف بھی فرمادیا، لیکن یہ خیال گذر سکتا تھا کہ معاف تو پروردگار نے

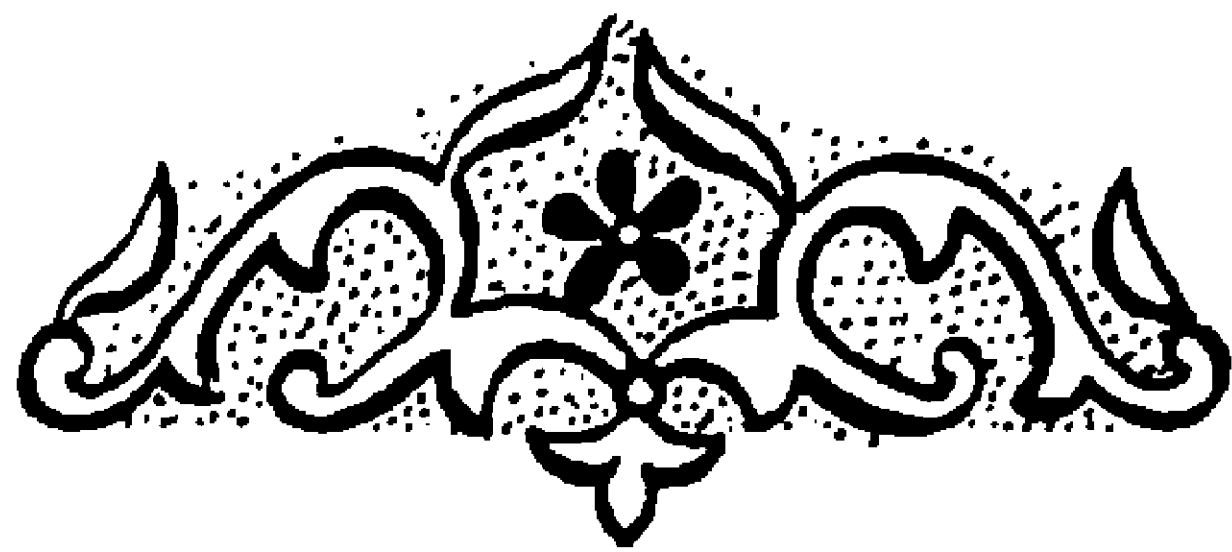
کر دیا ہے۔ لیکن اس لغزش کے سبب، اب وہ مقام حاصل نہیں ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے مشورہ کا حکم دے کر یہ واضح فرمایا کہ وہ مقام حاصل ہی نہیں بلکہ غلطی کے بعد توبہ کے سبب پروردگار نے درجات میں ترقی عطا فرمادی ہے کہ پہلے پیغمبر علیہ السلام کو مشورہ کا حکم نہیں دیا گیا تھا، اب مشورہ کا حکم دیا جا رہا ہے (خلاصہ تفسیر کبیر جلد ۵ ص ۶۷)

گویا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرام سے مشورہ کا جو حکم دیا گیا ہے اس میں بہت سی مصلحتیں ہیں اور اس کا منشا صرف صحابہ کرام کی دل جوئی و عزت افزائی ہی نہیں ہے بلکہ جس سلسلے میں وحی نازل نہ ہوئی ہو اس میں ارباب حل و عقد صحابہ کرام کی رائے سے صحیح راستے کا تعین ہے اور اسی لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کا حکم بڑی تاکید کے ساتھ دیا گیا ہے اور اسی لئے مشورہ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ ارباب حل و عقد کو جمع کر کے پیش آمدہ مسئلے میں ان کی رائے لی جائے اور اختلاف رائے کی صورت میں امیر کو اختیار دیدیا جائے کہ وہ اکثریت و اقلیت میں سے جس رائے کو مناسب سمجھے قبول کر لے یا اپنی ہی رائے پر عمل کر لے۔ بلکہ امام ابو بکر جصاص تو اس طرح کے مشورے کو وحشت کا سبب قرار دیتے ہیں۔ اور شمس الائمہ کے الفاظ میں اس طرح کا مشورہ، مشورہ ہی نہیں بلکہ استہزاء کا وہ طریقہ ہے جس کی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے توقع نہیں کی جاسکتی۔

خلاصہ یہ ہوا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شاورہم کے ذریعہ مشورہ کا جو حکم دیا گیا ہے وہ بہت تاکید کی حکم ہے، یہ مشورہ ان تمام معاملات

میں ہے جن کے بارے میں وحی نازل نہیں ہوئی، اس تاکیدِ حکم کے بارے میں علماء کرام نے وجوب تک کی اصطلاح استعمال فرمائی ہے اور مشورہ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ مشورہ دینے والوں کی رائے کو اہمیت نہ دی جائے اور آپ جس جانب کو مناسب سمجھیں اختیار فرمائیں، بلکہ مشورہ دینے والوں کی رائے کو پوری اہمیت حاصل ہے۔

ان تصریحات کے علی الرغم، اہل مشورہ کی رائے کو اہمیت نہ دینے والوں نے عجیب و غریب استدلال کیا ہے کہ شکارِ دھم کے بعد عزمت فرمایا گیا ہے، مشورہ کے بعد عزم کا حاصل یہ ہوا کہ امیر مشورہ کے بعد، عزم کی منزل میں قدم رکھتے وقت آزاد ہے کہ جس جانب کو چاہے ترجیح دیدے کیونکہ عزم کو صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عزم کے معنی پر غور کر لیا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا منقول ہے، علماء امت نے اس کے کیا معنی متعین کئے ہیں، اور مشورہ کی اہمیت سے گریز کرنے والوں کے استدلال میں کتنا وزن ہے ؟



## عزم کے معنی حدیث میں

شاورہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کا حکم دیا گیا۔ آپ نے اپنی شان کے مطابق اس حکم خداوندی کی اس طرح تعمیل فرمائی کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی کو مشورہ کا عادی نہیں پایا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی کو اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے والا نہیں دیکھا۔ راوی تمام ثقہ ہیں مگر روایت منقطع ہے۔ (جو اخاف کے یہاں حجت ہے راقم)

وفي حديث أبي هريرة: ما رأيت أحدا أكثر مشورة لأصحابه من النبي صلى الله عليه وسلم رجاله ثقات إلا إنه منقطع (فتح الباری ۲۸۳/۱۳)

یہی مضمون حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے۔

بغوی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عائشہ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ میں نے کسی بھی انسان کو دوسرے حضرات سے مشورہ کرنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ پابند نہیں پایا

روى البغوى بسنده عن عائشة قالت ما رأيت رجلا أكثر استشارة للرجال من رسول الله صلى الله عليه وسلم (تفسیر مظہری ج ۱۱)

معلوم ہوا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی بھر مشورہ کا بہت اہتمام

فرمایا جس کی حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان الفاظ میں شہادت دی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مشورہ کا پابندان کے علم میں کوئی نہیں ہے۔

اب ایک صورت تو یہ ہے کہ آپ مشورہ فرماتے رہے لیکن مشورہ دینے والوں کی رائے کو کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی، آپ جس جانب کو چاہتے اختیار فرالیتے، مگر ایسا ہرگز نہیں ہوا جیسا کہ شمس الائمہ کے حوالہ سے یہ بات گذر چکی ہے کہ اس طرح کا مشورہ، مشورہ ہی نہیں بلکہ استہزاء کا وہ طریقہ ہوگا جس کی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے توقع نہیں ہونی چاہئے۔

لیکن استہزاء کی اسی قسم کو مشورہ کہنے والوں کا استدلال یہ ہے کہ شاورہم کے بعد فاذا عزمتم فرمایا جا رہا ہے، عزموا نہیں فرمایا جا رہا ہے عزمت کی نسبت صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب یہ بتلا رہی ہے کہ عزم صرف سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا کام ہے مشورہ دینے والوں کا نہیں۔ گویا یہ عزم مشورہ کا پابند نہیں، مشورہ کے بعد آزاد ہو کر تنہا پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کام ہے، پھر اس نقطہ نظر کے دکھانے یہ کمال کیا ہے کہ عزم کے ان طبع زاد معانی کو صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ خاص نہیں کیا بلکہ اس امتیازی شان میں امیر المؤمنین ہی نہیں ماتحت امرا تک کو شامل کر دیا کہ ہر امیر کو تمام حالات میں یہ حق ہے کہ وہ مشورے کے استحباب یا سنت پر عمل کرنے کے بعد، عزم کے معاملہ میں با اختیار اور آزاد ہے۔

اب ہمیں یہ جائزہ لینا ہے کہ عزم کے معنی پیغمبر علیہ السلام سے کیا منقول



ہیں، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل کیا رہا ہے، علماء تفسیر نے کیا فرمایا ہے؟ اور اگر پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو کیا دیگر امرا کے بارے میں عزم کے یہ معنی مراد لینے کی گنجائش ہے۔

علماء تفسیر کے نزدیک یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے اور ہونی بھی چاہئے کہ قرآن کریم کی سب سے زیادہ قابل اعتماد تفسیر وہ ہے جو خود قرآن کریم سے کی جائے یا خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو، عزم کے یہ مذکورہ بالا معنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ صرف یہ کہ منقول نہیں بلکہ اس کے بالکل برخلاف ایک دوسرے معنی منقول ہیں۔

عن علی قال سئل رسول  
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن العزم  
فقال مشاورۃ اهل الرائی ثم  
اتباعہم۔

حضرت علی رضی عنہ سے روایت ہے کہ رسول  
اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عزم کے بارے  
میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا عزم  
کے معنی ہیں اہل رائے سے مشورہ کرنا۔

(ابن کثیر مج ۲۲)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عزم کے معنی کی وضاحت میں اپنے یا کسی امیر  
کے بارے میں یہ ارشاد نہیں فرما رہے ہیں کہ مشورہ دینے والوں کو یہ معلوم ہو جانا  
چاہئے کہ وہ مشورہ دینے کے بعد معاملہ کو امیر کی رائے پر محمول کر دیں وہ جس جانب  
کو مناسب تصور فرمائیں گے اختیار کر لیں گے، بلکہ آپ اس کے بالکل برخلاف یہ  
فرما رہے ہیں کہ مشورہ دینے والوں کی رائے کو پوری اہمیت حاصل ہے، آیت  
پاک میں مذکور عزم تنہا امیر کا نہیں ہے، یہ عزم ارباب شوریٰ کے مشورہ کا پابند ہے

کیونکہ عزم کے معنی ہیں اہل رائے سے مشورہ لینا پھر اس کا اتباع کرنا، خود گویا آپ اپنے بارے میں فرما رہے ہیں کہ جس معاملہ میں مشورہ کیا جائیگا اس میں اہل مشورہ کی رائے قبول کی جائے گی، خصوصی اور انفرادی رائے کے مطابق عزم و نفاذ کی آپ نے کہیں بھی اجازت نہیں دی، اور یہ مضمون تو آپ سے ثابت ہی نہیں ہے کہ مشورہ کرنے کے بعد سلطان یا دیگر امراء کو اختیار تمیزی بلکہ اختیار تام حاصل ہے کہ وہ خواہ اکثریت کی رائے قبول کر لیں خواہ اقلیت کی بلکہ اقلیت و اکثریت کی رائے سے بے نیاز ہو کر وہ اپنی رائے بھی نافذ کر سکتے ہیں۔ امور مشورہ طلب میں انفرادی رائے نافذ نہ کرنے کے سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مذکورہ بالا ارشاد نص کا درجہ رکھتا ہے، لیکن اس کے علاوہ بھی آپ کے ارشاد اس سلسلے میں موجود ہیں، مجمع الزوائد باب الاجماع میں ہے۔

ابن عباس سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر کوئی ایسا معاملہ ہمارے سامنے آئے جس میں قرآن کا حکم نازل نہ ہوا ہو اور نہ اس میں آپ کی سنت موجود ہو، آپ نے فرمایا کہ ایسے معاملہ میں اہل ایمان میں سے عبادت گزاروں کی شوری سے معاملہ طے کراؤ اور خصوصی و انفرادی رائے سے فیصلہ مت کرو۔ (طبرانی بکراہ اس

وعن ابن عباس قال قلت يا رسول الله ان عرض لنا امر لم ينزل فيه قرآن ولم يمتض فيه سنة منك قال تجعلونه شورى بين العابدين من المؤمنين ولا تقضونه برأى خاصة (سرواہ الطبرانی فی الکبیر وفيہ عبد اللہ بن کيسان قال البخاری منکر الحدیث)

روایت میں عبداللہ بن کیسان ہیں جنکے  
باریکھیل ماہ بخاری نے منکر الحدیث ہونیکا قول کیلئے

حضرت عبداللہ بن عباس کی اس روایت میں تو عبداللہ بن کیسان تھے  
جن کا اعتماد مجروح ہے، لیکن اسی طرح کی روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے  
بھی منقول ہے۔

حضرت علی سے روایت ہے کہ میں نے  
عرض کیا یا رسول اللہ! اگر ہمارے  
سامنے ایسا معاملہ آئے جس میں امر  
اور نہی کی وضاحت نہ ہو تو آپ ہمیں  
کیا حکم دیتے ہیں؟ ارشاد فرمایا کہ اس  
معاملے میں اہل فقہ اور عبادت گذاروں  
سے مشورہ کرو اور اس میں خصوصی انفرادی  
رائے نافذ نہ کرو (طبرانی فی الاوسط،  
تمام راوی ثقہ اور صحیح کے درجہ کے ہیں)

وعن علی قال قلت یا  
رسول اللہ! ان نزل بنا امر  
لیس فیہ بیان امور ولا نہی  
فما تأمر فی، قال شاوروا  
فیہ الفقہاء والعابدین  
ولا تمضوا فیہ رای خاصۃ  
رواہ الطبرانی فی الاوسط  
درجالہ موثقون من  
اہل الصحیح۔

ان روایات سے یہ بات بالکل منقطع ہو جاتی ہے کہ مشورہ طلب غیر منصوص  
مسائل میں اکثریت کے مقابل ایک دو آدمی کی رائے کے مطابق فیصلہ نہیں کیا  
جاسکتا، اہل مشورہ کا اگر کسی معاملہ میں اتفاق رائے ہو جائے تو اس اتفاق رائے  
کا نفاذ اور اس کے مطابق عزم کرنا ضروری ہے، اور اگر اختلاف رائے کی نوبت  
آئے تو جس جانب فقہار و عابدین کی عام رائے یعنی اکثریت ہو اس کے مطابق

عزم کرنا ضروری ہے۔

## عزم کے بارے میں علماء تفسیر کے ارشادات

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول عزم کی تفسیر اور مندرجہ بالا روایات کے بعد اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قابل اعتماد مفسرین کے ارشادات پر بھی نظر کر لی جائے کہ وہ اس سلسلے میں کیا فرماتے ہیں اس سلسلے میں چند مفسرین کے اقوال نقل کئے جاتے ہیں۔

(۱) — امام ابو بکر جصاص المتوفی ۳۳۹ھ لکھتے ہیں۔

وفي ذكر العزيمة عقيب المشورة دلالة  
على انها صدرت عن المشورة۔

(احكام القرآن مج ۲)

امام ابو بکر جصاص کی عبارت کا صریح مفہوم یہ ہے کہ عزم، مشورے کا پابند ہے، مشورہ کرنے والے کو یہ آزادی نہیں ہے کہ وہ اکثریت، اقلیت یا اپنی رائے میں سے کسی بھی چیز کو قبول کرے کیونکہ وہ صدرت عن المشورة کے الفاظ لکھ رہے ہیں جب کہ لغت کی کتابوں میں صدر الشی عن غیرہ ای نشأ ترجمہ بتلایا گیا ہے، یعنی صدر الشی عن غیرہ کے معنی میں کہ یہ چیز دوسری چیز سے پیدا ہوئی ہے اس کا مفہوم یہی ہوا کہ عزم اگر مشورہ کے بطن سے پیدا ہوا ہے تو اسے مشورہ کا تابع اور مشورہ کا پابند ہونا چاہئے۔

اور اگر لغت صدر کے معنی اصلی پر غور کر لیا جائے تو مضمون اور زیادہ صاف

ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ جس طرح صدر الشی عن غیرہ کے معنی نشا کے ہیں وہیں صدر کا ایک اور استعمال ہے، یہ ہے صدرت الماشیة عن الماء جانوروں کا پانی پی کر گھاٹ سے لوٹنا، اس لغوی معنی کے اعتبار سے صدرت العزیمۃ عن المشورۃ کے معنی یہ ہوں گے کہ عزیمت کو پیاسے جانور سے تشبیہ دی گئی ہے، پھر مشبہ بہ یعنی جانور کو حذف کر کے اس کا لازم یعنی صدرت استعارہ مکنیہ کے طور پر عزیمت کے لئے ثابت کیا گیا ہے، گویا عزیمت وہ پیاس رکھنے والی ذات ہے جو مشورہ کے گھاٹ سے پانی پی کر لوٹ رہی ہے اور اس کو مشورہ سے الگ رکھنا اس کو پیاسا چھوڑ دینا ہے۔

امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں۔

امعنی انه اذا حصل الراى للتاكيد  
بالمشورة فلا يجب ان يقع الاعتماد  
عليه بل يجب ان يكون الاعتماد على  
اعانة الله وتسليله وعصمته  
(تفسیر کبیر ص ۳۳۰)

عزم کے معنی یہ ہیں کہ جب وہ رائے  
حاصل ہو جائے جو مشورہ کے ذریعہ نجات  
ہوئی ہے تو اب اعتماد اس رائے پر نہیں  
بلکہ اعتماد اللہ کی مدد، اللہ کی ہدایت  
اور اللہ کی عصمت پر ہونا چاہئے۔

امام رازی نے بھی یہ فرمایا کہ یہ عزم آزاد نہیں ہے، عزم کے معنی ہی اس  
رائے کے ہیں جو شوریٰ میں ملے ہوئے ہے اور جب یہ رائے قائم ہو جائے تو اب  
رائے پر اعتماد کر کے نہیں بلکہ خدا پر توکل کر کے اقدام کرنا چاہئے، امام رازی نے اس  
عبارت میں عزم کے معنی بھی بیان فرمائے، اور یہ بھی واضح فرمایا کہ فاذا عزمتم  
کا مقصد اصلی، عزم کو آزاد قرار دینا، یا عزم کے بارے میں کسی طرح کی رہنمائی نہیں

ہے۔ بلکہ اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ رائے کتنی بھی منع ہو لیکن ہر حال میں توکل اور اعتماد صرف باری تعالیٰ کی ذات پر ہونا چاہئے، مشورہ سے آزاد ہو کر کسی ایک جانب کو ترجیح دینے کا مضمون بالکل زائد بات ہے۔

(۳) — قاضی بیضاوی اس آیت کے تحت لکھتے ہیں۔

فاذا عزمْتَ اِی فاذا و طنت نفسك  
على شئ بعد الشورى۔  
(تفسیر بیضاوی ج ۳)

عزمت کے معنی ہیں کہ جب آپ مشورہ کے بعد اپنی طبیعت کو کسی موقف پر مضبوط و مطمئن کریں۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشورہ کے بعد کسی موقف پر اپنے آپ کو مضبوط کرنے کے عمل میں قاضی بیضاوی کا رجحان یہ ہے کہ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کام ہے اور ایسا ہوتا ہے اس میں مضائقہ نہیں کیونکہ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہوگی، لیکن بیضاوی کی اس عبارت کی تشریح میں ان کے شارح شیخ زادہ نے یہ لکھا ہے۔

فاذا عزمْتَ اِی اذا اردت  
امضاءنا اشارة به  
عليك وقد و طنت  
نفسك عليه۔

اذا عزمْتَ کے معنی یہ ہیں کہ جب آپ اس چیز کے نفاذ کا ارادہ کریں جس کا لوگوں نے آپ کو مشورہ دیا ہے اور آپ نے اپنی طبیعت کو اس کے مطابق مطمئن فرالیا ہے۔

(شیخ زادہ ۱۶۲)  
المرآۃ

معلوم ہوا کہ عزم، مشورہ سے الگ نہیں ہے، بلکہ مشورہ میں طے شدہ بات کی تنفیذ کا پختہ ارادہ عزم ہے۔



شیخ زادہ کی اس تشریح کے علاوہ خود بیضاوی۔ امرہو شوری بدینہم کے تحت لکھتے ہیں۔

امرہو شوری بدینہم  
ذو شوری لاینضر دون برای  
حتی یتشاوروا ویجتمعوا علیہ  
(بیضاوی ص ۲۶۶)

امرہم شوری کے معنی، امرہم ذو شوری ہیں، یعنی دورائے میں انفرادی حیثیت اختیار نہیں کرتے حتیٰ کہ مشورہ کرتے ہیں اور اتفاق رائے سے طے پاتے ہیں

شیخ زادہ کی تشریح، اور خود امرہم شوری کے تحت بیضاوی کی تفسیر سے واضح ہوا کہ "عزم" کے تحت دی گئی عبارت میں جوابہام تھا اس کا تعلق اس شخص سے نہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عزم کے بارے میں مشورے سے آزاد اور بے نیاز رہے بلکہ اس کا مفہوم قاضی کی دوسری تشریح اور شیخ زادہ کی عبارت سے روشن ہوا کہ مشورہ میں جو بات طے ہو جائے اسی کی تنفیذ کا پختہ ارادہ عزم کہلاتا ہے

(۴) — ابو حیان اندلسی المتوفی ۵۴۰ھ اپنی مشہور تفسیر البحر المحیط میں لکھتے ہیں۔

ای فاذا عقدت قلبک  
علی امر بعد الاستشارة  
فاجعل تفویضک الی اللہ  
فانہ العالم بالاصحہ  
والارشاد لا یمکن لا یعلمہ

یعنی جب آپ مشورہ کے بعد کسی چیز پر اپنے دل کو مضبوط کر لیں تو اس سلسلے میں اپنے آپ کو خدا کے سپرد فرمادیں کیونکہ خدا ہی آپ کے معاملہ میں بہتر اور خوب تر چیز کا جاننے والا ہے مشورہ

من اشار عینک وفي هذه  
الآية دليل على المشاورة  
وتخيم الرأي وتنقيحه  
والفكر فيه وان ذلك  
مطلوب شرعا خلافا لما  
كان عليه بعض العرب  
من ترك المشورة ومن  
الاستبداد بالرأي من غير فكر  
في عاقبة (البحر المحیط ص ۹۹)

دینے والا اس کو نہیں جانتا، یہ آیت  
مشورہ کی اہمیت کی دلیل ہے، اور  
مشورہ کے ذریعہ رائے کو پختہ کرنے  
منفع کرنے اور غور و فکر کرنے کی دین  
ہے اور اس سے یہ بات ثابت ہے کہ  
مشورہ شرعاً مطلوب ہے بخلاف ان بعض  
اہل عیس کے جو باہمی مشورہ نہیں  
کرتے تھے اور اپنی انفرادی رائے پر  
انجام سے بے پروا ہو کر عمل کرتے تھے۔

ابو حیان نے یہ فرمایا کہ باہم مشورہ نہ کرنا، یا مشورے کے باوجود اپنی رائے  
کے نفاذ پر اصرار کرنا ان بعض اہل عیس کا طریقہ ہے جن کے خلاف قرآن کریم  
میں یہ ہدایت کی جا رہی ہے کہ مشورہ ضرور کیا جائے کہ اس سے رائے پختہ اور منفع  
ہو جاتی ہے اور جو چیز شرعاً مطلوب ہے اس کی تعمیل ہو جاتی ہے۔

ابو حیان کی عبارت سے مشورے کی تاکید مشورہ نہ کرنے یا محض اپنی  
رائے پر اصرار کرنے کی مذمت اور ان کی عبارت کے ابتدائی جملے اذا عقدت  
قلبك على امر بعد الاستشارة اور دیگر مضامین سے عزم کے مشورے کے تابع  
ہونے کا مضمون ظاہر ہوتا ہے۔

(۵) — ابن کثیر جنہوں نے عزم کے معنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

سے بروایت حضرت علی رضی اللہ عنہ مشاورۃ اہل الرائۃ ثواباً علیہ بیان کئے ہیں

کہ پہلے یعنی اولین مرحلے میں اہل الرائے سے مشورہ لینا، پھر ان کی رائے کے مطابق چلنا عزم ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

ای اذا شاورتہو فی الامر وعزمت علیہ فتوکل علی اللہ فیہ (ابن کثیر ۲/۲۲۲)

یعنی جب آپ کسی معاملہ میں مشورہ فرمائیں اور اس پر عزم کر لیں تو اللہ پر توکل کر کے اقدام فرمائیں۔

اس عبارت میں عزمت علیہ میں علیہ کی ضمیر الامر کی طرف لوٹ رہی ہے اور یہ امر وہ ہے جو مشور کے ذریعہ طے کیا گیا ہے، اس لئے اس عبارت کا مفہوم بھی یہی ہوگا کہ یہ عزم مشورے سے الگ اور آزاد نہیں ہے بلکہ عزم کو مشورہ کا ماتحت اور پابند ہونا چاہئے۔

(۶) — روح المعانی میں ہے۔

ای اذا عقدت قلبک علی الفعل وامضائہ بعد المشاورۃ کما توذن بہ الفاء۔ (روح المعانی مینا)

یعنی جب آپ مشورہ کے بعد کسی کام اور اس کی تنفیذ کیلئے دل کو مضبوط فرمائیں جیسا کہ شاور ہم اور عزمت کے درمیان کلمہ فا کا لانا اس مضمون پر دلالت کرتا ہے

اس عبارت کا مدعا یہ ہے کہ شاور ہوا اور فاذا عزمت کے درمیان کلمہ فا کو لایا گیا ہے، اور فا تعقیب مع الوصل یعنی ایک کام کے دوسرے کام کے فوراً بعد آنے پر دلالت کرتی ہے، اس لئے معلوم ہوا کہ عزم کی منزل مشورے سے دور نہیں بلکہ جس مجلس میں مشورہ ہو رہا ہے وہیں متصلاً عزم بھی ہو جانا چاہئے، اس مضمون کا خلاصہ بھی یہی ہوا کہ عزم مشورے سے آزاد نہیں بلکہ مشورہ کا تابع ہے۔

(۷) — علامہ طنطاوی جوہری اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

استشار صلی اللہ علیہ وسلم اصحابہ  
یخرجون من المدینة فیلافون  
العدو امینظرونہ وکان  
تاویل الرویا ادعی للبقا  
بالمدينة فلما رای اکثر اصحابہ  
امیل الی الخروج من المدینة  
اطاع الاغلبیة وحکم  
بامرهم فی القضية فلما ان  
لبس کاهنہ وعزم الامر ارادوا  
عنه عدولا۔ فقال لهم لا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام  
سے مشورہ کیا کہ مدینہ سے باہر نکل کر دشمن  
کا مقابلہ کریں، یا مدینہ میں مقیم رہ کر دشمن  
کا انتظار کریں، خواب کی تعبیر مدینہ میں  
قیام کرنے کا رجحان پیدا کرتی تھی، لیکن  
آپ نے اکثر صحابہ کی رائے مدینہ سے باہر  
نکلنے کی دیکھی تو اکثریت کی بات مان لی  
اور معاملہ میں فیصلہ فرمایا، پھر جب آپ  
نے اپنی زرہ پہن لی اور عزم فرمایا تو  
صحابہ نے اپنی رائے سے ہٹنا چاہا مگر آپ

(تفسیر الجواہر للطنطاوی) نے ان سے انکار فرمادیا۔

علامہ طنطاوی رحمہ اللہ نے اس عبارت میں مشورہ، فیصلہ اور عزم کی رسول  
کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ میں عملی تفسیر پیش کی ہے کہ غزوہ احد کے موقع  
پر مشورہ طلب معاملہ یہ تھا کہ مدینہ میں رہ کر دشمن کا انتظار کیا جائے یا مدینہ سے باہر  
نکل کر مقابلہ کیا جائے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے خواب کی تعبیر کی وجہ سے  
مدینہ میں رہ کر مقابلہ کرنے کی تھی، لیکن جب آپ نے اکثریت کی رائے مدینہ سے باہر  
نکلنے کی دیکھی، تو اکثریت کی رائے کے مطابق فیصلہ فرمایا، اس فیصلہ کے مطابق زرہ  
پہن کر جب عزم فرمایا تو صحابہ نے اپنی رائے واپس لینا چاہی، مگر عزم کے بعد آپ نے

درخواست قبول نہیں فرمائی۔

معلوم ہوا کہ عزم مشورہ سے آزاد نہیں ہے، مشورہ کے تابع ہے، کیونکہ مشورہ میں اکثریت کی رائے معلوم کر کے جو فیصلہ کیا گیا اسی کے نفاذ کو عزم فرمایا گیا ہے اور آپ کی زندگی کی عملی تفسیر میں عزم جب مشورہ اور اکثریت کا پابند ہے تو دوسرے حضرات کے یہاں بدرجہ اولیٰ عزم کو مشورہ کا پابند رہنا چاہئے۔

(۸) — ان کا حوالوں سے عزم کے جو معنی ثابت ہوئے اسی کو عمدۃ المفسرین حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ نے ان الفاظ میں لکھا ہے۔

”مشاورت کے بعد جب ایک بات طے ہو جائے اور پختہ ارادہ کر لیا جائے تو پھر خدا پر توکل کر کے اس کو بلا پس و پیش کر گزرے۔“

(فوائد عثمانی بر ترجمہ شیخ الہند ۹۲)

(۹) — ان تفاسیر کے علاوہ اس موضوع پر محدثین کرام جب گفتگو فرماتے ہیں تو وہ بھی عزم کو شوریٰ کا پابند کہتے ہیں، تفصیل میں نہ جاتے ہوئے یہاں صرف علامہ ابن حجر رحمہ اللہ کی ایک عبارت پیش کی جا رہی ہے، لکھتے ہیں۔

یرید انہ صلی اللہ علیہ وسلم	مراد یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
بعد المشورة اذا عزم علی	مشورے کے بعد جب کسی ایسے کام کے
فعل امر مما وقعت علیہ	کرنے کا عزم فرمائیں جو مشورہ میں طے ہوا
المشورة وشرع فیہ لو یکن	تھا اور اس کو شروع فرمادیں تو اب کسی
لاحد بعد ذلك ان	کے لئے اس کے خلاف مشورہ دینے کی
بشیر علیہ بخلافہ لو رود	اجازت نہیں ہے کیونکہ سورہ حجرات کی

النہی عن التقدم بین یدی  
 اللہ ورسولہ فی آیۃ الحجرات  
 (فتحا الباری ص ۲۸۴)  
 آیت لا تقدّموا الایہ میں اللہ اور اس کے  
 رسول کے سامنے پیش قدمی سے  
 ممانعت آچکی ہے۔

علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے بالکل وضاحت سے رقم فرمادیا ہے کہ عزم  
 مشورہ سے آزاد نہیں ہے، عزم اسی چیز کا ہونا چاہئے جو مشورہ میں طے ہوئی ہو۔  
 کیونکہ وہ عزم علی فعل امر مما وقعت علیہ المشورۃ (یعنی جب آپ وہ کام  
 کرنے کا ارادہ فرمائیں جو مشورہ میں طے ہوا ہے) فرما رہے ہیں، پھر یہ بھی خاص طور  
 پر ملحوظ رہے کہ علامہ ابن حجر اس عزم کو بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے بیان  
 فرما رہے ہیں کیونکہ وہ اس کے ساتھ یہ بھی لکھ رہے ہیں کہ اس طرح کے عزم کے  
 بعد اس کے خلاف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کچھ عرض کرنا جائز نہیں  
 کیونکہ سورۃ حجرات کی آیت میں اللہ اور رسول کے روبرو پیش قدمی سے منع کر دیا  
 گیا ہے، اور مشورہ میں طے شدہ کام کے عزم کے بعد عرض معروض پیش قدمی شمار ہوگا۔  
 ان معروضات کا خلاصہ یہ ہوا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پروردگار  
 عالم کی جانب سے حکم دیا گیا کہ آپ صحابہ کرام سے مشورہ فرمایا کریں، حضور پاک صلی  
 اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کی اس قدر تعمیل فرمائی کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت ابوہریرہؓ  
 کے بیان کے مطابق آپ سے زیادہ مشورہ کرنے والا کوئی دوسرا ان کے علم میں نہیں  
 ہے، متعدد مفسرین کرام نے لفظ شاور کے صیغہ امر کو وجوب پر محمول فرمایا  
 ہے، صحابہ نے آپ سے ان معاملات کے بارے میں سوال کیا جن میں قرآن و سنت  
 کا حکم معلوم نہ ہو تو آپ نے ایسے معاملات میں مشورہ کا حکم دیا اور یہ وصفاً فرمادی



کہ انفرادی رائے کے مطابق فیصلہ نہ کرنا، آیت قرآنی میں جو فاذا عزمتم کا لفظ آیا اس کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بتلایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا کہ عزم کے کیا معنی ہیں تو آپ نے فرمایا کہ اہل رائے سے مشورہ کرنا اور ان کی رائے کے مطابق عمل کرنا عزم کہلاتا ہے، عام مفسرین نے شاور ہمو کے بعد عزم کے ذکر سے یہ سمجھا کہ عزم آزاد نہیں بلکہ مشورہ کا پابند ہے۔ لیکن ان تمام تصریحات کے علی الرغم صرف حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نہیں بلکہ دنیا کے ہر بالادست اور ماتحت امیر کے لئے یہ کہنا کہ وہ مشورہ کے استحباب پر عمل کرنے کے بعد، عزم کے مرحلہ میں داخل ہو تو اکثریت، اقلیت یا اپنی رائے میں سے کسی بھی جانب کو قبول کرنے کا مجاز ہے، یہ ایک ایسا نقطہ نظر ہے جس کا متقدمین کے یہاں کوئی قائل نہیں۔

## اصول فقہ کی روشنی میں

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مشورے کے حکم سے متعلق مندرجہ بالا تفصیلات، تفاسیر قرآن یا حدیث پاک اور اس کی شروح سے نقل کی گئی ہیں، اسی کے ساتھ یہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اصول فقہ کی روشنی میں ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ زیر بحث آیت کے مختلف اجزاء سے جن مضامین پر استدلال کیا گیا ہے ان کا اصول فقہ کی اصطلاح میں کیا نام اور کیا درجہ ہے اور کس مضمون کے لئے کیا جانے والا استدلال درست ہے اور کس مضمون پر استدلال اصول فقہ کی روشنی میں درست نہیں ہے، آیت پاک سے جو مضامین ثابت کئے

جاری ہیں ان کی تفصیل یہ ہے کہ شاور ہو سے مندرجہ ذیل دو باتیں ثابت کی جا رہی ہیں۔

۱۔ شاور ہم میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کا حکم دیا گیا ہے اور یہ حکم وجوب یا سنیت کے درجہ میں ثابت ہے۔

۲۔ امت کے دیگر افراد یعنی سلاطین و اماراء کے لئے بھی مشورہ کا حکم اسی آیت سے ثابت ہے۔

اسی طرح دوسرے جز فاذا عزمت سے بھی مندرجہ ذیل دو باتیں ثابت کی جا رہی ہیں۔

۳۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عزم فرمائیں تو امت کے کسی فرد کا مشورہ آپ کے عزم کے بعد قابل قبول نہیں۔

۴۔ امت کے دیگر افراد یعنی اماراء و سلاطین بھی عزم قائم کرنے میں آزاد ہیں، کہ مشورہ کے بعد وہ اقلیت، اکثریت یا اپنی ذاتی رائے میں سے کسی بھی جانب کو ترجیح دیکر اس سے عزم متعلق کر سکتے ہیں۔

اب ہمیں ان چاروں مضامین کے بارے میں غور کرنا ہے کہ حنفیہ نے قرآن نہیں کیلئے جو اصول مقرر کئے ہیں، ان میں کون سا مضمون کس طرز استدلال سے ثابت ہے۔ اس جائزے کیلئے ضروری ہے کہ ہم پہلے حنفیہ کے طرز استدلال کا خلاصہ پیش کر دیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں متقدمین و متأخرین کی عربی کتابوں کے بجائے عصر قریب کے مشہور اصولی مفسر حضرت مولانا فتح محمد باب لکھنوی کے الاحسان فی علوم القرآن کے اقتباسات پیش کر دئے جائیں موصوف

ان استدلالات کے بارے میں لکھتے ہیں۔

”لفظ و عبارت سے معانی و مراد قرار دینے کے متعدد طریقے شعراء

اور اہل زبان کے یہاں معتبر اور مستعمل ہیں، مگر علمہ نے صرف وہی

چار طریقے انتخاب کر لئے ہیں جن سے یقین ہو سکے کہ کلام کی یہی مراد ہے

اور دوسرے طرق جو مفید یقین نہیں تھے ترک کر دیئے۔

چند لائنوں کے بعد لکھتے ہیں۔

”پھر وہ طاق معتمدہ علماء حنفیہ کے نزدیک چار ہیں، اسلئے کہ متکلم جو

کلام کرتا ہے اس سے ایک مقصود اس کا ضرور ہوتا ہے اور وہ اقویٰ

اور ہم بے کل سے اور اسے عبارة النص کہتے ہیں، یعنی وہ معانی

جن سے کلام جاری کیا گیا ہو اور سیاق سے ثابت ہو۔

اور اگر صرف کلمات اپنے معنی لغویہ یا مراد متعارفہ یا لوازم سے ایک امر بتائیں

مگر اس معنی کے لئے کلام مسوق ہو اور نہ مخالف مقصود متکلم، و سیاق کلام کے ہوں

تو یہ اشارۃ النص ہے۔ اور اگر مراد ترجمہ لغوی سے سمجھی جائے مگر نہ اس طرح کہ وہ عین

ترجمہ لغت ہو بلکہ ترجمہ سے بطریق اولیٰ مفہوم ہو سکے تو اس دلالت النص کہتے ہیں

اور اگر ایسی بات کہی جائے جس کا صحیح ہونا عقلاً یا شرعاً ایک اور امر کے مان لینے پر

لہ اس جگہ نص سے مراد کلام ہے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ وہ بات جس کیلئے کلام لایا گیا ہے کبھی اصالة مقصود

ہوتا ہے اور کبھی تبعاً۔ کچھ علمہ اصول نے دونوں کو عبارة النص قرار دیا ہے، جیسا کہ اصول فقہ کی

متعدد کتابوں میں ماسبق الکلام لہ اصالة او تبعاً کی تشریح موجود ہے، اور کچھ علماء

اصول ماسبق الکلام لہ اصالة کو عبارة النص کہتے ہیں، تبعاً کو انھوں نے اشارۃ النص قرار دیا

ہے ہماری اس بحث میں دوسرے نقطہ نظر کے مطابق کلام کیا گیا ہے۔

موقوف ہو تو اس دوسرے امر کو اقتضار النص کہیں گے۔

(الاحسان فی علوم القرآن ص ۶۷ ملخصاً)

اس کے بعد حضرت مولانا فتح محمد صاحب نے حنفیہ کے ان چاروں طریق استدلال کی مثالیں پیش کی ہیں۔ اور ایک ہی آیت پر ان چاروں انداز سے استدلال کرنے کے اس طریق استنباط کو ذہن نشین اور آسان کرنے کی کوشش کی ہے، مثلاً: قل هو اللہ احد سے چاروں طرق پر استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے: قل هو اللہ احد یہ تمام سورت مسوق ہے توحید کیلئے، پس یہ عبارت ہے، اور اشارت ہے کہ وہ صمد ہے اور کوئی اس کا برابر والا نہیں اور دلالت سے سمجھا گیا کہ اللہ تعالیٰ حادث و فانی نہیں اس لئے کہ جو بے نیاز ہے وہ دوسرے کا بنایا ہوا بدرجہ اولیٰ نہ ہوگا اور اقتضائے سمجھا گیا کہ اللہ تعالیٰ واجب بالذات اور سمیع و بصیر و علیم و حی و مرید ہے ورنہ بے نیازی صحیح نہ ہوگی۔ (ص ۶۹ بحوالہ بالا)

حضرات احناف رحمہم اللہ نے قرآن کریم سے مضامین اور مسائل کے استنباط کے لئے جو چار قابل اعتماد طریقے منتخب کئے ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ ہر آیت کا ایک مرکزی مضمون ہوتا ہے جس کو بیان کرنے کے لئے وہ آیت نازل کی گئی ہو، پھر یہ کہ وہ مرکزی مضمون آیت کے سیاق و سباق سے ثابت بھی ہو رہا ہو اس مرکزی مضمون پر آیت سے کیا جانے والا استدلال، عبارتہ النص کی اصطلاح سے ذکر کیا جاتا ہے، بقیہ استدلال کے تینوں طریقے مرکزی مضمون کے علاوہ ہیں۔ اور ان کی تفصیل یہ ہے کہ مرکزی مضمون کے علاوہ اگر ترجمہ لغت، یا مراد متعارف، یا لوازم سے کوئی مضمون اس طرح سمجھا جائے کہ وہ منکلم کے مقصد اور سیاق کے مخالف نہ ہو تو اس کو اشارۃ النص

کی اصطلاح سے بیان کیا جاتا ہے اور اگر مرکزی مضمون یا ترجمہ لغت، مراد متعارف اور عام سے لے کر مضمون درجہ اولیٰ میں سمجھا جائے تو اس درجہ اولیٰ سے سمجھے گئے مضمون پر لیا جانے والا استدلال دلالۃ النص کے نام سے موسوم ہے۔ اور اگر مرکزی مضمون یا ترجمہ لغوی وغیرہ سے ثابت مضمون یا درجہ اولیٰ سے سمجھا جانے والا مضمون عقلاً یا شرعاً کسی اور امر کے مان لینے پر موقوف ہو تو عقلی یا شرعی موقوف علیہ پر کیا جانے والا استدلال، استدلال باقتضای النص کہلاتا ہے۔ ان چاروں طرق استدلال کا حقیقہ کے یہاں اعتبار ہے اور کسی کا نہیں۔

## آیت پر اصول کا احراز اور پہلے مضمون پر استدلال

اس مختصر تمہید کے بعد غور کرنا ہے کہ آیت شاور ہم فی الامر فاذا عزمت الآیہ سے جن چار مضامین پر استدلال کیا جا رہا ہے وہ حقیقہ کے طرق استدلال میں کس طرز استدلال سے ثابت ہیں، اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ پوری آیت نقل کی جائے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

فبإرادة من الله أنت لهم	سو یہ اللہ کی رحمت ہی ہے کہ آپ ان کے
ولو كنت فظا غليظ	حق میں نرم خو واقع ہوئے ہیں اور اگر
القلب لا تفسوا من	آپ تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ
حولك فاعف عنهم	آپ کے پاس سے مستشرق ہو جاتے، تو آپ

ان کو معاف کر دیں، ان کے لئے استغفار  
کریں اور ان سے کام میں مشورہ فرمایا  
کریں، پھر جب آپ کام کا عزم کریں تو  
اللہ پر بھروسہ کریں، بے شک اللہ تعالیٰ  
کو توکل پیشہ لوگوں سے محبت ہے۔

و استغفر لہم و ساءلہم  
فی الامر فاذا عزمتم  
فتوکل علی اللہ ان  
اللہ یحب المتوکلین  
(سورۃ آل عمران آیت ۱۵۹)

اس آیت کا مرکزی مضمون، اصالتہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ کرام کے  
حق میں نرم خود واقع ہونے کا بیان ہے، اور اس نرم خوئی کی تفصیلات میں بھی بیان  
کیا جا رہا ہے کہ جب آپ رحمت خداوندی سے ان کے حق میں نرم خو میں تو آپ  
ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائیں، ان کے لئے پروردگار سے بھی مغفرت طلب کریں  
اور ان سے معاملات میں مشورہ بھی فرماتے رہیں۔

اس لئے یہ سمجھنا آسان ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اس  
آیت سے مشورہ کے حکم پر استدلال، عبارتۃ النص سے کیا جانے والا استدلال ہے،  
اس لئے کہ یہ مضمون مرکزی مضمون بیان رحمت کی تفصیل میں لایا گیا ہے۔

عبارۃ النص کی اصطلاح کا مفہوم یہ ہے کہ کلام اس مقصد کے لئے لایا گیا  
ہو اور وہ سیاق سے بھی ثابت ہو، چنانچہ اس آیت کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ  
آیت میں بنیادی طور پر یہ فرمایا جا رہا ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نرمی طبع  
صحابہ کرام کے حق میں رحمت خداوندی ہے اور اس کی تفصیل میں یہ بیان کیا جا رہا  
ہے کہ غزوہ احد کے موقع پر اگرچہ ان بزرگوں سے اجتہادی لغزش ہوئی ہے مگر  
آپ تقاضائے رحمت میں معاف فرمادیں اور اللہ سے بھی ان کے حق میں مغفرت



کی دعا کریں اور ان سے مشورہ بھی فرمایا کریں، پھر جب مشورہ میں کوئی بات طے ہو جائے اور اس کا عزم فرمالیں تو اب تو کلامی اللہ اقدام فرمائیں۔  
اس لئے یہ کہا جائیگا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مشورہ کا حکم اس آیت کی عبارتہ النص سے ثابت ہے۔

## دو کے مضمون پر استدلال

رہ امت کے دیگر افراد کے لئے اس آیت سے مشورہ کے حکم کا ثبوت، تو وہ نہ مرکزی مضمون ہے نہ ترجمہ لغوی سے ثابت ہے بلکہ امت کے دیگر افراد کے بارے میں یہ کہا جائیگا کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کا حکم دیا گیا جبکہ آپ کو معلومات کے سب سے طاقتور ذریعہ یعنی وحی پر دسترس حاصل ہے، یعنی جب پیغمبر علیہ السلام کو وحی کی طاقت پیغمبرانہ بصیرت، کمال عقل و دانش اور حظیرۃ القدس سے براہ راست رابطہ کے باوجود صحابہ کرام سے مشورہ کا حکم دیا گیا تو امت کے دیگر افراد کے بارے میں مشورہ کا حکم شاورہم کی دلالت النص سے ثابت ہے۔ چنانچہ علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں۔

لا غنی لولی الامر عن  
المشاورة فان الله امر  
بها نبيه صلى الله عليه  
وسلم نفيده اولی بالمشورة  
(السیاسة الشرعیة ص ۵)

کسی بھی کام کے ذمہ دار کو مشورے سے  
بے نیاز قرار نہیں دیا جاسکتا اس لئے کہ اللہ  
تعالیٰ نے اپنے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام  
کو مشورہ کا حکم دیا ہے تو آپ کے علاوہ  
دیگر حضرات کیلئے بدرجہ اولیٰ مشورہ کا حکم

ثابت ہوگا۔

معلوم ہوا کہ آیت شاد رہم سے مشورہ کا حکم حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عبارة النص ہے، اور دیگر سلاطین و امراء کیلئے دلالة النص سے ثابت ہے۔

## تیسرے اور چوتھے مضمون پر استدلال

بحث کے آغاز میں جن چار مضامین کا تعین کیا گیا تھا ان میں سے پہلا مضمون آیت کے پہلے حصے شاد رہم کی عبارة النص ہے، اور دوسرا مضمون اسی حصے کی دلالة النص سے ثابت ہے، اب تیسرے مضمون یعنی پیغمبر علیہ السلام کے عزم اور چوتھے مضمون دیگر امراء کے عزم کے بارے میں آیت کے دوسرے حصے فاذا عنمت پر اصول استنباط کا اجراء کر لیا جائے تو بات منقطع ہو جائے گی، چنانچہ یہ بات صاف ہے کہ فاذا عنمت کا مرکزی مضمون حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزیمت کا بیان نہیں ہے، مرکزی مضمون تو یہاں بھی امت کے حق میں پیغمبر علیہ السلام کی نرم خوئی اور شفقت کا بیان ہے البتہ ترجمہ لغوی سے ضمنی طور پر یہ بات معلوم ہوئی کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام مشورہ میں طے شدہ بات کا عزم فرمائیں تو اب اللہ پر توکل کر کے اقدام فرمائیں۔

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ عزم کے مشورے سے آزاد ہونے کی نفی پر دلائل گذر چکے ہیں، لیکن مجاراة مع الخصم کی قبیل سے ہم چند قدم دوسرے نقطہ نظر کے ساتھ چلیں تو کہا جائے گا کہ یہاں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام جنہیں پیغمبرانہ بصیرت حاصل ہے، جنہیں وحی پر دسترس حاصل ہے، جن کی عقل و دانش کائنات

جن دانش کی عقل و دانش سے بدرجہا فائق ہے، وہ جب عزم فرمائیں تو اب کسی کے لئے ان سے تعرض کرنا جائز نہیں، اب وہ عزم کے بعد تو کلاً علی اللہ اقدام فرمائیں گے اور امت کے دیگر افراد کا ان کے عزم کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ضروری ہوگا۔ گویا پیغمبر علیہ السلام کے عزم کے سلسلے میں کیا جانے والا استدلال چونکہ آیت کے ترجمہ لغوی سے متعلق ہے اس لئے اصطلاح میں اس کو اشارۃ النص کہا جائے گا۔ لیکن عزم کے انہی معانی کو اگر ہم دیگر سلاطین و امراء کے بارے میں جاری کرنا چاہیں تو اس کی تعبیر اس طرح ہوگی کہ جب پیغمبر علیہ السلام کو وحی کی طاقت، پیغمبرانہ بصیرت، عقل و دانش کے کمال کے سبب یہ بات حاصل ہے کہ آپ کے عزم کے بعد کسی کو اختلاف رائے کی گنجائش نہیں تو امت کے دیگر امراء و سلاطین جو ان اوصاف کے حامل نہیں ہیں ان کو بھی بدرجہ اولیٰ یہ امتیاز حاصل ہوگا کہ ان کے عزم کے بعد کسی تامل یا مشورہ کی گنجائش نہ رہے۔

ظاہر ہے کہ عزم کے بارے میں دلالت النص کے اجراء سے دیگر امراء کے بارے میں یہ حکم ثابت نہیں ہوتا۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ شاذ و عموماً کی دلالت النص سے امت کے دیگر افراد کے بارے میں مشورہ کا حکم درجہ اولیٰ میں ثابت تھا، لیکن اذعنمت کی دلالت النص سے امت کے دیگر افراد کے بارے میں استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

۱۔ رسول مجلس مشاورت کی رائے کا تابع نہیں ہوتا، دوسرے لوگ

اس کے تابع ہوتے ہیں۔ (ترجمان السنہ جلد اول ص ۱۴۳)

علیہ وسلم اور معمر و تجربہ کار صحابہ کہ جن کی قوت و اصابت رائے پر آپ کو اعتماد تھا۔  
 کی رائے یہ تھی کہ غزوہ احد کے موقع پر مسلمانوں کو مدینہ سے نکل کر جنگ نہیں کرنی چاہئے  
 مگر اکثریت کے لحاظ سے ان صحابہ کی تعداد بہت زیادہ تھی جن کا اصرار تھا کہ ہم کو مدینہ  
 سے باہر نکل کر جنگ کرنی چاہئے، تو آپ نے اکثریت کے فیصلے کو برقرار رکھتے ہوئے  
 باہر نکل کر جنگ کرنے کو ہی ترجیح دی اور اس عمل اسوۂ حسنہ کو اپنے مسطورہ ذیل  
 ارشاد مبارک سے محکم و مضبوط بنا دیا۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک صحابی نے یہ استفسار کیا ما  
 العزم یا رسول اللہ؟ اے خدا کے رسول! قرآن میں مذکور فاذا عزمتم میں  
 عزم سے کیا مراد ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ مشاورۃ اهل الرأي ثم اتباعهم اهل  
 الرأي سے مشورہ کرنے کے بعد (امام و خلیفہ کا) ان کی دی ہوئی رائے پر عمل پسرا  
 ہونے کا نام عزم ہے۔ (قصص القرآن جلد چہارم ص ۴۵)

## رسول کے عزم اور دیگر امراء کے عزم میں فرق

حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب رحمہ اللہ کے بیان میں دونوں باتیں فنا  
 ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے فاذا عزمتم کی جو تفسیر سامنے آئی  
 ہے وہ اکثریت کی رائے کے مطابق آپ کا عزم فرمانا ہے، اور چونکہ حضرت علیؓ کرم اللہ  
 وجہہ کی روایت میں بھی یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ آپ نے عزم کے معنی ہی مشاورۃ اهل  
 الرأي ثم اتباعهم بیان فرمائے ہیں اس لئے دیگر امراء و سلاطین کے حق میں بھی عزم  
 کے یہی معنی ہوں گے کہ وہ بھی اہل رائے سے مشورہ کرنے کے بعد انہی کی رائے کے

کے حق میں عزم کا یہ مضمون کہ وہ عزم میں مشورے کے پابند نہیں ہیں، آیت قرآنی سے حنفیہ کے معین کردہ طرق استدلال میں سے کسی طریقے سے ثابت نہیں اسلئے اگر عزم کے یہ معنی مراد بھی لئے جائیں کہ وہ مشورہ کا پابند نہیں ہے تو یہ صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہوگی، دیگر امراء و سلاطین کے حق میں اس کو عام کرنا حنفیہ کے مقرر کردہ فہم قرآن کے طریقوں کی رو سے درست نہیں ہے جیسا کہ تفصیل کے ساتھ عرض کیا جا چکا ہے۔

پھر یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عزم کے جو امتیازی معنی آیت کی اشارۃ النص سے ثابت قرار دئے گئے ہیں، وہ بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی میں اس طرح موجود نہیں ہیں، بلکہ پروردگار عالم نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر، ہیوفا الامر کے ذریعہ مشورہ کا حکم دیا، اور آپ نے حکم خداوندی کی اس طرح تعمیل کی کہ صحابہ کرام کو یہ شہادت دینا پڑی کہ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی کو مشورہ کا پابند نہیں پایا، پھر یہ کہ آپ نے ہمیشہ مشورہ دینے والوں کے مشورہ کو اہمیت دی، عام طور پر تو ایسا ہوا کہ مشورہ میں کوئی ایک بات طے ہوگئی اور اسی کے مطابق عزم فرمایا گیا، اور ایسا بھی ہوا کہ مشورہ میں اتفاق رائے نہ ہو سکا، تو آپ نے اپنی ذاتی رائے کے خلاف اکثریت کی رائے کو قبول کرتے ہوئے اس کے مطابق عزم فرمایا، غزوہ احد کے موقع پر آپ کا طرز عمل ہمارے دعویٰ کی سب سے مضبوط شہادت ہے کہ آپ نے اپنی اور جلیل القدر صحابہ کی رائے کو قبول فرمایا۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے۔

وشادہ ہر فی احد فی ان  
 یفعد فی المدینۃ او  
 یخرج الی العد و فاشار  
 جہلوس ہم بالخروج الیہم  
 فخرج الیہم  
 (تفسیر ابن کثیر ۳/۲۲۲)

غزوہ احد کے موقع پر آپ نے مدینہ میں  
 قیام کر کے یا مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرنے  
 کے سلسلے میں مشورہ کیا تو جمہور (اکثریت)  
 نے دشمن کے مقابلہ پر باہر نکل کر مقابلہ  
 کرنے کا مشورہ دیا تو آپ نے باہر نکل کر  
 مقابلہ کیا۔

اکثریت کی رائے پر عمل کرنے کی اس مضبوط شہادت کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہے  
 کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر اپنی رائے سے بھی مطلع کر دیا تھا  
 اور اس کی تائید میں ایک خواب بھی بیان فرمایا تھا۔ فتح الباری میں ہے۔

وکان ذکر لہم قبل ان  
 یلبس اکاداة الخ رأیت  
 الخ فی درع حصینۃ فاولتھا  
 المدینۃ و ہذا سند  
 حسن و اخرج احمد و  
 الدارمی و النسائی من طریق  
 حماد بن سلمۃ عن ابی الزبیر  
 عن جابر بنحوہ و تقدمت  
 الاشارة الیہ فی کتاب  
 التعبیر و سندہ صحیح

آپ نے ہتھیار بند ہونے سے پہلے صحابہ  
 کرام کو یہ بتلادیا تھا کہ میں نے یہ خواب  
 دیکھا ہے کہ میں نے ایک مضبوط زرہ  
 پہن رکھی ہے، میں نے اس کی یہ تعبیر لی  
 ہے کہ مدینہ میں قیام مناسب ہے، یہ سند  
 حسن ثابت ہے، اور امام احمد، دارمی اور  
 نسائی نے حماد بن سلمہ سے بروایت  
 ابی زبیر حضرت جابر سے بھی یہی مضمون  
 نقل کیا ہے، اور کتاب التبعیر میں اس  
 کی طرف اشارہ گذر چکا ہے، اور اس کی



و لفظ احمد ان النبی صلی  
اللہ علیہ وسلم قال  
رأیت صافی فی درع  
حصینۃ و رأیت بقرۃ تنحر  
فاقلت الدرع الحصینۃ  
المدينة۔

(فتح الباری ج ۱۳ ص ۲۸۴)

طیبہ میں قیام لی ہے۔  
ان حوالوں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی  
رائے کا اظہار فرمایا، پھر خواب سنا کر اس کی تعبیر سے مطلع کیا، لیکن اکثریت کی رائے  
پھر بھی مدینہ طیبہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرنے ہی کی رہی، جس پر آپ نے اپنی رائے  
کے خلاف، اکثریت کی رائے قبول فرما کر باہر نکلنے کا عزم فرمایا۔

اسی مضمون کو حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب رحمہ اللہ قصص القرآن  
میں بیان فرماتے ہیں۔

۱۔ امیر خلیفہ اور اس کے نائبین کا فرض ہے کہ اہم امور میں مسلمانوں سے  
مشورہ کرے اور باتفاق رائے یا بکثرت رائے جو فیصلہ ہو اسی کو اپنا عزم بنا  
نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی ہوتا تھا اس لئے اگر آپ صحابہ کرام رضی اللہ  
عنہم سے مشورہ نہ بھی فرماتے تو کوئی قباحت نہ تھی تاہم اسوۂ حسنہ کو شعار بنانے  
کے لئے آپ اہم امور میں برابر مسلمانوں سے مشورہ فرماتے رہے، چنانچہ غزوہ احد  
میں بھی مشورہ فرمایا، اور اس مشورہ کی یہ خصوصیت ہے کہ خود ذات اقدس صلی اللہ

علیہ وسلم اور معمر و تجربہ کار صحابہ کرام جن کی قوت و اصابت رائے پر آپ کو اعتماد تھا۔  
 کی رائے یہ تھی کہ غزوہ احد کے موقع پر مسلمانوں کو مدینہ سے نکل کر جنگ نہیں کرنی چاہئے  
 مگر اکثریت کے لحاظ سے ان صحابہ کی تعداد بہت زیادہ تھی جن کا اصرار تھا کہ ہم کو مدینہ  
 سے باہر نکل کر جنگ کرنی چاہئے، تو آپ نے اکثریت کے فیصلے کو برقرار رکھتے ہوئے  
 باہر نکل کر جنگ کرنے کو ہی ترجیح دی اور اس عمل اسوۂ حسنہ کو اپنے مسطورۂ ذیل  
 ارشاد مبارک سے محکم و مضبوط بنا دیا۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک صحابی نے یہ استفسار کیا ما  
 العزم یا رسول اللہ؟ اے خدا کے رسول! قرآن میں مذکور فاذا عزمتم  
 عزم سے کیا مراد ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ مشاورۃ اهل الرأي ثم اتباعهم اهل  
 الرائے سے مشورہ کرنے کے بعد (امام و خلیفہ کا) ان کی دی ہوئی رائے پر عمل پیرا  
 ہونے کا نام عزم ہے۔ (قصص القرآن جلد چہارم ص ۴۷)

## رسول کے عزم اور دیگر امراء کے عزم میں فرق

حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب رحمہ اللہ کے بیان میں دونوں باتیں صاف  
 ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے فاذا عزمتم کی جو تفسیر سامنے آئی  
 ہے وہ اکثریت کی رائے کے مطابق آپ کا عزم فرمانا ہے، اور چونکہ حضرت علیؓ کرم اللہ  
 وجہہ کی روایت میں بھی یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ آپ نے عزم کے معنی ہی مشاورۃ اهل  
 الرأي ثم اتباعهم بیان فرمائے ہیں اس لئے دیگر امراء و سلاطین کے حق میں بھی عزم  
 کے یہی معنی ہوں گے کہ وہ بھی اہل رائے سے مشورہ کرنے کے بعد انہی کی رائے کے

مطابق عزم کرنے کے پابند ہیں۔

لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عزم کے جو معنی بیان فرمائے ہیں مشاور اہل لاری ثم اتبائعہم وہ عزم کے لغوی معنی نہیں ہیں۔ بلکہ عزم کی تفسیر فرما کر آپ مشورہ کرنے والوں کو یہ ہدایت دینا چاہتے ہیں کہ وہ اپنا عزم کس چیز سے متعلق کریں کیونکہ عزم کے لغوی معنی ہیں کسی کام کا پختہ ارادہ کرنا، یہ پختہ ارادہ قلب میں آنے والی باتوں کا وہ آخری درجہ ہے جسے حقیقت کے اعتبار سے قلب کا عمل کہنا چاہئے۔ عمل کا اطلاق جوارح کے اعمال کے ساتھ قلب کے اعمال پر بھی ہوتا ہے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی انما الاعمال بالنیات کی تشریح میں لکھتے ہیں۔

والتحقیق انہا (الاعمال) تحقیق یہ ہے کہ لفظ "اعمال" افعال  
تعرف افعال الجوارح و افعال جوارح اور افعال قلوب دونوں ہی کو  
القلوب (لمعات النفعیہ ص ۵۰) عام اور شامل ہے۔

باب الوسوسہ میں ان اللہ، تجاودنر عن امتی ما دوسوست بہ صدرھا  
پر کلام کرتے ہوئے شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے فقہاء محدثین کی طرف یہ بات  
منسوب کی ہے کہ عزم قلب کا وہ فعل ہے جس پر احکام مرتب ہوتے ہیں فرماتے ہیں  
والصواب الذی علیہ اکثر وہ درست موقف جسے اکثر فقہاء و  
الفقہاء والمحدثین انہ محدثین نے اختیار کیا ہے یہ ہے کہ انسان  
یواخذ علی العزم دون سے عزم کے بارے میں مواخذہ کیا جائیگا  
الامر بتحقیقہ ان ما ہم (عزم سے نیچے کا درجہ) پر نہیں کیا

دفع فی القلب بغتة  
من غیر اختیار و سماہ  
بعضہم الہا جس فہو  
معفوع عن جمیع الامور  
لعدم الاختیار فیہ  
ثرا اذا استمر و جمال  
فی الصدر و یستی  
الخاطر فہو معفوع عن  
ہذہ الامۃ فضلاً  
من اللہ و تعریباً  
لنبیہ و صلی اللہ علیہ  
وسلو و ہو فی حکم السہو  
والنسیان الذین رفعا  
عن ہذہ الامۃ ثمر  
اذا هم بالمعصیۃ فی قلبہ  
بالمحبۃ والتلذذ کما یقصد  
الوصول الی امرأۃ یحبہا  
فہذا ایضاً مرفوع و لا  
یکتب ما لو یعمل بل ینکب

جائیگا، اس کی تحقیق یہ ہے کہ جو باتیں  
قلب میں اچانک بلا اختیار آتی ہیں  
جسے بعض حضرات نے ہاجس کا نام  
دیا ہے وہ تمام امتوں سے معاف ہے  
کیونکہ اس میں اختیار کا دخل نہیں ہے  
پھر اگر یہ بات دل میں باقی رہے اور دل  
ہی دل میں گھومتی رہے اور اس کو خاطر  
کہتے ہیں، یہ بھی اللہ کے فضل اور حضور  
اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت افزائی کے  
سبب اس امت محمدیہ سے معاف ہے  
اور یہ سہو و نسیان کے حکم میں ہے جو اس  
امت محمدیہ سے معاف کر دیئے گئے ہیں  
پھر جب انسان معصیت کا ارادہ (ہم)  
کرے اور اس کے دل میں اس کی محبت  
ولذت محسوس ہونے لگے جیسے مثلاً وہ  
کسی محبوب عورت سے ملنے کا ارادہ کرے  
تو یہ درجہ بھی اس امت محمدیہ اس وقت  
تک معاف ہے جب تک کہ وہ عمل میں  
نہ لائے بلکہ اگر ارادہ کے باوجود وہ اپنے

حسنة اذا هم بها وكف  
 نفسه عن العمل  
 وقد ورد فيه احاديث  
 متعددة وههنا قسم  
 اخر وهو العزم وهو  
 توطئ النفس على  
 المعصية وعقد القلب  
 بها والتمسك عليها  
 بحيث لا يمنع  
 عنها الا عدم تهيتها  
 الاسباب من خارج و  
 ليس في نفسه مانع و  
 كراهة و نفرة منها فيواخذ  
 عليه لانه من اعمال القلب  
 والعبد مواخذ عليها من هذا  
 القبيل العقائد الفاسدة ومساوي  
 الاخلاق الخ (لمعات التنقيح ص ۱۳)

آپ کو عمل سے روکے رکھے تو اس کے  
 نامہ اعمال میں نیکی کا اندراج کیا جاتا  
 ہے اور اس سلسلے میں متعدد احادیث  
 وارد ہوئی ہیں۔ اور یہاں ایک  
 قسم اور ہے اور اس کو عزم کہتے  
 ہیں وہ یہ ہے کہ انسان کا نفس کسی  
 معصیت کیلئے بالکل آمادہ ہو جائے  
 دل پختہ ارادہ کر لے، اس کی شدید  
 خواہش پیدا ہو جائے اور یہ باتیں اس  
 درجہ میں ہوں کہ مانع صرف خارجی سبب  
 کا فراہم نہ ہونا رہ جائے ورنہ اس کی  
 طبیعت میں کوئی مانع، نفرت یا کراہت  
 باقی نہ رہے، یہ وہ درجہ ہے جس پر مواخذہ  
 ہے کیونکہ یہ قلب کا عمل ہے اور انسان  
 سے اعمال کے بارے میں مواخذہ کیا  
 جائیگا، فاسد عقائد اور برے اخلاق  
 اسی قبیل سے ہیں۔

خلاصہ یہ ہوا کہ عزم صرف ارادہ کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ قلبی ارادہ کا وہ آخری  
 درجہ ہے جس میں اگر خارجی اسباب ہوں تو فعل وجود میں آجاتا ہے اور اسباب

بنیاد ہونے کی صورت میں انسان فعل کو وجود دینے سے قاصر رہتا ہے۔ اگر یہ معصیت کی قبیل سے ہے تو اس پر منجانب اللہ گرفت اور مواخذہ ہے اور اگر یہ طاعات کی قبیل سے ہے تو اس پر یقیناً اجر و ثواب ہے۔

مندرجہ بالا تشریح کے مطابق عزم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہو یا دیگر امارا و سلاطین کا، یہ ارادہ قلبی کی وہ آخری منزل ہے جسے جوارح کے اعمال کی طرح قلب کا عمل قرار دیا گیا ہے، اب غور کرنے کی بات ہے کہ عزم جب ایک عمل کا نام ہے تو جو فرق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور دیگر امارا کے عمل میں ہے وہی فرق آپ کے عزم اور دیگر امارا کے عزم میں ہوگا، یعنی مشورہ

معاملہ میں جب اہل مشورہ کی رائے کے مطابق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عزم فرمایا تو اب اس جانب کو عمل رسول متعلق ہونے کی بنیاد پر سنت کا درجہ حاصل ہو گیا اور آپ کی سنت عملی سے محدث ہمارے بیان کے مطابق

سنت مؤکدہ تک کے احکام ثابت ہوتے ہیں، پھر اگر عزم کے ساتھ آپ کا کوئی قولی ارشاد بھی ہے تو اس سے صرف سنت مؤکدہ ہی تک نہیں بلکہ وجوب

تک کا ثبوت ہو سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ امور مشورہ طلب میں کسی جانب سے آپ کا عزم متعلق ہو جانے کے بعد وہ تمام مسلمانوں کے لئے واجب الاتباع

ہو جاتا ہے اور اس سلسلے میں مشورہ دینا بھی جائز نہیں رہتا نہ اس موقف پر نظر ثانی کی گنجائش رہتی ہے، امور مشورہ طلب میں آپ کا عزم متعلق ہونے

سے پہلے اور عزم کے متعلق ہونے کے بعد فرق کے لئے حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کا ارشاد ملاحظہ ہو، المقدمة السنیۃ میں لکھتے ہیں۔



وكان النبي صلى الله عليه وسلم قد يشاور في الأمور اليه كما شاور في أسارى بدر وفي قصة الأذان وكان للصحابة رضي الله عنهم أن يتكلموا في حضرته ويعرضوا عليه ما رأوه خيراً وكان النبي صلى الله عليه وسلم قد قدم لهم ما يخالف رأيهم ما لم يعزم على شيء وما لم يعضد بالحكم به فإذا مضى وعزم لزماً لا تباع ولو يكن لأحد مجال الاختلاف -

(المقدمة السنية ص ۶۴)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ سے ان معاملات میں مشورہ فرمایا کرتے تھے جن میں وحی کا نزول نہ ہوا جیسا کہ آپ نے اسیران بدر اور اذان کے معاملہ میں مشورہ فرمایا اور صحابہ کے لئے یہ جائز تھا کہ آپ کی موجودگی میں رائے دیں اور جس کو بہتر سمجھیں وہ آپ کیساتھ پیش کریں خواہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی رائے صحابہ کی رائے کے خلاف دے چکے ہوں جب تک کہ آپ نے عزم نہ فرمایا ہو اور حکم کو نافذ نہ کیا ہو پھر جب آپ حکم نافذ فرمادیتے اور عزم کر لیتے تو صحابہ کیلئے پیروی کرنا لازم ہو جاتا اور کسی کیلئے اختلاف کی گنجائش باقی نہ رہتی۔

اس سے یہ واضح ہوا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی جانب کا عزم فرمائیں تو پس اب وہی جانب حق ہے، آپ کے عزم کے تعلق کے بعد اس پر نظر ثانی کی گنجائش نہیں رہتی بلکہ امت کے لئے ضروری ہے کہ اسی جانب کو سنت عملی کا درجہ دے کر قبول کرے بلکہ اگر عزم کے ساتھ قوی وضاحت بھی ہے تو

ہو سکتا ہے کہ اس نقطہ نظر کو صرف سنت عملی نہیں وجوب کے درجہ میں بھی لایا جائے۔

جب کہ دیگر امراء کے عزم کو یہ فوقیت حاصل نہیں ہے، یہ حضرات بھی عزم کے سلسلے میں اس کے تو پابند ہیں کہ یہ عزم اہل مشورہ کی رائے کے مطابق کیا جائے گا لیکن اہل مشورہ کی رائے کے مطابق پختہ ارادہ کے باوجود ان کے عزم کو بدیہی طور پر سنت کا درجہ نہیں دیا جاسکتا کیونکہ سنت صرف عمل رسول کا نام ہے اور اسی لئے دیگر امراء کے عزم پر ہمہ وقت نظر ثانی کی گنجائش رہتی ہے اگر دوسری مصلحتیں سامنے آجائیں اور اہل رائے خود اپنے معین کردہ نقطہ نظر پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کریں تو شرعاً اس میں کوئی تنگی نہیں، بلکہ ایسا کرنا ضروری ہے۔

اس تجزیہ کے مطابق یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ عزم رسول فعل قلب ہونے کی بنا پر سنت عملی کے درجہ میں ہے کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس حق کا معیار ہے، آپ کا ہر عمل حجت ہے، آپ کے عمل پر نظر ثانی کی گنجائش نہیں، جبکہ دیگر امراء کی یہ شان نہیں، ان کے پسندیدہ اور اختیار کردہ عزم پر ہمہ وقت نظر ثانی کی گنجائش رہتی ہے، یہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا کہ دیگر امراء کو عزم کے معاملہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح تفوق دیدیا جائے کہ وہ عزم کے معاملہ میں آزاد ہیں کہ مشورہ کے بعد اکثریت، اقلیت یا اپنی رائے میں سے کسی بھی جانب کو ترجیح دیدیں اور ترجیح دینے کے بعد اس پر غور و فکر کا دروازہ بند سمجھا جائے، کیونکہ دیگر امراء کی یہ شان نہیں ہے کہ خود ان کی ذات کو

معیار حق قرار دیا جائے، بلکہ ان کے عزم کے درست ہونے یا نادرست ہونے کا معیار ان کی ذات نہیں بلکہ منصوص مسائل میں کتاب و سنت کے معیار کے مطابق اور غیر منصوص جزئیات میں مجلس شوریٰ کے حکم کے مطابق درست ہونا ہے

## عہد رسالت میں مشورہ طلب مسائل اور فیصلہ کا طریقہ

پچھلے صفحات میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے مشورہ کی شرعی حیثیت مشورہ کے مقاصد وغیرہ پر گفتگو کی جا رہی تھی، اسی ذیل میں عزم کی بحث شروع ہو گئی اور اس پر تفصیلی کلام کیا گیا، اب پھر مقصود کی طرف عود کرتے ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مشورہ طلب مسائل اور اختلاف رائے کی صورت میں فیصلے کے طریقہ پر گفتگو کا آغاز کیا جا رہا ہے۔

تمام علماء امت کا اتفاق ہے کہ عہد رسالت میں منصوص مسائل میں نہ مشورہ کی ضرورت تھی اور نہ ایسے معاملات میں مشورہ جائز تھا جن میں وحی نازل کر دی گئی ہو۔ امام رازی قدس سرہ لکھتے ہیں۔

اتفقوا علی ان کل ما	علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ تمام امور
نزل فیہ وحی من عند اللہ	جن میں اللہ کی جانب سے وحی نازل
لم یجز للرسول ان یشاور فیہ الامۃ	ہو گئی ہو ان میں رسول کیلئے یہ جائز
لانہ اذا جاء النص بطل الرأی	نہیں کہ امت سے مشورہ کرے کیونکہ جب
والقیاس (تفسیر کبیر ص ۶۶)	نص آگئی تو رائے اور قیاس باطل ہو گیا۔



والاجتهاد يتفقون بالمناظرة  
والمباحثة فلهذا كان  
مأمورا بالمشاورة وقد  
شاوره يهود بدر في  
الامساري وكان من  
امور الدين -

(تفسیر کبیر مج ۲)

معلوم ہوتی ہے کہ آپ کو اس وقت اجتہاد  
کا حکم دیا گیا تھا جب وحی نازل نہ ہوئی ہو  
اور اجتہاد بحث و نظر سے قوت حاصل  
کرتا ہے اسلئے آپ کو مشورہ کا بھی حکم دیا  
گیا تھا چنانچہ آپ نے بدر کے  
قیدیوں کے سلسلے میں مشورہ کیا، جب کہ  
یہ معاملہ ایک دینی معاملہ تھا۔

معلوم ہوا کہ غیر منصوص معاملہ میں دینی ہو یا دنیوی مشورہ کیا جائے گا اور  
مشورے کے ذریعہ نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے گی۔

۳۔ مشورے کے دوران اگر وحی کا نزول ہو گیا تو مشورہ ختم کر دیا  
جائیگا اور وحی کے مطابق عمل کرنا ضروری ہو جائیگا کیونکہ مشورہ صحیح صورت تک  
پہنچنے کی کوشش تھی اور اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی، امام بخاری فرماتے ہیں

وشاور عليا واسامة  
فبارى به اهل الافك  
عائشة فسمع منها حتى  
نزل القرآن فجسد  
الرامين ولم يلتفت  
الى تنازعهم ولكن  
حكرو بما امره الله.

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ  
رضی اللہ عنہا پر تہمت تراشی کے سلسلے میں  
حضرت علی اور حضرت اسامہ سے مشورہ  
کیا اور ان دونوں کی رائے معلوم کی حتی  
کہ قرآن نازل ہو گیا تو آپ نے تہمت  
لگانے والوں پر حد جاری فرمائی اور اہل  
مشورہ کے اختلاف رائے پر توجہ نہیں دی

(بخاری شریف جلد ثانی ۱۰۹۵) لیکن امر خداوندی کے مطابق حکم نافذ فرمایا۔

معلوم ہوا کہ دورانِ مشورہ اگر وحی نازل ہو جائے تو مشورہ ختم کر دیا جائے گا اور وحی کے مطابق عمل درآمد کرنا ضروری ہو جائیگا، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ میں ہوا کہ مشورہ کے دوران وحی کا نزول ہو گیا تو مشورہ ترک کر دیا گیا۔

لیکن جس معاملہ میں وحی جلی یا خفی کی رہنمائی نہ ہو، اور اس میں مشورہ کی نوبت آجائے پھر مشورہ کے دوران بھی وحی کا نزول نہ ہو تو اہل مشورہ کی رائے کے مطابق فیصلہ کیا جائیگا۔ استقرائی طور پر اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں (الف) ایک صورت تو یہ ہے کہ ابتداءً خواہ وہ رائے اقلیت یا ایک ہی فرد کی ہو لیکن اس کو تمام اہل رائے کی تائید حاصل ہو جائے اور اسی ایک رائے پر سب کا اتفاق ہو جائے، عہد رسالت میں اس کی متعدد نظیریں ہیں، غزوہ خندق کے موقع پر خندق کی رائے تنہا حضرت سلمان فارسی کی جانب سے پیش کی گئی، لیکن اس سلسلے میں کسی کا اختلاف منقول نہیں بلکہ سب نے اس کو قبول کر لیا اور اسی کے مطابق عمل درآمد کیا گیا۔

(ب) دوسری صورت یہ ہے کہ امر مشورہ طلب میں اہل رائے کا اختلاف ہو جائے۔ لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کثرتِ رائے کے مطابق فیصلہ قبول فرمایا، جیسا کہ اسیرانِ بدر کو فدیہ لے کر رہا کرنے کے مسئلہ میں، یا غزوہ احد کے موقع پر مدینہ طیبہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کے سلسلے میں آپ نے کثرتِ رائے کا لحاظ فرماتے ہوئے فیصلہ فرمایا۔

(ج) تیسری صورت یہ ہے کہ اختلاف رائے کے موقع پر رسول اکرم صلی اللہ



اللہ علیہ وسلم نے اکثریت کی رائے ترک فرما کر، اقلیت کی یا اپنی ذاتی رائے کو ترجیح دیدی ہو، از روئے عقل اس کی بجا طور پر گنجائش ہے، کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر اعتبار سے جو اختیار حاصل ہے اس کے سبب آپ کو اس کا حق ہونا چاہئے لیکن نقلی طور پر پورے عہد رسالت میں اس کی کوئی واضح نظیر نہیں ملتی، کہ آپ نے اختلاف رائے کے باوجود اقلیت کی یا اپنی رائے کو ترجیح دی ہو، کیونکہ جن واقعات کو اقلیت کی رائے کی ترجیح کے سلسلے میں پیش کیا جاتا ہے وہ دراصل پہلی صورت کی نظیریں ہیں کہ ابتداءً وہ رائے اقلیت کی تھی لیکن دوران مشورہ اس کو اکثریت کی تائید حاصل ہو گئی، اسی طرح جن واقعات کو ذاتی رائے کی ترجیح کی دلیل قرار دیا جاتا ہے وہ دراصل وحی خفی کی نظیریں ہیں، اگر ان میں معاملہ مشورہ طلب نہیں تھا جیسا کہ صلح حدیبیہ کے بارے میں ہوا یہ بحث اپنے مقام پر آرہی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عہد رسالت میں امور مشورہ طلب میں فیصلہ تک پہنچنے کے دو طریقے بالکل صاف ہیں ایک یہ کہ اہل رائے کا کسی نقطہ نظر پر اتفاق ہو جائے، دوسرے یہ کہ اختلاف رہے تو اکثریت کی رائے کو ترجیح دیدی جائے البتہ ان تمام مشورہ طلب امور میں یہ بات ملحوظ رہے کہ مشورے کا وقت آپ کے عزم سے پہلے ہے جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مشورہ فرمانے کے بعد عزم کر لیں اور آپ کا عمل قلب کسی جانب سے متعلق ہو جائے تو مشورہ کا وقت ختم ہو جاتا ہے اور تمام مؤمنین کے لئے آپ کے عزم کے مطابق عمل کرنا سنت کے درجہ میں آ جاتا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ واقعہ قرطاس

کی وضاحت میں فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کاغذ طلب فرمانے کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حسبن کتاب اللہ فرمایا اسکی کیا وجہ ہے؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس جواب کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے یہ سمجھا کہ طلب قرطاس سے ابھی آپ کا عزم متعلق نہیں ہوا ہے اگرچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے وہ بات پیش آپ کی تھی جس سے عزم کا متعلق ہونا ظاہر ہوتا تھا، اور بسا اوقات صحابہ آپ کے سامنے اپنی رائے پیش کرتے تھے جبکہ اللہ تعالیٰ پیغمبر علیہ السلام پر پیش کردہ صورت حال کے علاوہ دوسری صورت واضح کر چکا ہوتا تھا اور ایسے میں آپ صحابہ کے مشورہ کو قبول نہ فرماتے تھے جیسا کہ حدیث میں ہوا، لیکن صحابہ ان قرآن کے سبب جو مشورہ کے وقت کا باقی رہنا ظاہر کرتے تھے معذور تھے خواہ نفس الامر میں مشورہ کا وقت باقی نہ رہا ہو کیونکہ مجتہد کو خطا کے باوجود اجر ملتا ہے۔

انما وجهه انه رضى الله عنه علم ان الامر غير معزوم وان كان قدم صلى الله عليه وسلم ما ظاهرا الغرم وربما عرضوا عليه وقداراه الله غير ما عرضوا عليه فلم يلتفت الى اقوالهم كما وقع في الحديبية لكنهم بسبب ما ظهر لهم بالقرائن من ان وقت المشاورة باق وان لم يكن باقيا في نفس الامر معذرون وللمجتهد اجر وان اخطا .

(المقدمة السنية ص ۶۶)

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کے مضمون کا خلاصہ یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عزم فرمانے کے بعد مشورہ کا وقت ختم ہو جاتا ہے اور جہاں جہاں صحابہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ دیا ہے وہاں ان حضرات نے یہی سمجھا ہے کہ مشورہ کا وقت باقی ہے۔

## زیر بحث موضوع متعلق امام بخاری کا ترجمہ الباب

مشورہ سے متعلق امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب کے ایک ترجمہ الباب میں مختلف مضامین بیان فرمائے ہیں کہ مشورہ کا وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عزم فرمانے سے پہلے ہے، آپ کے عزم فرمانے کے بعد مشورہ کا وقت ختم ہو جاتا ہے، اسی ترجمہ میں امام بخاری نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر خلفاء کے مشورہ کے درمیان فرق بھی واضح کر دیا ہے، اور بھی اس ترجمہ میں مزید فوائد ہیں، ہم نے یہاں سہولت کے پیش نظر ان تمام افادات پر الگ الگ نمبر ڈال دئے ہیں تاکہ اس موضوع سے متعلق امام بخاری کے افادات کا تجزیہ کیا جاسکے۔ امام بخاری فرماتے ہیں۔

قرآن کریم نے اُمیوں کے لئے یہ قانون مقرر کیا ہے کہ ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے ہوں گے اور رسول کیلئے بھی مشورہ کا حکم ہے لیکن یہ مشورہ

۱۔ باب قول اللہ وامرہم شورى بینہم وشاورہم فی الامر وان المشاورة قبل العزم والتبیین لقولہ

فاذا عزمتم فتوكل  
على الله فاذا عزم  
الرسول لم يكن لبشر  
التقدم على الله ورسوله

کا حکم رسول کے عزم کرنے سے پہلے اور  
خدا کی جانب سے صورت حال کی وضاحت  
سے پہلے ہے کیونکہ اللہ نے ارشاد فرمایا ہے  
کہ جب آپ عزم کر لیں تو اللہ پر توکل کریں  
چنانچہ اگر پیغمبر علیہ السلام عزم فرمائیں تو اب  
مشورہ دینا خدا اور رسول کے سامنے  
تقدم اور پیش دستی شمار ہوگا جس کی  
اجازت نہیں۔

۴ — وشاور النبي  
صلى الله عليه وسلم  
اصحابه يوم اُحد  
في المقام والخروج  
فأوالوا الخروج فلما  
لبس لأمته وعزم قالوا  
اقف لمريميل اليه بعد  
العزم وقال لا ينبغي لنبى  
يلبس لأمته فيضعها  
حتى يحكم الله۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ اُحد  
کے موقع پر مدینہ طیبہ میں رہ کر یا باہر  
نکل کر مقابلہ کرنے کے سلسلے میں مشورہ  
فرمایا تو صحابہ نے باہر نکلنے کا مشورہ دیا  
پھر جب آپ نے زرہ پہن لی اور عزم  
فرمایا تو صحابہ نے عرض کیا کہ آپ مدینہ  
میں قیام فرمائیں لیکن عزم فرمانے کے  
بعد آپ نے ان کے اس مشورے کو قبول  
نہیں کیا اور فرمایا کہ نبی کی شان سے  
بعید ہے کہ زرہ پہن لینے کے بعد اس  
کو حکم خدا کے بغیر اتار دے۔

۴ — وشاور علیاً و  
اسامة فیما رآی بہ اهل  
الافک عائشة فسمع منها  
حتى نزل القرآن فجعل  
الرامین ولم یلتفت الی  
تنازعهم ولكن حکم  
بما امرہ اللہ۔

اسی طرح حضرت عائشہ پر تہمت طرازی  
کے واقعہ میں آپ نے حضرت علیؓ اور  
حضرت اسامہؓ سے مشورہ کیا، انکے  
مشوروں کو بغور سنا لیکن جب قرآن  
نازل ہو گیا اور حکم واضح ہو گیا تو آپ نے  
تہمت لگانے والوں پر حد جاری فرمائی  
اور مشورہ دینے والوں کے اختلاف رائے  
کو اہمیت نہیں دی بلکہ امر خداوندی کے  
مطابق حکم نافذ کر دیا۔

۴ — وكانت الائمة  
بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم  
یستشرون الامناء من اهل  
العلم فی الامور المباحة  
لیأخذوا بأسهلها فاذا  
وظم الکتاب والسنة لم  
یتعدوا الی غیرہ اقتداء  
بالنبي صلی اللہ علیہ وسلم  
۵ — ورأی ابوبکر  
قتال من منع الزکوة فقال عمرؓ

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء کا  
بھی یہ معمول تھا کہ وہ مباح چیزوں میں  
امت کے امانت دار اہل علم سے مشورہ کیا  
کرتے تھے تاکہ شریعت کے عطا کردہ سر  
پر عمل کر سکیں پھر جب مشورہ میں کتاب  
وسنت کا کوئی حکم واضح ہو جاتا تو پھر  
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدار کے  
مطابق کسی دوسری چیز کو اختیار نہ فرماتے  
اور حضرت ابوبکرؓ نے انھیں زکوٰۃ سے  
قتال کا ارادہ فرمایا تو حضرت عمرؓ نے کہا

کیف تقاتل الناس وقد  
قال رسول الله صلى الله عليه  
وسلم امرت ان اقاتل الناس  
حتى يقولوا لا اله الا الله فاذا  
قالوا لا اله الا الله عصموا  
منى دماءهم واموالهم الا  
بحقها وحسابهم على الله  
فقال ابو بكر والله لا قاتلن  
من فرق بين ما جمع  
رسول الله صلى الله عليه  
وسلم ثم تابعه بعد  
عمر فلم يلتفت ابو بكر  
الى مشورة اذ كان  
عنده حكر رسول الله صلى  
الله عليه وسلم في الذين  
فرقوا بين الصلوة و  
الزكوة و امرادوا بتبديل  
الدين واحكامه  
وقال النبي صلى الله عليه

کہ آپ کیسے ان لوگوں سے قتال کر سکتے  
ہیں جبکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد  
فرمایا کہ میں کہ مجھے لوگوں سے قتال کا  
حکم دیا گیا ہے تا اینکہ وہ کلمہ توحید کا اقرار  
کر لیں تو انھوں نے مجھ سے اپنی جان  
و مال کو محفوظ کر لیا الا یہ کہ جان و مال کا  
کوئی حق باقی رہ جائے اور ان سے محاسبہ  
اللہ کرے گا، تو حضرت ابو بکرؓ نے جواب  
دیا کہ بخدا! میں ان لوگوں سے ضرور  
قتال کروں گا جنھوں نے ان چیزوں کے  
حکم میں فرق کر ڈالا ہے جن میں حضور صلی  
اللہ علیہ وسلم نے فرق نہیں کیا تھا، پھر  
حضرت عمرؓ کی رائے بھی ان کے موافق ہو گئی  
یہاں حضرت ابو بکرؓ نے کوئی مشورہ قبول  
نہیں کیا کیونکہ ان کے پاس نماز اور زکوٰۃ  
کے درمیان فرق کرنے والوں کے بارے  
میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم موجود  
تھا اور دین و احکام میں تبدیلی کرنے  
والوں کے بارے میں حکم موجود تھا کیونکہ



حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے

٦ ————— وحنان القرام

اصحاب مشورۃ عمر کہلوا کانوا

اوشبانا وکان وقافا عند

کتاب اللہ عزوجل (بخاری شریف ۱۰۹۶)

سپر انداز ہونے والے خلیفہ تھے۔

امام بخاری کے اس ترجمۃ الباب سے کئی باتیں ثابت ہوتی ہیں سب سے

پہلے جز میں امام بخاری نے یہ واضح فرمایا ہے کہ مشورے کیلئے قرآن کریم میں

دو آیتیں ہیں ایک آیت کا تعلق امت سے ہے کیونکہ اس آیت میں امر ہم

شوری فرمایا گیا ہے اور ہو کی ضمیر مومنین کی طرف لوٹ رہی ہے، اس کا مفہوم

یہ ہوا کہ قرآن کریم نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنے تمام اہم معاملات مشورے

کے ذریعے طے کریں، اسی آیت کو امام بخاری نے مقدم ذکر فرمایا ہے، اور دوسری آیت

کا تعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے کیونکہ اس دوسری آیت میں شاوہر

صحیفہ امر کے مخاطب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، اس آیت کو امام بخاری

نے مؤخر ذکر کیا ہے۔

پھر امام بخاری رحمہ اللہ نے واضح کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے

جو مشورہ کا حکم ہے وہ بھی پیغمبر علیہ السلام کے عزم فرمانے سے پہلے اور حکم خداوندی کی وضاحت سے پہلے ہے، اگر پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام مشورے کے بعد کوئی عزم فرمائیں، یا مشورے کے دوران وحی علی یا وحی خفی سے صورت حال واضح ہو جائے تو مشورہ کی نہ صرف یہ کہ ضرورت نہیں رہتی بلکہ مشورہ جائز ہی نہیں رہتا، وحی کے ذریعہ صورت حال کی وضاحت کے بعد مشورہ کی ضرورت کا باقی نہ رہنا تو ظاہر ہے اس لئے امام بخاری نے اس پر مستقل کوئی دلیل قائم نہیں کی، البتہ پیغمبر علیہ السلام کے عزم کے بعد مشورہ جائز نہ ہونے کو امام بخاری سورہ حجرات کی آیت۔

یا ایہا الذین امنوا لا تقدوا  
اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول  
بین یدی اللہ ورسولہ (سورہ حجرات آیت ۱)

سے ثابت فرماتے ہیں، یا یہ کہنا چاہئے کہ امام بخاری وحی کے ذریعہ وضاحت، اور عزم کے قائم ہونے کے بعد، دونوں ہی صورتوں میں مشورہ جائز نہ ہونے کو اس آیت ہی سے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی آ جائے یا آپ عزم فرمائیں تو اب مشورہ دینا، خدا اور رسول کے سامنے پیش قدمی کی جرأت کرنا ہے جس کی قرآن کریم میں ممانعت ہے، امام بخاری رحمہ اللہ کا یہ مضبوط استدلال بتلا رہا ہے کہ وہ فاذا عنمت کو ان معنی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت شمار کر رہے ہیں کیونکہ اگر معاملہ کسی دوسرے امام یا امیر کا ہو تو اس کے عزم کے باوجود مشورہ دینے میں خدا اور رسول کے مقابلے پر پیش قدمی کی جرأت کا الزام مائد نہیں تھا۔ دوسرے جزیں میں امام بخاری نے پیغمبر علیہ السلام کے عزم فرمالینے کے بعد مشورہ کی ممنوعیت پیش قدمی کی جرأت کرنے کی مثال دی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے غزوہ احد کے موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا کہ مدینہ کے اندر رہ کر دشمن کا انتظار کرنا چاہئے یا باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہئے؟ صحابہ کرام کی اکثریت نے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کی رائے دی، اس کی تفصیل معلوم ہو چکی ہے کہ یہ آپ کی رائے کے خلاف تھا، لیکن آپ نے اکثریت کی رائے کے مطابق جب عزم فرمایا تو اب صحابہ نے عرض کیا کہ آپ اپنی رائے کے مطابق مدینہ میں مقیم رہ کر مقابلہ فرمائیں، تو آپ نے عزم فرمانے کے بعد اس درخواست یا مشورہ پر توجہ نہیں دی بلکہ یہ فرمایا کہ پیغمبر کیلئے مسلح ہونے کے بعد ہتھیار رکھوں دینا درست نہیں ہے، گویا آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ مشورے کی منزل گزر چکی ہے عزم کرنے کے بعد مشورہ قبول نہیں کیا جائیگا۔

تیسرے حزم میں امام بخاری نے تبیین وحی کے ذریعہ صورت حال کی وضاحت کی مثال پیش کی ہے کہ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر الزام کا افسوسناک واقعہ پیش آیا تو آپ نے اس سلسلہ میں حضرت اسامہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے مشورہ فرمایا، ابھی آپ ان حضرات کے مشوروں پر غور ہی فرما رہے تھے کہ قرآن کریم حضرت عائشہ کی برأت سے متعلق نازل ہو گیا تو آپ نے مشورہ کے اندر پائی جانے والی متضاد باتوں سے صرف نظر فرما کر الزام تراشی کرنے والوں پر صدقہ جاری فرمادی، معلوم ہوا کہ زیر مشورہ مسئلہ سے متعلق اگر حکم خداوندی کا نزول ہو جائے تو مشورہ ختم ہو جائیگا اور حکم خداوندی کے مطابق عمل کرنا ضروری ہوگا۔

یہ بات بھی بالکل ظاہر ہے کہ یہ صورت بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ خاص ہے کیونکہ مشورہ کے دوران حکم خداوندی کا نزول پیغمبر علیہ السلام پر ہی ممکن ہے آپ کے بعد یہ صورت پیش نہیں آئے گی، ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی صورت میں قرآن و

حدیث کے حکم کی طرف ذہن مبذول نہ ہونے کے سبب مشورہ کیا جا رہا ہو اور اہل مشورہ میں سے کسی کا ذہن ادھر منتقل ہو جائے تو حکم خدا یا حکم رسول سامنے آنیکے بعد مشورہ ختم ہو جائیگا جیسے سقیفہ بنو ساعدہ میں خلیفہ کے انتخاب کے سلسلے میں ہاجرین و انصار مشورہ کے لئے جمع ہوئے، انصار بھی اپنے آپ کو خلافت کا مستحق سمجھ رہے تھے لیکن جب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد الاثمۃ من قریش سنایا تو انصار نے فوراً اس حکم کو قبول فرمایا

چوتھے جز میں امام بخاری، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد، خلافت راشدہ میں مشورہ کی نوعیت کو واضح فرما رہے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خلفاء راشدین کا معمول یہ رہا کہ وہ غیر منصوص اور مباح معاملات میں دیانت و امانت کے حامل اہل علم اکابر سے مشورہ کرتے تھے تاکہ ان معاملات میں شریعت کی عطا کردہ یُسرو سہولت کی روش کو اختیار کر سکیں، چنانچہ مشورہ کے دوران جب کتاب و سنت کا حکم واضح طور پر سامنے آجاتا تو اس کو مضبوطی کے ساتھ اختیار کر لیتے اور کسی دوسری جانب قدم نہ بڑھاتے کیونکہ ان کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی اسوہ تھا۔

اس چوتھے جز میں خلفاء راشدین کا معمول بیان کرتے ہوئے امام بخاری رحمہ اللہ نے عزم کا تذکرہ نہیں فرمایا، گویا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء راشدین یا ان کے بعد آنے والے امام اور امیر کے بارے میں امام بخاری کی رائے یہ نہیں ہے کہ وہ اگر مشورہ کے دوران یا مشورہ کے بعد کوئی عزم کر لیں تو وہاں بھی مشورہ دینے والوں کو پیش قدمی کی اجازت نہ ہوگی، بلکہ یہاں امام بخاری کے

نزدیک صرف ایک ہی راستہ ہے کہ پیش آمدہ صورت حال اگر مباح امور سے تعلق رکھتی ہے تو اب اہل مشورہ ماجعل علیک فی الدین من حرج اور الدین بسر کی عام تسہیلات کے مطابق تبادلہ خیال کریں گے اور کوشش کریں گے کہ کتاب و سنت سے اس تازہ صورت حال کا حکم معلوم کریں، اور پروردگار عالم نے چونکہ دین اسلام کی تکمیل کا اعلان فرمادیا ہے اس لئے ضرور کتاب و سنت کی رہنمائی حاصل ہو جائے گی جیسا کہ خلافت راشدہ کے دور میں ہوتا رہا ہے۔

گویا امام بخاری کے نزدیک مشورہ طلب امور میں فیصلہ کی صورت امیر کا عزم نہیں، کتاب و سنت کی طرف مراجعت ہے، البتہ یہ ضرور ہے کہ امام بخاری نے یہاں کتاب و سنت کی طرف رجوع کرنے کا طریقہ بیان نہیں فرمایا، نہ یہاں اس کا موقع تھا بلکہ سچ پوچھئے تو امام بخاری کے تراجم ابواب کتاب و سنت کی طرف رجوع کرنے کی تفصیلات ہی پر مشتمل ہیں کہ وہ ایک ایک روایت سے دس دس اور بیس بیس مسائل کا استنباط فرماتے ہیں اور یہ کام ائمہ مجتہدین نے پوری بیدار مغزی سے انجام دیدیا ہے کہ کس طرح تازہ صورت حال کو قرآن و حدیث کے سامنے پیش کر کے حکم معلوم کیا جاتا ہے، امام بخاری نے اس کی تفصیل تو نہیں کی البتہ انھوں نے اس ترجمہ کے پانچویں جز میں تازہ صورت حال میں حکم معلوم کرنے کی ایک مثال پیش کی ہے۔

اس پانچویں جز میں فرماتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں مانعین زکوٰۃ کا مسئلہ پیش آیا، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا موقف یہ تھا کہ ان کے مقابلہ میں جہاد کرنا چاہئے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا موقف دوسرا تھا، حضرت عمر نے اپنے نقطہ نظر پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث

سے استدلال کیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے تمام انسانوں سے قتال کا حکم دیا گیا ہے یہاں تک کہ وہ کلمہ توحید کا اقرار کر لیں، جب وہ اقرار کر لیں تو اپنی جان و مال کو محفوظ کر لیا گویا کلمہ توحید کے اقرار کے بعد کسی انسان کے جان و مال سے تعرض جائز نہیں اور ان کے مقابلہ پر جہاد و قتال کی گنجائش نہیں، لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن دو چیزوں یعنی نماز اور زکوٰۃ کو ایک جگہ جمع فرمایا ہے میں ان دونوں کے درمیان فرق کرنے والوں سے ضرور قتال کروں گا، پھر حضرت ابوبکر صدیق کے اس نقطہ نظر سے حضرت عمر بھی متفق ہو گئے، امام بخاری فرماتے ہیں کہ چونکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس صلوٰۃ و زکوٰۃ کے درمیان فرق کرنے والوں کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم موجود تھا اس لئے حکم رسالت کے سامنے انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشورے کو اہمیت نہیں دی، کیونکہ مانعین زکوٰۃ دین اور اس کے احکام میں تبدیلی چاہتے تھے، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا ہے کہ جو اپنا دین تبدیل کرے اس کو قتل کر دیا جائے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے مانعین زکوٰۃ کے بارے میں یہ تفصیل خلفہ راشدین کے بارے میں ذکر کردہ طرز عمل کی مثال میں پیش کی ہے، خلفہ راشدین کا طرز عمل یہ رہا ہے کہ وہ مشورے میں کتاب و سنت کی طرف رجوع کرنے کے علاوہ کوئی اور راہ اختیار نہیں فرماتے تھے، یہاں امام بخاری عزم کا تذکرہ نہیں کرتے، یعنی مشورے کے باب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی تفصیل میں انہوں نے فرمایا و ان المشورۃ قبل العزم والتبیین کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں



مشورہ، آپ کے عزم فرمانے سے پیشتر، یا صورتِ حال کی وحی جلی یا خفی کے ذریعہ وضاحت سے پیشتر دیا جاسکتا ہے، اگر آپ عزم فرمائیں یا صورتِ حال وحی سے واضح ہو جائے تو مشورہ کی بات ختم ہو جائے گی۔

لیکن امام بخاری جب مشورے کے باب میں خلفائے راشدین کے عمل کی تفصیل کرتے ہیں تو وہاں عزم کا ذکر نہیں کرتے بلکہ صرف یہ فرماتے ہیں کہ مباح اور غیر منصوص امور میں اہل علم سے مشورہ اس لئے کیا جاتا تھا کہ شریعت کا آسان حکم معلوم ہو جائے اور فاذا وضع الکتاب والسنة ليعتدوا الی غیرہ یعنی جب کتاب و سنت کا حکم واضح ہو جاتا تو پھر کسی دوسری جانب قدم نہ بڑھاتے جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوٰۃ کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم سامنے آنے کے بعد کسی جانب التفات نہیں فرمایا۔

جب خلفاء راشدین بھی نئے مسائل میں صرف کتاب و سنت ہی کی جانب رجوع کرنا ضروری سمجھتے ہیں تو ان کے بعد آنے والے امام دامیر بھی مشورہ میں اسی کے پابند ہیں کہ اہل مشورہ سے کتاب و سنت میں پائے جانے والے حکم کی تلاش میں مدد لیں اور جب تفصیل یا اجمال سے حکم مل جائے تو اسی کے مطابق عمل اختیار کریں چھٹے جز میں امام بخاری نے ارباب مشورہ کے اوصاف، اور مشورہ لینے والے کے آداب کی طرف توجہ کی ہے، فرمایا ہے کہ حضرت عمرؓ کی شوریٰ میں عمر کی قید نہیں تھی بلکہ وہ قرآن کریم کا زیادہ علم رکھنے والوں کو شوریٰ کے لئے منتخب فرماتے تھے اور خود ان کا طرز عمل یہ تھا کہ وہ قرآن کریم کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم فرماتے رہے۔

امام بخاری کے ترجمہ الباب میں دئے گئے اجزاء پر تفصیلی کلام اس لئے کیا گیا تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ مشورے کے بارے میں امت اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان فرق ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے ذریعہ وضاحت یا عزم قائم فرمانے کے بعد مشورہ نہیں فرمائیں گے، البتہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت اگر کسی تازہ اور نئی صورت حال سے دوچار ہو جائے تو اس کے لئے قرآن و حدیث ہی کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے، اس کے علاوہ ان کے لئے کوئی دوسری راہ نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

## کتابِ سنت کی طرف مراجعت کا طریقہ

گویا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جو حیثیت اور طاقت آپ کی ذات کو حاصل تھی آپ کے بعد وہی طاقت اب سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے، قرآن کریم میں بھی یہ بات تصریح کے ساتھ موجود ہے کہ عام حالات میں بھی اور اختلافِ رائے کی صورت میں بھی قرآن کریم اور سنتِ رسول کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے، ارشاد باری ہے۔

یا ایہا الذین امنوا اطیعوا اللہ	اے ایمان والو! اللہ کا حکم مانو اور ان
واطیعوا الرسول واولی الامر	اولو الامر کا جو تم میں سے ہوں، پھر اگر
منکم فان تنازعتم فی شئ	کسی چیز میں اولو الامر سے اختلاف ہو جائے
فردوہ الی اللہ والرسول	تو اس سلسلے میں اللہ اور رسول کی طرف

ان کنتو توؤمنون بالله والیوم  
الاخر، ذلک خیر واجسن تاویلاً

(سورة النساء آیت ۵۹)

رجوع کرو اگر تم اللہ پر اور قیامت کے  
دن پر یقین رکھتے ہو، یہ بات بہت  
اچھی ہے اور اس کا انجام بہت بہتر ہے

آیت پاک میں حکم دیا جا رہا ہے کہ اہل ایمان اللہ کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
وسلم کی اطاعت کریں اور اگر کسی معاملہ میں اختلاف کی صورت پیدا ہو جائے تو  
اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی طرف رجوع کریں، ظاہر ہے کہ یہ اختلاف اللہ اور  
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ہوگا بلکہ اختلاف صرف اولوالامر سے ہوگا،  
اس کا مفہوم یہ ہوا کہ اگر کسی معاملہ میں خفا ہو، یا حکم خداوندی اور حکم رسالت کی  
جانب ذہن کی رسائی نہ ہو یا صورت حال واقعہ بالکل نئی ہو اور اس کا حکم منصوص  
نہ ہو اور اختلاف کی نوبت آجائے تو یہ اختلاف کسی بھی صورت میں ہوا اس کا  
علاج صرف ایک ہی ہے کہ اس پیش آمدہ صورت حال میں کتاب اللہ اور  
سنت رسول اللہ کی طرف رجوع کیا جائے۔

## امام ابو بکر جصاص رحمہ اللہ کا ارشاد

امام ابو بکر جصاص، اس آیت کے تحت اپنی مشہور تفسیر احکام القرآن  
میں لکھتے ہیں۔

والرد الى الكتاب والسنة  
یکون من وجهين احدهما

کتاب و سنت کی طرف مراجعت کی  
دو صورتیں ہیں، ایک صورت تو ہے کہ

الى المنصوص عليه المذکور باسمه  
ومعناه ، والثاني الرد اليهما  
من جهة الدلالة عليه واعتباره  
به من طريق القياس والنظائر  
وعوم اللفظين ينتظر  
الامرین جميعا فوجب اذا  
تنازعنا في شيء الرد الى  
نص الكتاب والسنة ان  
وجدنا المتنازع فيه  
منصوصا على حكمه في  
الكتاب والسنة وان لم نجد  
فيه نصا منهما وجب رده  
الى نظيره منهما لانا  
مأمورون بالرد الى محل حال  
( احكام القرآن ۲/۲۱۲ )

اس حکم کی طرف مراجعت کیا جائے جو لفظ  
و معنی دونوں حیثیت سے نص میں مذکور ہو  
دوسری صورت یہ ہیکہ قیاس اور نظائر کے  
طریقوں میں سے کسی طریقہ کے استعمال  
اور دلالت کی کسی قسم کے طور پر کتاب و  
سنت کی طرف مراجعت کی جائے اور دال اللہ  
اور دال الرسول کے الفاظ کا عموم دونوں  
ہی صورتوں کو شامل ہے اسلئے اگر کسی  
معاملہ میں اختلاف ہو تو ہمارے لئے کتاب  
و سنت کی نصوص کی طرف مراجعت ضروری  
ہے اگر اختلافی مسئلہ کا حکم کتاب و سنت  
کی نصوص میں مل جائے تو بہتر ہے اور اگر  
نص میں نہ ملے تو کتاب و سنت کی نظر کی  
طرف مراجعت ضروری ہوگی اسلئے کہ ہمیں  
ہر صورت حال میں کتاب و سنت ہی کی طرف  
مراجعت کا حکم دیا گیا ہے۔

امام ابو بکر جصاص المتوفی ۳۷۹ھ نے فرمایا کہ کتاب و سنت کی طرف مراجعت  
کی دو صورتیں ہیں پہلی صورت یہ ہے کہ خود اس مسئلہ ہی سے متعلق کتاب و سنت  
میں تصریح پائی جاتی ہو، اس صورت میں ظاہر ہے کہ حکم خداوندی یا حکم رسالت ہی کی

نہیں ضروری ہوگی، حکم صریح نہ ہو تو ایسی صورت میں بھی کتاب و سنت ہی کی طرف مراجعت کی جائے گی مگر اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ قرآن فہمی کے معتبر طریقوں میں سے کسی طریقہ کے مطابق استدلال کیا جائیگا یا قیاس کے ذریعہ حکم معلوم کیا جائیگا، امام ابو بکر نے اس جگہ پر دو لفظ استعمال کئے ہیں ایک من جملۃ الدلالة علیہ جس کے معنی یہ ہیں کہ وجوہ استدلال میں سے کسی معتبر طریق استدلال کی بنیاد پر حکم معلوم کیا جائے، اور دوسرا لفظ ہے واعتباراً بہ من طریق القیاس والنظائر کہ حکم منصوص کی علت کا استخراج کر کے، حکم کو علت کے ساتھ متعدی کیا جائے، امام ابو بکر فرماتے ہیں کہ کتاب و سنت کی طرف ہر حال میں مراجعت کا حکم عام، ان دونوں ہی صورتوں کو شامل ہے، اس لئے اگر کسی تازہ صورت حال میں اختلاف واقع ہو تو کتاب و سنت ہی کی جانب رجوع کرنا ضروری ہوگا، اگر مسئلہ کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ میں منصوص مل گیا تو اس کے مطابق عمل کیا جائے گا، اور اگر کتاب و سنت میں صریح نص نہ مل سکی تو کتاب و سنت کے احکام کو قابل اعتماد طریقوں کے مطابق متعدی کیا جائے گا، اس کے علاوہ کوئی اور صورت اختیار نہیں کی جائے گی، کیونکہ ہمیں ہر حال میں کتاب و سنت ہی کی طرف رجوع کا حکم دیا گیا ہے۔

## مُفَسِّرِ قُرْآنِ قَاضِی بَیضاوی کا ارشاد

اس موضوع سے متعلق قاضی بیضاوی کا تفسیری نوٹ بھی ملاحظہ فرمایا جائے وہ بھی اس آیت کے تحت لکھتے ہیں۔

فان تنازعتموا شئاً  
اولوالا امر منكم في شئ من  
امور الدين فردوه فراجعوا  
فيه الى الله الحى كتابه  
والرسول بالسوال عنه في  
زمانه والمراجعة الى  
سنته بعده۔

(بیضاوی سورۃ النساء ۵۹)

پھر اگر تمہارے اور اولوالا امر کے درمیان  
دینی امور میں سے کسی چیز میں اختلاف  
ہو جائے تو اس سلسلے میں اللہ کی طرف  
یعنی اس کی کتاب کی طرف مراجعت کرو  
اور رسول کی طرف یعنی رسول کی زندگی  
میں ان سے سوال کر کے مراجعت، اور  
وفات کے بعد ان کی سنت کی طرف  
مراجعت کرو۔

اولوالا امر سے اختلاف رائے کی صورت میں اللہ اور رسول کی طرف مراجعت  
کا طریقہ کیا ہے، اس کو قاضی بیضاوی نے سوال و جواب کے انداز میں بیان  
کیا ہے۔

واستدل به منكر والقياس  
وقالوا انه تعالى اوجب رد  
المختلف الى الكتاب والسنة  
دون القياس واجيب بان  
رد المختلف الى المنصوص عليه  
انما يكون بالتمثيل والبناء  
عليه وهو لقياس  
ويؤيد ذلك الامر به

اس آیت سے منکرین قیاس نے استدلال  
کیلئے اور کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اختلافی  
معاملات میں صرف اللہ اور رسول کی طرف  
مراجعت کا حکم دیا ہے قیاس کا نہیں،  
مگر اس کا جواب یہ ہے کہ اختلافی چیزوں  
میں منصوص علیہ کی طرف مراجعت کا طریقہ  
ایک نظیر پر دوسری نظیر کا قیاس کرنا یا  
قواعد کلیہ پر بنا کرنا ہے، اور اسی کو قیاس



کہتے ہیں اور اس کی تائید اس طرح ہوتی ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کے بعد مستقلاً اس مراجعت کا حکم دیا گیا ہے جس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ احکام تین طرح کے ہیں ایک وہ جو کتاب اللہ سے ثابت ہوں دوسرے وہ جو سنت سے ثابت ہوں اور تیسرے وہ جو قیاس کے طور پر کتاب و سنت کی طرف مراجعت سے ثابت ہوں۔

بعد الامر بطاعة الله تعالى  
وطاعة الرسول صلى الله عليه  
وسلم فانه يدل على ان  
الاحكام ثلاثة مثبت  
بالكتاب ومثبت بالسنة  
ومثبت بالرد اليهما  
على وجه القياس -

(بيضاوی جلد دوم سورۃ النساء)

اس عبارت میں قاضی بیضاوی نے اختلافی معاملات میں کتاب و سنت کی طرف مراجعت کا جو طریقہ بیان کیا ہے، اس میں دو لفظ استعمال کئے ہیں ایک بالتفہیل اور دوسرے بالبناء علیہ۔ پہلے لفظ بالتفہیل کی مراد وہی ہے جو احکام القرآن میں امام ابو بکر جصاص نے وجہ ردّ الی نظیرہ منہا میں بیان کی ہے یعنی یہ دیکھا جائیگا کہ کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ میں اس کی کوئی نظیر ملتی ہے یا نہیں، اگر نظیر ملتی ہے تو ضروری ہوگا کہ کتاب و سنت کا حکم اس سلسلے میں قبول کر کے اختلاف ختم کر دیا جائے دوسرے لفظ بالبناء علیہ میں قاضی بیضاوی نے ایک اور بات کہی ہے جو امام ابو بکر جصاص کے کلام میں مذکور نہیں تھی، اس کا مفہوم یہ ہے کہ اختلافی مسائل کی بنا قرآن و حدیث پر کی جائے، بنا کی دو صورتیں ہیں ایک حکم منصوص کی علت کا استخراج کر کے، علت کا تعدیہ کرنا، اور جہاں علت

پائی جائے وہاں حکم ثابت کر دینا، دوسرے یہ کہ قرآن و حدیث میں جو کئی قواعد اور اصولی ضابطے بیان کئے گئے ہیں، اختلافی مسائل کو ان قواعد میں سے کسی کے ذیل میں لاکر اس کا حکم معلوم کرنا۔

امام ابو بکر اور قاضی بیضاوی کے ارشادات سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ اختلافی معاملات میں، یعنی جن معاملات میں خود اولوالامر کے درمیان اختلاف ہو جائے، یا عوام اور اولوالامر کے درمیان، یا امیر اور اولوالامر کے درمیان اختلاف ہو جائے وہاں اولوالامریہ امیر کی رائے کی جانب مراجعت کی کوئی ہدایت نہیں ہے، بلکہ ان تمام معاملات میں صرف ایک ہی حکم ہے کہ کتاب و سنت کی جانب رجوع کیا جائے۔

اس کی عملی صورت یہ ہوگی کہ ارباب حل و عقد یا اہل مشورۃ بیٹھیں اور طے کریں کہ اس غیر منصوص جزئیہ کو قرآن و حدیث کی روشنی میں کیسے حل کیا جائے، واضح رہے کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں ائمہ مجتہدین یا ان کے مقلدین نے جو جزئیات قلم بند فرمادئے ہیں ان کی طرف مراجعت بھی بلا شک کتاب و سنت کی طرف مراجعت ہی کہلاتی ہے، اور ان حضرات کا اہمیت مرحومہ پر احسان ہے کہ انھوں نے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں غیر منصوص جزئیات کا حکم کتاب و سنت کی روشنی میں بیان فرما کر اسلام کی ہدایت کا منہ بولتا ثبوت پیش کر دیا ہے۔

## علامہ شاطبیؒ کے ارشاداتؒ

اختلافی مسائل میں قرآن و سنت، یا قرآن و سنت کی روشنی میں مرتب کردہ فقہی جزئیات ہی کی طرف مراجعت ضروری ہے اور اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اسکے علاوہ کوئی اور راہ اختیار کرنے کی مسلمانوں کو ضرورت ہی نہیں، اس موضوع پر علامہ شاطبیؒ موافقات میں لکھتے ہیں۔

قرآن و سنت میں، قواعد شریعت مکمل کر دئے گئے ہیں اور کوئی چیز ان سے چھوٹ نہیں پائی ہے اور استقراء سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔

قد اتممت قواعد الشریعة فی القرآن والسنة فلو یتخلف عنها شیء ولاستقل ربین ذلك (الموافقات ۱/۱۶)

یعنی قرآن و حدیث میں ہر ضرورت کی تکمیل کر دی گئی ہے، اس مضمون کو مثال سے واضح کرنے کیلئے علامہ شاطبیؒ نے مزید چند لائنوں کے بعد لکھا ہے چنانچہ قرآن کریم نے تیمم، نماز قصر اور سفر میں افطار وغیرہ سے متعلق جو بعض جگہ تفصیلی کلام کیا ہے اگر اس سے کام چلتا ہو تو ٹھیک ورنہ وہ نصوص جن میں رفع حرج کا اصول بیان کیا

فالقرآن ان نص علی بعض التفاصيل كالتميم والقصر ذاك والاف النصوص علی رفع الحرج فیہ کافیة وللمجتهد اجراء القواعد

والترخص بحسبہا۔

(الموافقات ۱/۱۲)

کیا ہے ان سے حکم معلوم کیا جائے اور  
مجتہد کیلئے جائز ہوگا کہ قاعدہ کلیہ کا اجراء  
کر کے رخصت پر عمل کر نیک حکم بیان کرے

اس عبارت میں یہ مضمون بالکل واضح ہے کہ تیمم، قصر اور افطار کے بارے  
میں جو تفصیلات منصوص ہیں اگر ان سے صورت مسئلہ میں حکم واضح نہ ہو تو ما  
جعل علیکم فی الدین من حرج کا قاعدہ کلیہ جاری کر کے رخصت کے احکام  
بیان کئے جائیں گے، البتہ یہ کام عوام یا عام علماء کا نہیں ہے، بلکہ اس اجراء  
کے لئے قوت اجتہاد کی ضرورت ہے، قواعد کلیہ پر جزئیات کی تطبیق کے سلسلے  
میں علامہ شاطبی رحمہ اللہ نے الاعتصام میں اس سے زیادہ تفصیلی کلام  
کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

ان الله انزل الشريعة على  
رسوله صلى الله عليه وسلم  
فيها تبیان كل شیء یحتاج  
الیہ الخلق فی تکالیفهم  
التي امروا بها وتعبدوا لهم  
التي طوقوها فی اعناقهم  
ولرحمت رسول الله صلى  
الله عليه وسلم حتی  
كمل الدین بشهادة

بے شک اللہ تعالیٰ نے شریعت کو  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس  
طرح نازل کیا ہے کہ اس میں ہر وجہ  
بیان کر دی گئی ہے جس کی مخلوق کو،  
خدا کی بیان فرمودہ ذمہ داریوں کی  
انجام دہی اور اللہ کی مقرر فرمودہ  
عبادتوں کی ادائیگی میں ضرورت تھی  
سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات  
بھی اس وقت تک نہیں ہوئی جب تک

دین مکمل نہیں ہو گیا، خود اللہ تعالیٰ نے اس کی شہادت دی ہے، کیونکہ ارشاد فرمایا ہے کہ: آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا، اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو دین کے طور پر قبول کرنے سے میں راضی ہوں۔ اب اگر کوئی شخص یہ گمان کرتا ہے کہ دین میں کوئی کمی باقی رہ گئی ہے تو وہ باری تعالیٰ کے تکمیل دین کے ارشاد کی تکذیب کر رہا ہے۔

تکمیل دین کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کو فرائض منصبی کی ادائیگی اور عبادت کی بجا آوری میں جن احکام کی ضرورت تھی وہ سب مکمل طور پر نازل کر دیے گئے ہیں، اگر کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ ابھی کچھ بیان کرنا باقی ہے تو وہ گویا ایوم اکملت لکم دینکم کا منکر ہے۔

اس کے بعد علامہ شاطبی نے ایک سوال اٹھایا ہے کہ تازہ واقعات اور نئے مسائل کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ منصوص نہیں ہیں اور کتنے ہی اجتہادی مسائل ایسے دکھلائے جاسکتے ہیں جن میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی نصوص میں حکم نہیں ہے تو کیسے یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ انسانی ضروریات کی حد تک تمام چیزوں کا بیان شریعت میں ہو چکا ہے، لیکن

اللہ تعالیٰ بذلک حدیث  
قال تعالیٰ ( ایوم اکملت  
لکم دینکم و اتممت  
علیکم نعمتی و رضیت  
لکم الاسلام دینا )  
فعل من زعم انه  
بقی فی الدین شیء  
فقد کذب بقولہ  
( ایوم اکملت لکم دینکم )

( الاعتصام ص ۳۰۵ )

اس کا جواب دیتے ہیں۔

وان قوله تعالى اليوم  
اُكملت لكم دينكم  
اعتبرت فيها الجزئيات  
من المسائل والنوازل فهو  
كما اردتم ولكن المراد  
حلياتها، فلو سبق للدين  
قاعدة يحتاج اليها  
في الضروريات والحلجات  
او التكميلات الا وقد  
بينت غاية البيان  
نعو يبقی تنزيل الجزئيات  
على تلك الحليات  
موحوا لا الى نظر المجتهد

اور ارشاد خداوندی ایوم اکملت لکم  
دینکم سے اگر مراد یہ لی جائے کہ تمام  
جزوی مسائل اور نئے حوادث کا  
تفصیلی حکم بیان کر دیا گیا ہو تو تمہارا  
اشکال درست ہو سکتا ہے لیکن تکمیل  
دین سے مراد کلیات کا بیان ہے چنانچہ  
دین کا کوئی قاعدہ ایسا نہیں جس کی  
انسانی ضروریات، حاجات یا تحسینات  
میں ضرورت پڑ سکتی ہو مگر یہ کہ وہ  
پوری طرح بیان کر دیا گیا ہے، ہاں  
اتنا ضرور ہے کہ جزوی احکام کو کلی  
قواعد پر تطبیق کا عمل باقی رہتا ہے  
اور یہ کام مجتہد کی قوت فکر و نظر پر  
موقوف ہے

اس کا خلاصہ یہ ہوا کہ غیر منصوص معاملات میں امرار کے عزم پر محمول کرنے  
کا مضمون کہیں نہیں ہے، بلکہ اولوالامر سے اختلاف پیش آجانے کی صورت میں  
امام ابو بکر جصاص، قاضی بیضاوی اور علامہ شاطبی کی عبارتوں سے یہ  
حقیقت ثابت ہوئی کہ قرآن و حدیث کی طرف مراجعت کے علاوہ اور کوئی



حل نہیں ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ مراجعت کا یہ عمل ان اہل علم کے ذریعہ انجام پائے جنہیں مراجعت کا سلیقہ ہو اور وہ شریعت کے احکام کے استنباط کا ایسا سلیقہ رکھتے ہوں جس پر اعتماد کیا جاسکے۔

## کتاب و سنت کی طرف مراجعت کے قابل اعتماد طریقے

مندرجہ بالا عبارتوں سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ کتاب و سنت کی طرف مراجعت کے کئی طریقے قابل اعتماد ہیں، مثلاً۔

① — سب سے پہلی اور واضح صورت تو یہ ہے کہ کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ میں یہ حکم صراحت کے ساتھ مل جائے، گویا ابتداءً ذہن اس کی طرف منتقل نہیں ہوا تھا، لیکن جب معاملہ اہل مشورہ کے درمیان آیا تو حکم صریح کی طرف رہنمائی ہو گئی۔

② — دوسری صورت یہ ہے کہ واضح الفاظ اور صریح حکم تو نہ ہو لیکن قرآن و حدیث کے الفاظ سے معنی مرادی پر دلالت کے جو معتبر طریقے قرار دئے گئے ہیں ان طریقوں میں سے کسی طریقے کے مطابق تازہ صورت حال کا حکم معلوم ہو جائے۔

③ — تیسری صورت یہ ہے کہ نہ واضح الفاظ ہوں نہ صریح حکم

والله اعلم

## خلافت راشدہ میں مشورہ کی نوعیت

امام بخاری رحمہ اللہ کے ترجمۃ الباب کے یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور امت کے دیگر امراء کے درمیان فرق ہے کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ بات ثابت ہے کہ آپ اس وقت مشورہ فرماتے تھے جب حکم شرعی واضح نہ ہو اور خود آپ کا عزم بھی قائم نہ ہوا ہو، آپ کا عزم قائم ہو جاتا یا حکم شرعی وحی جلی یا وحی خفی کے ذریعہ واضح ہو جاتا تو مشورہ قبول نہیں فرماتے تھے۔ جیسا کہ مثلاً غزوہ احد میں اپنی رائے کے خلاف اپنے خواب کی تعبیر سے صرف نظر فرماتے ہوئے اکثریت کی رائے کے مطابق عزم فرمایا تو اس کے بعد مشورہ قبول نہیں فرمایا، یا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں مشورے کے دوران، اُن کی پاک دامانی پر مشتمل وحی کا نزول ہو گیا تو مشورہ ترک فرما کر حکم شرعی نافذ کر دیا گیا۔

لیکن آپ کے بعد خلفائے راشدین اور دیگر امراء کی تاریخ ”عزم“ کے مضمون سے خالی ہے، وہاں امام بخاری صرف یہ فرماتے ہیں کہ خلفاء اہل علم سے مشورہ فرماتے اور کتاب و سنت کا حکم واضح ہو جاتا تو اس کے مطابق ہی عمل فرمایا کیا جاتا، اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں تھی، امام بخاری کے اسی ترجمہ البیان کے مطابق، قابل اعتماد مفسرین نے فردوۃ الی اللہ والرسول کے تحت یہی مضمون بیان کیا کہ تمام نزاعی معاملات کا حل، صرف کتاب و سنت کی طرف مراجعت کے ذریعہ تلاش کیا جائے گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ خلافت راشدہ میں عملی طور پر

کیا صورت رہی؟ کیا ایسا ہوا ہے کہ خلیفۃ المومنین نے عزم کر لیا تو سب اس کو تسلیم کر لیا؟ یا ایسا ہوا ہے کہ حکم شرعی کتاب و سنت میں تلاش کیا گیا اور اس کے مطابق عمل درآمد ہوا؟

## حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت

خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میمون میں مشورہ کی کیا نوعیت تھی، اس کے بارے میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

عن میمون بن مهران قال: کان ابو بکر اذا ورد علیہ الخصم نظر فی کتاب اللہ فان وجد فیہ ما یقضی بینہم قضی بہ وان لم یکن فی الكتاب وعلم من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ذلک الامر سنۃ قضی بہا فان اعیاء خرج فسأل المسلمین وقال: اتانی کذا وکذا فھل علمتم ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قضی فی ذلک بقضاء؟ فریما اجتمع الیہ النفر کلہم یدکر من

میمون بن مهران سے روایت ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے جب کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو وہ کتاب اللہ میں غور فرماتے اگر کتاب اللہ میں اس مقدمہ کے لئے کوئی چیز فیصلہ کن مل جاتی تو فیصلہ فرمادیتے، اگر کتاب اللہ میں کوئی چیز نہ ملتی اور اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت علم میں آتی تو سنت کے مطابق فیصلہ فرماتے اگر وہاں بھی ناکام رہتے تو مختلف لوگوں کے ملاقات فرماتے اور مسلمانوں کو پوچھتے کہ میرے پاس یا ایسا مقدمہ آیا ہے، کیا تمہارے علم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلہ میں کوئی فیصلہ فرمایا ہو، چنانچہ بسا اوقات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
فیہ قضاء فیقول ابو بکر  
الحمد للہ الذی جعل فینا  
من یحفظ علی نبینا فان اعیاء  
ان یجد فیہ سنتہ من رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم ۱۲۹  
الناس وخیارہم فاستشارہم  
فاذا اجتمع رایہم علی امر قضی بہ  
(حجۃ اللہ البالغین ص ۱۲۹)

ایسا بھی ہوا کہ ایک جماعت نے یہ بتلایا کہ  
ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس  
سلسلہ میں یہ فیصلہ فرمایا ہے، ایسی صورت  
میں حضرت ابو بکر فرماتے کہ الحمد للہ ہمارے  
درمیان ایسے افراد موجود ہیں جو حضور اکرم  
صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو محفوظ رکھتے  
ہیں، اگر اس طرح بھی سنت کے علم میں  
ناکام رہتے تو سربراہ اور منتخب صحابہ  
کرام کو جمع فرماتے اور ان سے مشورہ کرتے  
جب ان سب اہل مشورہ کا کسی ایک بات  
پر اتفاق ہو جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ  
فرما دیتے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو تفصیل دی گئی ہے وہ  
یہ نہیں ہے کہ انھوں نے مشورہ کر کے، اہل مشورہ کی رائے کو اہمیت نہیں دی  
یا اہل مشورہ ہی نے مشورہ کے بعد ان کو اختیار دے دیا کہ وہ اکثریت، اقلیت  
یا اپنی رائے میں سے کسی کے مطابق عزم فرمائیں۔ بلکہ صورت یہ ہے کہ ہر پیش آمدہ  
مسئلے میں سب سے پہلے خود قرآن و سنت کی جانب مراجعت فرماتے ہیں، اگر  
ناکام رہتے ہیں تو اہل علم سے خود رجوع فرماتے ہیں کہ کسی کے پاس اس سلسلہ  
میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہو تو بیان کرے، سنت مل جاتی ہے





عليه امر نظر في كتاب الله فان  
وجد فيه ما يقضي به قضى بينهم  
وان علمه من سنة رسول الله  
صلى الله عليه وسلم قضى به  
وان لم يعلم خرج فسال المسلمين  
عن السنة فان اعياه ذلك  
دعاه رسول المسلمين وعلماءهم  
واستشارهم وان عمر بن  
الخطاب كان يفعل ذلك

(فتح الباری ج ۱۳ ص ۲۸۵)

کتاب اللہ میں تلاش کرتے اگر اس میں  
کوئی فیصلہ مل جاتا تو وہ نافذ فرما دیتے  
اور اگر کچھ نہ ملتا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم  
کی سنت اس سلسلہ میں مل جاتی تو نافذ  
فرما دیتے اور اگر کچھ نہ ملتا تو علماء کرام ملاقات  
کرتے اور مسلمانوں سے سنت کے بارے میں  
معلوم کرتے، اگر اب بھی ناکام رہتے تو سر  
بر آوردہ مسلمانوں اور علماء کو بلا کر مشورہ کرتے  
اور حضرت عمر بن الخطاب بھی یہی عمل فرماتے  
تھے۔

علامہ ابن حجر کے بیان میں مشورہ کی تفصیلات نہیں ہیں کہ اقلیت، اکثریت  
اور اپنی رائے میں سے کیا چیز اختیار کی جاتی تھی، لیکن یہ بات امام بخاری کے حوالہ  
سے واضح کی جا چکی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر امراء کے درمیان فرق  
ہے، آپ کے یہاں عزم بھی ایک چیز ہے، لیکن دیگر امراء کے یہاں کتاب و سنت  
سے آگے بڑھنے کی گنجائش نہیں۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مشورہ محض اسلئے  
ہوتا تھا کہ کتاب و سنت کی رہنمائی حاصل ہو جائے اور اسی کے مطابق عمل کیا جائے  
یہ نشانہ نہیں تھا کہ مسئلہ کے مختلف پہلو سامنے آئیں اور پھر امیر کی حیثیت سے حسن جانب  
کو چاہیں ترجیح دیدیں، بلکہ یہاں یہ وضاحت بھی مناسب ہوگی کہ عہد خلافت میں  
اختلاف رائے کی صورت میں فیصلہ اکثریت کی بنیاد پر بھی شاذ و نادر ہی ہوا ہے ورنہ

عام طور پر یہ ہوا ہے کہ اہل مشورہ نے کسی ایک صورت پر اتفاق کر لیا ہے جسے اصطلاح میں اجماع کہتے ہیں، تاریخ التشریع الاسلامی میں علامہ خضریٰ بک نے، حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے مشورہ کا طریقہ ذکر کیا ہے اور وہی بات نقل کی ہے جو حجۃ اللہ البالغہ داری اور فتح الباری کے حوالہ سے ذکر کی گئی ہے اور اس کے بعد لکھا ہے :

حضرت ابو بکر اور حضرت عمر جب کسی معاملہ میں فقہاء کی جماعت سے مشورہ فرماتے اور یہ لوگ اس معاملہ میں کوئی رائے دیتے تو سب لوگ اس رائے کی موافقت کرتے اور کسی کو اس رائے سے اختلاف کا موقع نہ رہتا اور اس شکل میں رائے کے اظہار کو ”اجماع“ کہا جاتا ہے۔

کان الشیخان اذا استشارا  
جماعة فی حکم فاشاروا فیہ  
برائے تبعہ الناس ولا یسوغ  
لاحدا ان یخالفہ وسمی ابداء الرئی  
بہذا الشكل اجماعا۔

{ تاریخ التشریع الاسلامی  
ص ۱۲۹ مطبوعہ مصر }

اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ عام طور پر فیصلے کا طریقہ یہ ”اجماع سکوتی“ ہے کہ اہل مشورہ کو جمع کرنے کے بعد کوئی ایک بات منقح ہو گئی، عام طور پر لوگوں نے اس کے اتفاق کر لیا، اور مخالفت کسی نے نہیں کی۔

## حضرت ابو بکرؓ کے عہد خلافت کے چند واقعات کی صحیح تصویر

مندرجہ بالا وضاحت سے یہ بات بالکل منقح ہو جاتی ہے کہ خلافت راشدہ میں اہل مشورہ سے مشورہ کرنے کے بعد، فیصلہ کا انحصار امیر اور اس کے عزم پر نہیں ہے

بلکہ صورت یہ ہے کہ امیر بھی اہل مشورہ کے ساتھ شریک مشورہ ہے، اور تلاش یہ ہے کہ اس سلسلے میں کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ میں کاربہائی ملتی ہے، مجلس شوری میں جب ذہن حکم خداوندی یا حکم رسالت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے تو تمام ہی اہل مشورہ کا اتفاق رائے ہو جاتا ہے۔

مثلاً امیر کے عزم کا مضمون بیان کرنے والے بڑے اعتماد کے ساتھ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کے دو واقعات نقل کرتے ہیں، ایک مانعین زکوٰۃ کے ساتھ قتال کا مسئلہ ہے اور دوسرا حضرت اسامہؓ کے سریہ کی روانگی کا واقعہ، ان دونوں واقعات میں بڑے شد و مد کے ساتھ یہ ترجمانی کی جاتی ہے کہ یہ امیر کے عزم یا استبداد بالرائے کے واقعات ہیں کہ اہل مشورہ کی رائے قتال کی نہیں ہے، سریہ کی روانگی کی نہیں ہے، لیکن حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے شوری کے علی الرغم اپنے عزم کے مطابق فیصلہ فرمایا، لیکن باغ نظر علماء کے نقطہ نظر سے یہ حقیقت کی صحیح ترجمانی نہیں ہے بلکہ واقعات کی الٹی تصویر ہے ان دونوں واقعات میں بھی یہی ہوا ہے کہ مشورہ کیا گیا اور کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی روشنی میں جو حکم شرعی معلوم ہوا، اس پر عمل درآمد کیا گیا۔ تفصیلات میں نہ جاتے ہوئے صرف ایک مصنف کی عباتیں پیش ہیں، علامہ شاطبی الموافقات میں لکھتے ہیں۔

ولما منعت العرب الزكاة      حب کچھ اہل عرب نے زکوٰۃ کی اداگی  
عزم ابو بکر علی قتالہم      سے انکار کیا تو حضرت ابو بکر نے قتال  
فکلمہ عمر فی ذلک :      کا ارادہ فرمایا، حضرت عمر نے ان سے

فلو يلتفت الى وجه المصلحة  
في ترك القتال اذ وجد  
النص الشرعي المقتضي لخلافه  
وسألوه في رد اسامة  
ليستعين به وبمن معه  
على قتال اهل الردة فابى  
لصحة الدليل عنده بمنع  
رد ما انفذه رسول الله  
صلى الله عليه وسلم

(الموافقات للشاطبي ۱۹۵/۲۷)

اس سلسلے میں گفتگو کی، لیکن حضرت ابوبکر  
نے ترک قتال کی پیش کردہ مصلحت پر  
توجہ نہیں دی، کیونکہ حضرت ابوبکرؓ کے  
پاس ان مصلحتوں کے خلاف نص شرعی  
موجود تھی، اسی طرح حضرت اسامہؓ کے  
سریہ کی واپسی کا سوال کیا تاکہ ان سے  
اور ان کے رفقاء سے مرتدین سے قتال  
کے سلسلے میں مدد لی جائے تب بھی حضرت  
ابوبکرؓ نے انکار فرما دیا کیونکہ ان کے پاس  
سنت رسول کی صحیح دلیل موجود تھی کہ  
جس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
نافذ فرما چکے تھے وہ اس کو نہیں روک سکتے

گویا عہد صدیقی کے ان دونوں واقعات کی صحیح تصویر یہ نہیں ہے کہ حضرت  
ابوبکر صدیق کی رائے اور اہل مشورہ کی رائے میں اختلاف رہا ہو اور پھر حضرت  
ابوبکرؓ نے بحیثیت امیر اپنے عزم سے ایک جانب کو ترجیح دی ہو بلکہ ان واقعات  
کی صحیح تصویر یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قرآن اور حدیث کی روشنی  
میں فیصلہ کیا، حقیقت حال پر مطلع نہ ہونے کے سبب ابتداءً کچھ حضرات نے دوسرا  
مشورہ دیا، لیکن جب حضرت ابوبکر صدیق نے اپنے موقف کی تائید میں قرآن یا حدیث  
کو پیش فرمایا تو تمام صحابہ کرام کا اتفاق ہو گیا

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تو بلاشبہ افضل الصحابہ ہیں، ان کی زندگی کے واقعات کو امیر کے استبداد بالرائے کی نظیر میں پیش کرنا ان کے ساتھ انصاف نہیں ہے، امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی مانعین زکوٰۃ کے اس واقعہ کو حضرت ابو بکر صدیق کی زندگی میں کتاب و سنت کے احکام کی پیروی کی مثال میں پیش کیا ہے علامہ شاطبی حضرت ابو بکر صدیق ہی نہیں تمام صحابہ کرام کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں

وإننا نعلم أن الصحابة  
حصروا نظرهم في الوقائع  
التي لا نصوص فيها في  
الاستنباط والرد إلى ما فهموه  
من أصول الثابتة ولو  
يقول أحد منهم: إنني حكمت  
في هذا بكذا لأن طبعي  
مال إليه أو لأنه يوافق  
محبتی ورضائی، ولو قال  
ذلك لا شتد عليه النكير  
وقيل له: من أين لك  
أن تحكم على عباد الله  
بمحض ميل النفس وهوى  
القلب؟ هذا مقطوع ببطلانه

ہم یقین رکھتے ہیں کہ صحابہ کرام نے غیر منصوص واقعات میں، اپنی نظر کو، کتاب و سنت سے ثابت شدہ اصول کی جانب مراجعت ہی میں منحصر رکھا ہے ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ میں نے یہ فیصلہ اس لئے کیا ہے کہ میری طبیعت کا میلان یہ تھا یا یہ بات میری محبت اور رضا کے مطابق ہے اور اگر کسی نے یہ بات کہی ہوتی تو اس پر صحابہ کی جانب ہی سے شدید نکیر کی جاتی اور کہا جاتا کہ یہ حق آپ کو کہاں پہنچتا ہے کہ اللہ کے بندوں پر محض طبعی میلان اور خواہش نفس کے مطابق حکم لگائیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں

یہ گمان یقیناً باطل ہے۔

(الاعتصام ۱۵)

علامہ شاطبی رحمہ اللہ نے صرف جلیل القدر صحابہ ہی نہیں، تمام صحابہ کرام کے بارے میں یہ فرمایا کہ غیر منصوص معاملات کا حکم معلوم کرنے کے لئے ان سب کا طریقہ کار صرف کتاب و سنت کی طرف مراجعت ہے، اپنے ذاتی میلان یا طبعی رجحان کے مطابق فیصلہ ان بزرگوں کی زندگی میں نہیں ہے، اور اگر بالفرض ایسا ہوا ہوتا تو ضروری تھا کہ ان بزرگوں ہی کی جانب سے اس کی تردید بھی ہو گئی ہوتی۔ علامہ شاطبی نے الاعتصام میں کئی صفحات اس موضوع پر قلمبند فرمائے ہیں کہ شریعت میں فیصلے کا انحصار دلائل شرعیہ یعنی کتاب و سنت پر ہے، افراد پر نہیں ہے، اور اس موضوع پر کلام کرتے ہوئے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد مبارک کے ان دونوں واقعات کی صحیح ترجمانی بھی آگئی ہے اس لئے یہاں ان کی عبارت کا مختصر ترجمہ پر اکتفا کیا جاتا رہا ہے۔ فرماتے ہیں۔

گزشتہ مضامین کا خلاصہ یہ ہے کہ افراد حکم شرعی معلوم کرنے کا ذریعہ ہیں، احکام شرعیہ کے علم میں واسطہ ہونے کی جہت سے صرف نظر کر کے افراد کو معیار قرار دینا ہی ضلال کہلاتا ہے کیونکہ حجت قطعی اور حاکم اعلیٰ صرف شریعت ہے پھر ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا مذہب یہی ہے، جس شخص نے ان کی سیرت کا مطالعہ کیا ہے اور ان کے احوال پڑھے ہیں وہ یقیناً صحابہ کرام کے اس انداز سے واقف ہوگا، غور کا مقام ہے کہ سقیفہ بنو ساعدہ میں امارت کے مسئلہ میں نزاع ہے حتیٰ کہ بعض انصاریہ فرما رہے ہیں کہ ایک امیر ہم میں سے ہوگا اور ایک امیر ہم میں سے ہوگا، لیکن جب ان کے سامنے حضور اکرم



صلی اللہ علیہ وسلم یہ ارشاد آیا کہ اگر آپ نے کسی سے ہوں گے تو انہوں نے فوراً اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور دوسرے نقطہ نظر کی جانب التفات نہیں فرمایا، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ حق انسانوں کی رائے پر مقدم ہے اور جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوٰۃ سے قتال کا ارادہ کیا تو بعض صحابہ نے حدیث مشہور سے ان کے موقف کے خلاف استدلال کیا یعنی قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ فاذا قالوا لا الہ الا اللہ عصموا منی دماءہم واموالہم الا بحقہا وحسابہم علی اللہ لیکن حضرت ابو بکر صدیقؓ نے بھی اسی روایت کے لفظ الا بحقہا سے استدلال فرماتے ہوئے کہا کہ زکوٰۃ بھی مال کا حق ہے اور جب تک یہ حق ادا نہ کیا جائے عصمت ثابت نہیں ہوتی، پھر فرمایا کہ اگر یہ زکوٰۃ نہ دینے والے وہ رستی اور پتھ بھی روکنا چاہیں گے جس کو وہ عہد رسالت میں دیا کرتے تھے تو میں ضرور قتال کروں گا۔

امام بخاری کے ترجمۃ الباب میں یہ بات مزید اضافہ کے ساتھ گزر چکی ہے کہ الا بحقہا سے استدلال کے علاوہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا استدلال یہ بھی تھا کہ نماز اور زکوٰۃ کے حکم میں فرق نہیں کیا جائیگا کیونکہ قرآن کریم میں ان دونوں کو ایک ساتھ اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وغیرہ بھی بیان کیا گیا ہے اس لئے ترک زکوٰۃ کا وہی حکم ہوگا جو ترک صلوٰۃ کا ہے، امام بخاری نے یہ بھی فرمایا تھا کہ حضرت ابو بکر صدیق کے نقطہ نظر سے مانعین زکوٰۃ کا یہ عمل احکام دین میں تبدیلی تھا، جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے من بدل دینہ فاقتلوہ، یعنی جو دین تبدیل کرے اس کو قتل کر دو۔ نیز نسائی شریف میں حضرت انسؓ کی روایت میں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نماز اور زکوٰۃ کے بارے میں اس حکم کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً نقل کیا ہے۔

(دیکھئے نسائی شریف کتاب المحاربة ص ۱۶)

یہاں دو باتیں قابل غور ہیں ایک یہ کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں پائے جانے والے طرز عمل میں ادنی تبدیلی کو راہ نہیں دی اور اس سلسلے میں کسی تاویل کو قبول نہیں فرمایا، اس لئے کہ مانعین زکوٰۃ میں سے جو مرتد نہیں ہوئے تھے وہ تاویل ہی تو کر رہے تھے اور صحابہ کرام کا اختلاف مرتدین کے بارے میں نہیں بلکہ صرف ان لوگوں کے بارے میں تھا جو تاویل کر کے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر رہے تھے۔ لیکن حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تاویل کرنے والوں کو معذور قرار نہیں دیا بلکہ ان کی نظر حقیقت واقعہ پر رہی اور انہوں نے فرمایا کہ اگر وہ ادنی ادائیگی سے بھی باز رہیں گے تو میں ضرور قتال کروں گا۔ ۱۔ الاعتصام مجید۔

اس کے بعد لکھتے ہیں

مع ان الذین اشاروا علیہ  
بترك قتالہما اشاروا  
علیہ بامر مصلحی ظاہر  
تعضدہ مسائل شرعیۃ  
وقواعد اصولیۃ لکن  
الدلیل الشرعی الصریح  
كان عندہ ظاہر فلو  
تقوعندہ آراء الرجال  
ان تعارض الدلیل

حالانکہ جو لوگ حضرت ابو بکر کو ترک  
قتال کا مشورہ دے رہے تھے وہ  
بھی ایک ظاہری مصلحت کے مطابق  
مشورہ دے رہے تھے اور ان کے  
مشورے کو بھی شرعی مسائل اور اصولی  
قواعد کی تائید حاصل تھی۔ لیکن حضرت  
ابو بکر کے سامنے شریعت کی صریح دلیل  
بالکل ظاہر تھی اور ان لوگوں کی رائے  
اس مواضع دلیل کے مقابل قوی نہیں تھی

الظاهر فالنزہۃ ثور جمع  
المشیرون علیہ بالتزلک  
الی صحتہ دلیلہ تقدیمہ  
للحاکم الحق وهو الشرع  
(الاعتصام ص ۳۵۲)

اس لئے حضرت ابوبکر صدیق نے اس  
صریح دلیل کا التزام کیا، پھر ترک قتال  
کا مشورہ دینے والوں نے بھی حق کو  
مقدم کرتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیق  
کی صحیح دلیل کی طرف رجوع کر لیا۔

چند لائنوں کے بعد دوسرے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

وجاء فی القصۃ ان  
الصحابۃ اشاروا علیہ  
برد البعث الذی بعثہ  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
وسلم مع اسامۃ بن  
زید ولو ینکونوا بعد  
مضوا الوجهتہو لیکونوا  
معہ عوناً علی قتال  
اہل الردۃ فابی من ذلک  
وقال ما کنت لامر دبعثا  
انفذا رسول اللہ صلی  
اللہ علیہ وسلم فوقف  
مع شرع اللہ ولو ینکونوا

یہ واقعہ بھی آتا ہے کہ صحابہ نے حضرت  
ابوبکر کو اس جیش اسامہ کو واپس بلانے  
کا مشورہ دیا جس کو حضور صلی اللہ علیہ  
وسلم نے حضرت اسامہ بن زید کی سرکردگی  
میں رواج فرمایا تھا مگر یہ شکر ابھی تک  
منزل کی طرف رواج نہیں ہو سکا تھا،  
واپسی کا مشورہ اس لئے دیا گیا تھا کہ  
اس شکر سے مرتدین کے قتال میں مدد  
ملے گی، لیکن حضرت ابوبکر نے انکار کیا  
اور فرمایا کہ میں اس شکر کو واپس نہیں  
بلا سکتا جس کو خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ  
وسلم نافذ فرما چکے ہیں، حضرت ابوبکر صدیق  
حکم خداوندی کے سامنے سیر انداز ہو گئے

(الاعتصام ص ۲۵۶)  
اور کسی دوسری چیز کو انھوں نے حاکم  
نہیں قرار دیا۔

بہر حال مانعین زکوٰۃ سے قتال اور جیش اسامہ کے معاملہ میں حضرت ابوبکر  
صدیق رضی اللہ عنہ کا عمل استبداد بالرائے کی نظیر ہرگز نہیں ہے، بلکہ یہ دونوں  
واقعات کتاب و سنت کی طرف مراجعت کی واضح مثالیں ہیں، امام بخاری بھی  
یہی فرما رہے ہیں، علامہ شاہ طبری بھی یہی سمجھ رہے ہیں اور واقعہ بھی یہی ہے، یہ  
کیسے ہو سکتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو لا تقضوہ برای واحد یعنی  
اکے دکنے کی رائے پر فیصلہ کی ممانعت فرمائیں اور صحابہ کرام آپ کے حکم کی تعمیل  
نہ کریں۔

## حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کے تمام واقعات  
فان تنازعتم فی شئ فردوہ الی اللہ والرسول یعنی نزاعی معاملات میں  
کتاب و سنت کی طرف مراجعت کی واضح ترین مثالیں ہیں، اور اس کے ساتھ  
یہ وضاحت بھی پیش نظر رہنی چاہئے۔

و کذلک کان یفعل عمر یہی طرز عمل حضرت عمر رضی اللہ عنہ  
(تاریخ التشریع الاسلامی ص ۱۳۸) کا رہا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں شوری کو جو طاقت حاصل ہوئی  
وہ بالکل ایک باضابطہ شکل ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں۔

و کلمہ امر ہم شوریٰ بینہم اشارہ است  
بفاروق اعظم زیرا کہ اشہر اوصاف  
او آں بود کہ در زمان خلافت او جمیع  
امور بمشورہ علماء صحابہ نافذ می شد  
و معظم اجماعات در ملت اسلامیہ ہاں  
است کہ اجماع و اتفاق بر آں بتدبیر  
فاروق اعظم و برائے او واقع شد  
(ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۲۳۸)

کلمہ امر ہم شوریٰ بینہم سے حضرت عمر  
کی ذات کی طرف اشارہ ہے کیونکہ مشورہ  
ان کے اوصاف حمیدہ میں سب نمایاں  
اور مشہور وصف ہے کہ ان کے زمانہ خلافت  
میں تمام امور علماء صحابہ کے مشورے سے  
نافذ ہوتے تھے اور امت اسلامیہ کے اجماعی  
مسائل کا بیشتر حصہ وہی ہے جس پر حضرت  
فاروق اعظم کی رائے اور تدبیر سے اجماع  
و اتفاق ہوا ہے۔

یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں تو مشورہ کا معمول تھا ہی  
لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں نہ صرف یہ کہ وہ باقی رہا بلکہ اس کو  
باضابطہ شکل دیدی گئی اور حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے یہ فرمایا کہ آیات قرآنی  
امر ہم شوریٰ بینہم کا اشارہ ہی حضرت عمر فاروق کی ذات کی جانب معلوم ہوتا ہے  
اس اجمال کی تفصیل علامہ شبلی نعمانی سے سنئے۔

۱۔ اسلام میں خلافت یا حکومت کی بنیاد اگرچہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے  
عہد میں پڑی لیکن نظام حکومت کا دور حضرت عمر کے بعد سے شروع ہوتا ہے،  
حضرت ابوبکر کی دو سالہ خلافت میں اگرچہ بڑے بڑے مہمات کا فیصلہ ہوا یعنی عرب  
کے مرتدوں کا خاتمہ ہوا اور بیرونی فتوحات شروع ہوئیں تاہم حکومت کا کوئی  
خاص نظام قائم نہیں ہوا اور نہ اتنا مختصر زمانہ اس کے لئے کافی ہو سکتا تھا۔

پھر چند لائوں کے بعد حضرت عمر کے طرز حکومت کے بارے میں لکھتے ہیں۔  
 ۲۔ اگرچہ وقت کے اقتضاء سے اس کے (حکومت کے) تمام اصول و فروع مرتب  
 نہ ہو سکے تاہم جو چیزیں حکومت کی روح ہیں سب وجود میں آگئیں، ان میں سب  
 کا اصل الاصول مجلس شوریٰ کا انعقاد تھا، یعنی جب کوئی انتظام پیش آتا تھا  
 تو ہمیشہ ارباب شوریٰ کی مجلس منعقد ہوتی تھی اور کوئی امر بغیر مشورہ اور کثرت  
 رائے کے عمل میں نہیں آسکتا تھا، تمام جماعت اسلام میں اس وقت دو گروہ  
 تھے جو کل قوم کے پیشوا تھے اور جن کو تمام عرب نے گویا اپنا قائم مقام تسلیم  
 کر لیا تھا یعنی ہاجرین و انصار، مجلس شوریٰ میں ہمیشہ لازمی طور پر ان دونوں  
 گروہ کے ارکان شریک ہوتے تھے، انصار بھی دو قبیلوں میں منقسم تھے اس  
 و خزیج، چنانچہ ان دونوں خاندان کا مجلس شوریٰ میں شریک ہونا ضروری تھا  
 مجلس شوریٰ کے تمام ارکان کے نام اگرچہ ہم نہیں بتا سکتے تاہم اس قدر معلوم  
 ہے کہ حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبدالرحمن بن عوف، معاذ بن جبل، ابی  
 بن کعب، زید بن ثابت اس میں شامل تھے (الفاروقؓ)۔

حضرت عمر کے عہد خلافت میں مجلس شوریٰ کے باضابطہ صورت اختیار  
 کرنے ہی کا نتیجہ ہے کہ زندگی بھر مجلس شوریٰ کے فیصلوں کی پابندی فرماتے  
 رہے، مذہبی مسائل میں کتاب و سنت کی طرف مراجعت اور انتظامی معاملات  
 میں اپنی ذاتی رائے پر نہیں بلکہ مجلس شوریٰ کی متعین کردہ رائے کے مطابق عمل درآمد  
 کرتے رہے۔ اور اسی کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ بوقت وفات بھی خلیفہ کے انتخاب کے  
 لئے باقاعدہ چند نفری مجلس شوریٰ نامزد فرمائی جس نے اہل مدینہ کی کثرت رائے



علوم کر کے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو خلافت کے لئے منتخب فرمایا۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں مشورہ کی پابندی فرمائی لیکن چونکہ بیشتر معاملات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مشورہ کے ذریعہ، کتاب و سنت کی طرف مراجعت کی بنیاد پر طے ہو چکے تھے اس لئے عام طور پر حضرت عمر کی سنت کی پابندی کی گئی البتہ ان کے عہد خلافت میں جب کوئی نیا معاملہ پیش آیا تو اس پر ضرور مشورہ کیا گیا، چنانچہ بحیثیت خلیفۃ المؤمنین ذمہ داری قبول کرنے کے بعد سب سے پہلا مشورہ ہرمزان کے قتل کے سبب، حضرت عبید اللہ بن عمر کے بارے میں کیا گیا اور جو مشورے میں طے ہوا اس پر عمل درآمد کیا گیا، جمع قرآن کے سلسلے میں بار بار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کر کے مشورے کئے جاتے رہے اور بالآخر کثرتِ رائے سے جو طے ہو گیا اس کے مطابق عمل درآمد ہوا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت بھی مشورہ کی طاقت سے معمور ہے بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ارشادات میں جو باتیں ضرب المثل کے طور پر مشہور ہیں ان میں شوری کی اہمیت پر ان کا یہ مقولہ بھی موجود ہے

لا صواب مع ترک المشورة مشورہ ترک کرنے کے ساتھ، راہ

صواب ہاتھ نہیں آتی۔

(ازالۃ الخفاء ص ۲۹۳)

لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں چونکہ حکومت کی باضابطہ تشکیل ہو رہی تھی اس لئے دواوین کی ترتیب، مختلف محکموں کے اجراء، اموال غنیمت کی تقسیم، عہد داروں کے تقرر اور امور سلطنت کی تمام جزئیات پر کتاب و سنت کی روشنی میں مشورے کے ساتھ فیصلے کئے گئے، اور حضرت

عثمان و حضرت علی رضی اللہ عنہما کے عہد میں ان فیصلوں پر عمل درآمد کے سبب مجلس شوریٰ کی اتنی ضرورت نہیں محسوس کی گئی لیکن جب بھی کوئی تازہ صورت حال پیش آئی تو ارباب مشورہ کو جمع کر کے فیصلہ کیا گیا، اور ان تمام معاملات میں عام طور پر وہ حضرات شریک کئے گئے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بوقت وفات انتخاب خلیفہ کے لئے نامزد فرما دیئے تھے۔

## خلیفہ کے انتخاب کیلئے حضرت عمرؓ کی سناپنفری مجلس شوریٰ

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی جانب سے انتخاب خلیفہ کیلئے سات نفری مجلس شوریٰ کی نامزدگی تاریخ اسلام کا اتفاقی واقعہ نہیں ہے کہ وہ اچانک زخم کاری پہنچنے کے سبب غور و فکر کے بعد نتیجہ تک پہنچنے میں متاثر رہے ہوں، اور اس بنیاد پر نامزدگی کی نوبت نہ آئی ہو، بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ جلیل القدر اقدام حکم خداوندی کی تعمیل، اور حضرت عمرؓ کے خلافت کے باب میں زندگی بھر کے غور و فکر کے بعد طے کردہ نقطہ نظر کی تکمیل کے طور پر تھا، ارشاد خداوندی ہے۔

ان اللہ یا مومنین ان تودوا ۱      بیشک اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں الامانات الیٰ اہلہا (سورہ نساء) اہلیت رکھنے والوں کی طرف منتقل کرو۔

۱۔ اس مجلس شوریٰ کو کسی نے چھ نفری سمجھا ہے، اور کسی نے سات نفری، کیونکہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو اس مجلس میں بعض چیزوں میں شریک رکھا گیا، اور بعض چیزوں میں شریک نہیں رکھا گیا، اس لئے ابن عمرؓ کو اس کا رکن قرار دیں تو یہ سات نفری ہے، ان کے بغیر چھ نفری ہے۔

یعنی ذمہ داری کا کوئی بھی کام صرف اہلیت کی بنیاد پر سپرد کیا جانا چاہئے تعلقات  
رشتہ داری اور مراعات کا عمل، ذمہ داریوں اور مناصب کی تقسیم میں شریعت  
کے منشا کے مطابق نہیں ہے، خلافت عالیہ سب سے بڑی ذمہ داری کا منصب ہے  
اور اس میں بھی معیار شریعت کی نظر میں اہلیت ہی ہے البتہ اس اہلیت کی  
توثیق کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ وہ امت کے نمائندہ ارباب شوری کی جانب  
سے عمل میں آئے قرآن کریم میں ہے۔

وامرہو شوریٰ بینہم  
مسلمانوں کے معاملات بشورے  
سے طے ہوتے ہیں۔  
(شوریٰ آیت ۴۲)

اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ضروری سمجھا کہ آنے والے خلیفہ کی اہلیت کی  
تصدیق فرد واحد کے بجائے ارباب شوری کی جانب سے ہو اور جسے مجلس شوری  
اہلیت کی بنیاد پر نامزد کرے وہ خلیفۃ المومنین کے طور پر خدمت انجام دے۔  
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلافت کے بارے میں جو وضاحتیں فرمائی ہیں  
ان میں بخاری شریف میں ایک تفصیلی بیان موجود ہے، جب حضرت عمرؓ زندگی  
کے آخری ایام میں حج کے لئے تشریف لے گئے تو وہاں ان کے علم میں یہ بات  
آئی کہ فلاں صاحب یہ کہتے ہیں کہ اگر عمر کا انتقال ہو جائے تو میں فوراً فلاں  
شخص سے بیعت کر لوں گا اور وہ اس طرح خلیفہ نامزد ہو جائیگا، حضرت ابو بکر  
صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت بھی اسی طرح اچانک منعقد ہوئی تھی اور اس کو  
مسلمانوں نے قبول کر لیا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے علم میں یہ بات آئی تو  
غضب ناک ہوئے اور فرمایا کہ میں آج ہی شام کو تقریر کروں گا، اور اس میں

لوگوں کو اس طرح کے ارادوں کی غلطی سے مطلع کروں گا لیکن حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ آپ اس عوامی اجتماع میں تقریر نہ کریں کیونکہ آپ کے تردیدی بیان سے ہو سکتا ہے کہ عوامی مجمع کی بنیاد پر غلط فہمیوں کو راہ ملے، چنانچہ مشورہ قبول فرماتے ہوئے حضرت عمرؓ نے اس دن تقریر نہیں کی، جب مدینہ طیبہ تشریف لے آئے تو ذی الحجہ کی آخری تاریخوں میں جمعہ کے دن منبر پر نہایت پرورد اور اثر انگیز خطبہ دیا اور اس کی تمہید میں نہایت طاقتور الفاظ ارشاد فرمائے

انی قائل لکم مقالة قد  
قد رلی ان اقولها لادری  
لعلها بین یدی اجلی  
فمن عقلها ووعاها  
فلیحدث بها حیث  
انتہت به راحلته۔  
(بخاری ج ۱۰ ص ۱۰۹)

میں آج ایک ایسی بات کہنا چاہتا ہوں جس کا کہنا میرے لئے مقدر ہے اور میں نہیں جانتا کہ شاید یہ بات میری موت کے قریب ہو، اس لئے جو میری بات سمجھ لے اور اس کو یاد رکھے تو چاہئے کہ وہ اس کو وہاں تک پہنچا دے جہاں اس کی سواری پہنچے۔

گویا آج کی تقریر میں جو باتیں ارشاد فرمانا چاہتے ہیں ان کی اہمیت بیان فرما رہے ہیں اور ان کی اشاعت بھی چاہتے ہیں کہ جو اس مضمون کو یاد رکھے اور سمجھ لے وہ اس کو جہاں تک ممکن ہو بیان کرے، چنانچہ مسلمانوں نے اس ارشاد کو اتنی اہمیت سے محفوظ رکھا کہ وہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ میں محفوظ ہے، اس تقریر میں حضرت عمرؓ نے بہت اہم باتیں ارشاد فرمائیں اور خلافت کے بارے میں جس نقطہ نظر کی وضاحت کی وہ یہ ہے۔

ثوانہ بلغنی ان قائلًا  
منعمر یقول واللہ لومات  
عمر با یعت فلانا  
فلا یغترون امرؤ ان  
یقول انما کانت  
بیعة ابی بکر فلیتہ  
وتنتہ الا وانہا  
قد کانت کذلک  
ولکن اللہ وحی شرہا  
ولیس منکم من تقطع  
الاعناق الیہ مثل  
ابی بکر من با یم  
رجلا من غیر مشورۃ  
من المسلمین فلا یبا یم ہو

(بخاری ۱۰۰۹/۲)

پھر یہ کہ مجھ کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ تم  
میں سے کسی نے یہ بات کہی ہے کہ بخدا  
اگر عمر کا انتقال ہو جائے تو میں فلاں  
سے بیعت کروں گا، ہرگز کوئی انسان  
اس بات سے دھوکا نہ کھائے اور یہ  
کہے کہ حضرت ابوبکر کی بیعت اچانک  
ہوئی تھی اور کامیاب رہی، خبردار!  
کہ اگرچہ ایسا ہی ہوا تھا کہ وہ اچانک  
تھی مگر اللہ تعالیٰ نے اس عاجلانہ طرز  
عمل کے نقصان سے محفوظ رکھا اور اب  
تم میں کوئی حضرت ابوبکر جیسا نہیں جس  
کی فضیلت کا اعتراف دور دور تک کیا  
جاتا ہو، خبردار! کہ اگر کوئی مسلمانوں  
کے مشورے کے بغیر کسی سے بیعت خلافت  
کرے تو اس کی بیعت نہ کی جائے

وفات سے چند دن پہلے کی یہ الہامی تقریر جس میں اپنی وفات کی بھی  
پیشین گوئی ہے خلافت کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت کے لئے  
کافی ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے یہ علم ہوا ہے کہ کسی نے میرے  
انتقال کے بعد اچانک کسی کے ہاتھ پر بیعت کر کے اس کی خلافت کے انعقاد کی تمنا

ظاہر کی ہے اور اس کو یہ دھوکا ہوا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا انعقاد بھی اچانک ہی عمل میں آیا تھا اور وہ خلافت کا میاب رہی تھی، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ وضاحت فرمائی کہ اگرچہ حضرت ابو بکرؓ کی بیعت اچانک ہوئی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم اور حضرت ابو بکر کی فضیلت کے سبب اس کے نقصانات سے مسلمانوں کو محفوظ رکھا، اب مسلمانوں میں حضرت ابو بکر جیسی بلند و بالا کوئی شخصیت نہیں ہے جس کی عظمت و فضیلت پر قریب و بعید سب کا اتفاق ہو، اسلئے اب حکم یہ ہے کہ مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر اگر کسی کی بیعت کا کوئی ارادہ رکھتا ہے تو اس سے بیعت نہیں کی جائے گی۔

اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی اس معرکہ الآراء تقریر میں حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں کہ اس وقت یہ صورت پیش آئی تھی ہم ان تفصیلات میں نہ جاتے ہوئے صرف مذکورہ بالا حصے کے چند پہلوؤں پر توجہ دلانا چاہتے ہیں۔

۱۔ سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے یام ج میں علم میں آنے والی بات پر ناراضگی کا اظہار فرمایا اور اس کو فریب اور دھوکا قرار دیا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی اچانک بیعت سے استدلال کرنا فریب نفس ہے۔

۲۔ پھر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگرچہ حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کا انعقاد اچانک عمل میں آیا تھا لیکن اس میں کچھ مجبوریات تھیں، اچانک کا مفہوم یہ ہے کہ اس سلسلے میں پہلے باقاعدہ مشورے کی مہلت نہیں ملی، لیکن حضرت ابو بکرؓ جیسا عبقری، صاحب علم و فضل اور قریب و بعید سب کے نزدیک محبوب اور پسندیدہ



انسان کہاں میسر ہوگا، لیکن ان اوصاف کے باوجود، باقاعدہ مشورے کے بغیر اس عمل میں نقصانات کا احتمال تھا، یہ اللہ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے مسلمانوں کو اس کے نقصان سے محفوظ فرمادیا، لیکن جس طرز عمل میں نقصانات کا اندیشہ ہو اس کا دوبارہ تجربہ کرنا درست نہ ہوگا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اگرچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں اسی قدر ارشاد فرمایا ہے لیکن یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کے لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے واضح اشارے موجود تھے اس لئے مسلمانوں کا یہ انتخاب خیر و برکت اور مسلمانوں کے لئے فلاح کا سبب بن گیا۔

۳۔ اس تمہید کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وضاحت کے ساتھ فرمایا کہ مسلمانوں کے مشورے کے بغیر کسی شخص کو خلیفہ بنانے کی جدوجہد قطعاً غلط ہے اور اس کی بیعت نہیں ہونی چاہئے۔

بخاری شریف کی اس روایت کے علاوہ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلافت کے بارے میں جو اسلامی نقطہ نظر پیش کیا ہے وہ ان الفاظ میں محفوظ ہے

لا خلافة الا عن المشورة      خلافت (کا انعقاد اور بقا) مشورے کے بغیر نہیں ہے۔

(کنز العمال ج ۵)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ان تصریحات سے یہ بات ثابت ہوئی کہ حضرت عمرؓ نے خلافت کیلئے جو سات نفری مجلس شوریٰ نامزد کی تھی وہ کوئی اتفاقی عمل نہیں تھا بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت ہی یہ فرمائی

ہے کہ خلیفہ کا انتخاب مجلس شوریٰ ہی کا کام ہے، اور ان کی وضاحتوں سے یہ بات سمجھی گئی ہے کہ خلیفہ کے انتخاب کے لئے مجلس شوریٰ ہی اصل ہے، اور مجلس شوریٰ کو خلفاء و سلاطین پر بالادستی حاصل ہے۔

## سلاطین پر شوریٰ کی بالادستی قرآن میں

انتخاب خلیفہ کیلئے مجلس شوریٰ کی بالادستی کے سلسلے میں حضرت عمر کے پیش کردہ اسلامی نقطہ نظر کے لئے اگر کوئی اور تائید نہ بھی ہوتی تب بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد

میری سنت اور خلفاء راشدین کی سنت  
علیکم بسنتی وسنة الخلفاء  
الراشدین (مشکوۃ ج ۳)

کو لازمی طور پر اختیار کرو  
کے مطابق اس کو لازمی طور پر قبول کرنا ضروری تھا، لیکن حضرت عمر کا یہ نقطہ نظر جن نصوص پر مبنی ہے ان میں سے چند چیزیں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) اس سلسلے میں سب سے پہلے قرآن کریم کی نصوص کا پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، قرآن کریم کی آیات سے جو استدلال کے معتبر طریقے مقرر کئے گئے ہیں ان کے مطابق امت کے عالی دماغ علماء کرام نے لامحدود مسائل مستنبط کئے ہیں بلکہ یہ سمجھنا چاہئے کہ مجتہدین کرام کے مقرر فرمودہ اصول استنباط ہی کے ذریعہ قرآن کریم کے وصف امتیازی لا تنقضی عجائبہ (اگر اس کے حیرت انگیز پہلو بھی اختتام پذیر نہ ہوں گے) کا ثبوت فراہم ہوتا رہتا ہے۔

قرآن کریم میں شوری کے سلسلے میں دو آیات ہیں، ایک کا تعلق براہ راست رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے ہے یعنی شادرھو فی الامر فاذا عنمت فتوکل علی اللہ، اور دوسری آیت کا تعلق امت سے ہے یعنی امرہم شوری بینہم اور دونوں ہی آیتوں سے شوری کی بالادستی ثابت ہے۔

یہ بات بھی واضح کی جا چکی ہے کہ احناف کے یہاں قرآن فہمی کے چار طریقے ہیں، عبارة النص، اشارة النص، دلالة النص اور اقتضار النص، یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ شادرھو کی عبارة النص سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مشورہ کا حکم معلوم ہوتا ہے، اور اسی کی دلالة النص سے امت کے لئے مشورہ کا وجوب ثابت ہوتا ہے، اور اب قابل اعتماد علماء کی تصریحات سے یہ پیش کیا جا رہا ہے کہ انھی آیات کی دالالتوں سے یہ مضمون بھی صحیح طور پر ثابت ہے کہ سلاطین پر شوری کو بالادستی حاصل ہے چنانچہ عبدالوہاب خلاف نے شاورہم کی اشارة النص سے یہ مضمون مستنبط کرتے ہوئے لکھا ہے۔

المثال الثالث لاشارة النص، فاعف عنہم واستغفرلہم وشاورہم فی الامر، یہ سمجھا جاتا ہے کہ امت میں سے ایک ایسی جماعت کا پیدا کرنا واجب ہے جو امت کی نمائندہ ہو اور جس سے امت کے معاملات میں مشورہ کیا جائے اسلئے	امثال الثالث لاشارة النص، فاعف عنہم واستغفرلہم وشاورہم فی الامر، یہ سمجھا جاتا ہے کہ امت میں سے ایک ایسی جماعت کا پیدا کرنا واجب ہے جو امت کی نمائندہ ہو اور جس سے امت کے معاملات میں مشورہ کیا جائے اسلئے
---	--

تفید الامر ومشاورۃ الامۃ کہ مشورہ کے بعد، حکم کی تفید کا مضمون  
یستلزم ذلك (اصول الفقہ خلاف ۱۴۶) اس کو مستلزم ہے۔

اشارۃ النص کے بارے میں یہ بتلایا جا چکا ہے کہ آیت پاک کے مرکزی  
مضمون کے علاوہ جو بات ترجمہ لغت یا معنی التزامی سے سمجھی جائے اس کو  
اشارۃ النص کہتے ہیں، اسلئے عبدالوہاب خلاف کے اس استنباط کا مطلب ہوا  
کہ آیت پاک میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جا رہا ہے کہ آپ مشورہ فرمائیں  
اس لئے خود حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مشورہ کا حکم اس آیت کی عبارتہ  
النص سے ثابت ہوا اور جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کمال عقل و دانش، نور  
بصیرت، پیغمبرانہ عظمت اور سب سے زیادہ طاقتور ذریعہ علم یعنی وحی پر دسترس کے  
باوجود مشورہ کے مامور ہیں تو امت کے بقیہ امار بدرجہ اولیٰ مشورہ کے پابند  
ہیں کہ وہ تمام غیر منصوص معاملات میں مشورہ کریں، لیکن مشورہ کی بنیاد پر احکام  
کا فیصلہ اور ان کی تفید اس بات کو بدیہی طور پر مستلزم ہے کہ تمام مشورہ طلب  
معاملات کے تصفیہ کے لئے علماء کی شوریٰ مقرر ہو، اگر شوریٰ مقرر نہیں کی جاتی  
تو قرآن کریم کی اشارۃ النص سے جو حکم ثابت ہو رہا ہے اسکی تعمیل نہیں کی جاسکے گی،  
عبدالوہاب خلاف یہی کہنا چاہتے ہیں کہ حضرات احناف رحمہم اللہ کے مقرر  
کردہ اصول استنباط میں، اشارۃ النص، صحیح نتیجہ تک پہنچانے والا طریقہ ہے  
اور معنی التزامی کے طور پر یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ امت کی نمائندہ ایک ایسی  
جماعت کا ہونا ضروری ہے جس سے امت کے اہم معاملات میں مشورہ کیا جاتا  
رہے، اور مشورہ کے بعد احکام کی تفید عمل میں آیا کرے۔

(۲) عبد الوہاب خلافت نے شاورہم پر اشارۃ النص کا اجراء کر کے جو مضمون بیان کیا ہے، مصر کے دوسرے مشہور قابل اعتماد عالم شیخ ابو زہرہ مصری نے وہی مضمون امر ہو شوری بینہم پر اشارۃ النص کا اجراء کرتے ہوئے مستنبط کیا ہے، فرماتے ہیں

ومن ذلك (امثلة اشارۃ النص) امر ہو شوری بینہم فانہ افاد بالعبارة ان المحکوم الاسلامی يقوم علی الشوری بین جماعۃ المسلمین ویفید بطریق الالتزام وجوب تخیر الامۃ لجماعۃ تراقب المحاکم و تشارك فی سن النظام المحکم

اشارۃ النص کی ایک مثال امر ہو شوری بینہم ہے، اس لئے کہ یہ آیت عبارتۃ النص سے یہ بتلاتی ہے کہ اسلامی حکومت مسلمانوں کے درمیان شوری کی اساس پر قائم ہوگی، اور یہی آیت دلالت التزامی کے طور پر یہ بتلاتی ہے کہ امت مسلمہ میں سے ایک ایسی جماعت کا انتخاب واجب ہے جو حاکم پر نگراں ہو اور نظام حکومت کی تشکیل میں حاکم کے ساتھ شریک کار ہو۔

(امول الفقہ ابو زہرہ ۱۳۵)

شیخ ابو زہرہ (مر ہو شوری بینہم کے بارے میں حضرات احناف رحمہم اللہ کے طریق استنباط کے مطابق لکھتے ہیں کہ امر ہو شوری بینہم میں چونکہ صحابہ کرام کے اوصاف حمیدہ کا بیان ہے اس لئے عبارتۃ النص سے تو یہ معلوم ہوا کہ غیر منصوص تمام معاملات، جن میں خلافت و حکومت سب اہم معاملہ ہے شوری کی بنیاد پر طے ہونے ضروری ہیں، لیکن اس حکم خداوندی کی تعمیل کے لئے یہ لازم ہے کہ امت مسلمہ میں سے ایک ایسی جماعت کا انتخاب عمل میں آئے جو حاکم

اور سلطان پر بالادست ہو اور اسکے تمام معاملات کی نگرانی کرے اور نظام حکومت کی تشکیل میں سلطان کے ساتھ شریک کار رہے۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ ایک اصولی عالم امر ہو شوریٰ بینہ اور دوسرے اصولی عالم شاد ہو کی اشارۃ النص سے مجلس شوریٰ کا وجوب اور اس کی حاکم پر بالادستی ثابت کر رہے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے بھی یہی نصوص ہیں جن کی بنا پر وہ اس اعلان پر مجبور ہوئے کہ خلافت کا مشورے کے بغیر کوئی تصور نہیں اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اس کی بیعت درست نہ ہوگی۔

(۳) پچھلی صدی کے مشہور محقق علامہ طنطاوی، جن کی تفسیر کے بارے میں ہمارے اکابر دیوبند میں حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری سے بڑے وسیع الفاظ منقول ہیں وہ ایک دوسری آیت اطیعوا اللہ، و اطیعوا الرسول واولی الامر منکم پر لکھتے ہیں۔

ارشاد باری واولی الامر منکم میں	وقوله واولی الامر منکم) ہواہل
مراد، اہم اسلامیہ کے ارباب حل و عقد ہیں	الحل والعقد فی الامر
جن کے درمیان تمام معاملات مشورے	الاسلامیۃ الذین یکون الامر
سے طے ہوتے ہیں، اور اکثریت کی رائے	بینہو شوری ویکون الراى
کے مطابق عمل ہوتا ہے یہاں اولی الامر	الغالب معمولاً بہ واول
میں لفظ الامر کا الف لام عہد خارجی کا	فی الامر للعہد والمعہود
ہے اور اس کی مراد وہ امر ہے جو امر ہو	ذلک فی قوله تعالی و
شوری بینہو میں مذکور ہے، اس لئے	امر ہو شوری بینہو فہذا



اولوالامر میں امر سے مراد وہ امر ہے جو امر ہو

شوری میں مذکور ہے۔

ہو الامر المذکور ہونا۔

(طنطاوی ج ۵۲ ص ۳۶)

علامہ طنطاوی کے ارشاد کا مفہوم یہ ہوا کہ اولوالامر سے مراد وہ ارباب

حل و عقد ہیں جو مشورہ طلب امور کا فیصلہ مشورے سے کرتے ہیں اور اولوالامر

میں۔ الامر۔ پر داخل الف لام کا اشارہ امر ہو شوری بینہم کی طرف ہے۔

علامہ طنطاوی دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں

غور فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء

میں کیا حکم دیا ہے کہ اے ایمان والو!

اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اطاعت

کرو اور اولی الامر کی۔ یہ اولوالامر کون

ہیں؟ یہ وہی ہیں جو مسلمانوں کے درمیان

”اہل شوری“ کے نام سے معین ہیں جن

کا ذکر اس سورت سے پہلے نازل ہونے

والی مکی سورت میں و امرہم شوری بینہم

میں فرادیا گیا ہے۔ اس حکم کے مطابق ہر

اسلامی مملکت میں مجلس شوریٰ اور

بالفاظ دیگر مجلس ناسندگان ہونی ضروری

ہے اور یہ وہ مجلس ہوگی کہ امور مملکت

میں اسی کا فیصلہ ناطق اور نافذ ہوگا اور

انظر ماذا قال الله تعالى في

سورة النساء يا ايها الذين

امنوا اطيعوا الله واطيعوا

الرسول واولى الامر منكم ومن

هو اولى الامر هم المعهودون

عندهم هم اهل الشورى

المذكورون في السورة النازلة

قبلها في مكة و امرهم شورى

بينهم فليكن في كل

بلد اسلامي مجلس للشورى

وبعبارة اخرى نواب

وهذا المجلس له القول

الفصل في امر البلاد

فلیفعل ما یشاء ولیحکو بما یرید اور وہ کلی اختیارات کے ساتھ احکام کی تنفیذ کرے گی۔  
(تفسیر الجواہر للطنطاوی ص ۵۶)

یہاں علامہ طنطاوی نے یہ ارشاد فرمایا کہ امرم شوریٰ بینہم کا نزول مکہ مکرمہ میں ہوا ہے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کے تمام معاملات میں امر کی طاقت شوریٰ کے ہاتھ میں دی گئی ہے، پھر مدینہ طیبہ میں دوسری آیت اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول واولی الامر منکھ نازل کی گئی جس کا مفہوم یہ ہوا کہ شوریٰ کے ذریعہ جن لوگوں کو امر کی طاقت تفویض کی جائے وہی اولوالامر ہیں اور ان کے احکام کی اطاعت واجب ہے۔

اس ترتیب سے علامہ طنطاوی مرحوم یہ صحیح نتیجہ اخذ فرما رہے ہیں کہ ان دونوں آیتوں کا خلاصہ یہ ہوا کہ ہر مملکت اسلامی میں مجلس شوریٰ کا قیام ضروری ہے جس کے ہاتھ میں مکمل اختیارات ہوں۔

ان دونوں آیتوں کو مربوط کرنے کے لئے علامہ طنطاوی نے دو چیزوں سے استدلال کیا ہے، ایک نحوی اصطلاح ہے کہ اولوالامر میں لفظ الامر پر جو الف لام داخل ہے وہ عہد خارج کے لئے ہے جس کی مراد متعین ہے اور وہ مراد متعین امرم شوریٰ میں مذکور ہے، اور دوسرا استدلال یہ ہے کہ امرم شوریٰ کا نزول پہلے مکہ مکرمہ میں ہوا ہے جب کہ اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول کا نزول مدینہ طیبہ میں ہوا ہے۔

سلاطین پر شوریٰ کی بالادستی کے سلسلے میں قرآن کریم کی آیات سے کئے گئے یہ تین استدلال نہایت صاف ہیں کیونکہ پہلے دو استدلال جو آیات قرآن کی

اشارۃ النہن سے کئے گئے ہیں، حضرات احناف رحمہم اللہ کے مقرر فرمودہ طریق استنباط کے بالکل مطابق ہیں، اور حضرات احناف نے قرآن کریم سے معافی کے استنباط کے لئے جو طریقے مقرر کئے ہیں وہ صرف وہی ہیں جو یقینی طور پر صحیح ہیں جن طرق استنباط کا صحیح نتیجہ تک پہنچنا ناغیر یقینی اور مشتبہ تھا ان کو حنفیہ نے قرآن فہمی کے بارے میں قبول نہیں کیا، بلکہ اصول فقہ میں وجوہ فاسدہ کے نام سے جو بحث کی جاتی ہے یہ انھیں طرق استدلال کی وضاحت ہے جن کا صحیح مراد تک پہنچنا نا یقینی نہیں ہے۔

تیسرا استدلال جو علامہ طنطاوی نے کیا ہے وہ باین معنی مضبوط ہے کہ اس میں اولوالامر کے لفظ الامر سے وہ معنی مراد لئے گئے ہیں جو قرآن کریم کی دوسری آیت امرہم شورئینہم میں مذکور ہے، اول تو مفسرین کرام کا عام اصول یہ ہے کہ القرآن یفسر بعضہ بعضا اور وہ یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم کی سب سے مضبوط تفسیر وہی ہے جو قرآن کریم سے کی جائے، پھر ان کو ان معنی کی تعیین کے لئے یہ دیں بھی مل گئی کہ جس آیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ زمانہ نزول کے اعتبار سے مقدم ہے اور مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے جبکہ دوسری آیت زمانہ نزول کے اعتبار سے مؤخر ہے۔

بہر حال قرآن کریم سے استدلال کے قابل اعتماد طریقوں سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ شوریٰ کو خلفاء و سلاطین پر بالادستی حاصل ہے۔



## سلاطین پر شوری کی بالادستی ہند میں

قرآن کریم میں سلاطین پر شوری کی بالادستی کے ناقابل انکار دلائل کے بعد اب ذرا حدیث پاک پر نظر ڈال لیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خلیفہ کے تقرر کا دستور اور معیارِ اہلیت اس طرح بیان فرمایا ہے۔

۱۔ عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا احسان امراء کو خیار کو و اغنیاء کو سمعاً کو و امور کو شوری بینکو فظہر الارض خیر لکم من بطنہا و اذا کان امراء کو شرار کو و اغنیاء کو بخلاف کو و امور کو الی نساء کو فبطن الارض خیر لکم من ظہرہا (ترمذی ج ۵)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب تمہارے امیر تمہارے منتخب افراد ہوں اور اغنیاء سخی ہوں اور تمہارے معاملات مشورے سے طے ہوں، تو زمین کی پشت تمہارے لئے، زمین کے بطن سے اچھی ہے اور جب تمہارے امراء تم میں کے بدترین افراد ہوں اور اغنیاء بنخیل ہوں اور معاملات عورتوں کے ہاتھ میں ہوں تو زمین کا بطن تمہارے لئے زمین کی پشت سے بہتر ہے۔

آپ کے ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ امت کی خیر اس میں ہے کہ امراء کے انتخاب میں معیارِ انتخاب خیر و صلاح اور اہلیت کو ہونا چاہئے اور دولت مندوں کو کرم پیشہ اور سخی ہونا چاہئے، تمام معاملات بشمول خلافت، مشورے سے طے

ہونے چاہئیں، اگر صورت حال یہ رہتی ہے تو تمہاری زندگی موت سے بہتر ہے لیکن اگر خدا نخواستہ نوبت یہ آجائے کہ امراء کا انتخاب اس طرح کیا جائے کہ بدترین افراد مناصب پر آجائیں اور ان غیار میں بخل کا مرض پیدا ہو جائے اور معاملات مشورے کے بجائے عورتوں کے سپرد کئے جانے لگیں تو تمہارے لئے موت زندگی سے بہتر ہے۔

اس ارشاد میں امور کو شوریٰ بینکوں بالکل عام ہے کہ تمام معاملات کا مشورہ کی بنیاد پر فیصلہ ہونا چاہئے، اگر خدا نخواستہ یہ وصف ختم ہو گیا تو امت کو زوال سے کون بچا سکے گا، اصول فقہ کی اصطلاح میں اس کی تعبیر اس طرح کی جائے گی کسی حکم کے ساتھ اگر کوئی حد یا وعید وارد ہو جاتی ہے تو اس سے وجوب ثابت ہو جاتا ہے، اور یہاں مشورے سے معاملات طے نہ کرنے پر شدید وعید آئی ہے کہ تمہارا مرجعنا بہتر ہے اس لئے آپ کے اس ارشاد سے شوریٰ کا وجوب سمجھا جائیگا کہ قیام شوری واجب بات میں سے ہے، اس لئے آپ کا یہ ارشاد تمام امور کے مشورے سے طے کئے جانے پر نص ہے لیکن خلافت کے ساتھ مشورہ کے ربط پر اس سے بھی زیادہ صریح ارشاد موجود ہے۔

۲۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لو كنت مستخلفا احدا عن غیر مشورة لا استخلفت بزام عبد (عبداللہ بن مسعود) کو خلیفہ نامزد کرتا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا شک خصوصی اختیارات حاصل ہیں اور اللہ اور اس کا رسول کوئی فیصلہ کرنے تو تمام مسلمانوں کو صریح حکم ہے کہ وہ آپ

کے احکام کو بے چون و چرا تسلیم کریں ماسکان لمومن ولا مؤمنة اذا قضی اللہ ورسولہ امران یعنوں لہما الخیرۃ من امرہما ، کسی مومن یا مومنہ کو اپنے تمام معاملات میں اللہ اور اس کے رسول کے فیصلہ فرمادینے کے بعد کوئی اختیار باقی نہیں رہتا، اس لئے اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی بھی شخص کو خلافت عامہ یا خلافت خاصہ کیلئے نامزد فرمادیتے تو کسی مومن کے لئے اشکال کی کوئی بات نہیں تھی، لیکن آپ نہایت صراحت کے ساتھ فرما رہے ہیں کہ میں بھی مشورے کے بغیر کسی کو خلافت عامہ یا خاصہ کے لئے نامزد نہیں کروں گا، بالفرض اگر میں مشورے کے بغیر کسی کو نامزد کرتا تو عبد اللہ بن مسعود اس کے اہل تھے۔

اس سے زیادہ کیا صراحت ہوگی کہ آپ اپنے بارے میں فرما رہے ہیں کہ میں بھی مشورے کے بغیر کسی کو خلیفہ مقرر نہیں کروں گا اور جب آپ بھی مقرر نہیں فرمائیں گے تو امت کے دیگر افراد کو یقیناً اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ استبداد برائے کے طور پر اس طرح کا کوئی اقدام کریں۔

(۳) نیز بخاری شریف میں حضرت جریر بن عبد اللہ البجلی سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں ذو عمرو اور ذوالکلاع حمیری کے ساتھ دربار رسالت میں عاضی کے ارادہ سے آ رہا تھا کہ ہمیں راستے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کی اطلاع ملی، اس وقت تو وہ واپس ہو گئے بعد میں حضرت جریر بن عبد اللہ کی ذو عمرو سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتلایا۔

یا جریر ان بک علی کرامۃ      جریر! تمہارا مسیکر اوپر احسان ہے  
دانی مخبرک خبرا انکر      اور میں تمکو ایک اہم بات بتلانا چاہتا



یا معشر العرب لن تزالوا  
بخیر ما كنتموا اذا هلك امیر  
تا مرتب باخر فاذا كانت  
بالسيف عا نوا ملوكا  
یغضبون غضب الملوك  
ویرضون رضی الملوك  
(مصحح بخاری ج ۶ ص ۶۲۵)

ہوں، اے اہل عرب! جب تک تم میں  
یہ صورت رہے خیر تمہارا حصہ رہے گی کہ  
جب ایک امیر فوت ہو تو تم باہمی مشورے  
سے دوسرا امیر مقرر کرتے رہو لیکن اگر  
امیر کے انتخاب میں تلوار (طاقت) دخل  
ہو جائے گی تو بادشاہت آجائے گی کہ  
وہ بادشاہوں کی طرح غضب ناک اور  
انہی کی طرح رضا مند ہوا کریں گے۔

حضرت ذوالکلاع اور حضرت ذوعمرہ، یمن کے بادشاہوں میں ہیں، اور  
اس وقت تک مشرف باسلام نہیں ہوئے تھے لیکن ایک امیر کے بعد دوسرا امیر  
کے انتخاب میں مجلس شوریٰ کی بالادستی کی صورت میں جس خیر کا انہوں نے  
ذکر کیا ہے وہ اپنی جگہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے، حضرت ذوالکلاع کا یہ تبصرہ  
محدثین کرام کے نقطہ نظر سے ام سابقہ کی کتابوں کی بنیاد پر بھی ہو سکتا ہے اور کلمات  
کی بنیاد پر بھی ہو سکتا ہے، اور تجربہ کی بنیاد پر بھی ہو سکتا ہے، لیکن ہمیں عرض یہ کرنا  
ہے کہ خلافت کے مشورے کی بنیاد پر استوار ہونے کی بات زمانہ خیر القرون میں  
اتنی عام ہے کہ اہل کتاب بھی اس سے واقف ہیں، واقف ہی نہیں بلکہ اس  
حقیقت کو اتنا قیمتی سمجھتے ہیں کہ اس کے بیان کرنے سے پہلے ایک مؤثر تمہید  
ذکر کرتے ہیں کہ آپ کے کرم کے عوض میں آپ کو ایک قیمتی بات بتانا چاہتا ہوں  
لیکن انسو ہے کہ اتنی قیمتی اور اتنی مشہور حقیقت، نگاہوں سے اتنی اوجھل

ہو گئی کہ اب مجلس شوریٰ کی بالادستی سلاطین کے مقابل نہیں، ماتحت امراء کے مقابل بھی زیر بحث آگئی اور جس دستور اساسی میں شوریٰ کی بالادستی کا لحاظ رکھا جائے اس کے بارے میں یہ بحث شروع کر دی گئی کہ وہ خلاف شرع ہے، اور اس کا تبدیل کرنا ضروری ہے حالانکہ شوریٰ کی بالادستی اور افادیت عقل و نقل کے ہر طرح کے دلائل سے آسانی کے ساتھ ثابت ہے۔

## سلاطین پر مجلس شوریٰ کی بالادستی کی مزید تفسیر

مجلس شوریٰ سلاطین پر بالادست ہے اس کے لئے آپ قرآن و حدیث کے متعدد حوالے اور استدلال پڑھ چکے ہیں، یہی مضمون اکابر صحابہ اور علماء امت سے بعینہ منقول ہے، اسلامی طرز حکومت کی تشریع سے متعلق جتنی کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں ان سب میں شوریٰ پر بحث ہے اور ایک خلیفہ برحق یا سلطان عادل کے لئے جو چار اوصاف بیان کئے گئے ہیں وہ ہیں قرشت بیعت عام، شوریٰ اور عدالت، شیخ ابو زہرہ مصری نے المذاہب الاسلامیہ میں اس موضوع پر تفصیلی کلام کیا ہے، شوریٰ اسلامی حکومت کا وہ ممتاز وصف ہے جس سے کسی بھی حال میں صرف نظر ممکن نہیں، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنا پورا عہد خلافت اس طرح گزارا ہے کہ اس کے ہر ہم موڑ پر شوریٰ کی اجمیت کے دلائل قائم ہیں اور اس سلسلے کی نہایت قیمتی اور زریں باتیں آپ پڑھ چکے ہیں، اسی سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ بھی

منقول ہے۔

و فی روایۃ معمر من وجہ

معمر نے دوسری سند سے حضرت عمرؓ سے

اخر عن عمر من دعی الی امارۃ

نقل کیا ہے کہ اگر کسی شخص کو مشورے

من غیر مشورۃ فلا یحل لہ ان یتقبل

کے بغیر امارت کی دعوت دی جائے تو

(فتح الباری ج ۱۲)

اس کیلئے امارت کا قبول کرنا جائز نہیں

اس ارشاد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشورے کے بغیر امارت کیلئے

منتخب کئے جانے والوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ انھیں اس خدمت کا قبول

کرنا جائز نہیں ہے، اسی موضوع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ارشادات لا خلافة

الا عن مشورۃ اور من بايع من غیر مشورۃ من المسلمین فلا یباع بھی گزر

چکے ہیں۔ ان ارشادات کا تقاضہ یہ ہے کہ خلافت ہر حال میں مشورہ کی پابند ہے۔ اگر

مشورہ کے بغیر کسی شخص کو منصب خلافت کی تفویض کی جا رہی ہے تو خود اس

شخص کے لئے اس منصب کا قبول کرنا جائز نہیں، پھر ان ارشادات میں اس

خلافت الا عن مشورۃ۔ تو بالکل عام ہے، اس ارشاد کا جہاں یہ مفہوم ہے

کہ خلافت کا انعقاد مشورے کے بغیر نہیں ہوگا وہیں اس تعبیر کا عموم یہ ہے کہ

خلافت مشورے کے بغیر باقی بھی نہیں رہے گی، گویا خلافت حضرت عمر رضی اللہ عنہ

کی تشریحات کے مطابق انعقاد اور بقاد دونوں حالتوں میں مشورے کے تابع ہے

یہی مضمون مشہور مفسر ابن عطیہ (الامام المفسر الحافظ القاضی عبد الحق

بن غالب بن عطیہ المتوفی ۵۴۶ھ صاحب الوجیز فی التفسیر) سے منقول ہے کہ

خلافت اپنی بقا کی حالت میں بھی مشورہ کی محتاج ہے، ان کا ارشاد کام معتبر

تفسیروں میں ان الفاظ میں منقول ہے۔

ذکر ابن عطیة ان الشوری من  
قواعد الشریعة وعزائوا الاحکام  
من لا یشیر اهل العلم  
والدین فعزله واجب، هذا  
مما لا خلاف فیہ  
(البحر المحیط ص ۱۹۰)

ابن عطیہ نے فرمایا ہے کہ شوری، شریعت  
کے اساسی قوانین اور واجب احکام میں  
سے ہے، جو (خلیفہ یا امیر) اہل علم اور  
اہل دین سے مشورہ نہ کرے اس کو معزول  
کر دینا واجب ہے، یہ وہ نقطہ نظر ہے جس میں  
کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

چھٹی صدی کے مفسر ابن عطیہ رحمہ اللہ کے ارشاد کا صریح مفہوم یہ ہے کہ خلافت  
اپنی بقا میں بھی مشورہ کی محتاج ہے کہ اگر کوئی سلطان مستبدانہ رائے ہو جائے اور  
اہل علم و اہل دین سے مشورہ کرنا ترک کر دے یعنی مجلس شوریٰ کی بالادستی کا عملاً  
انکار کر دے تو اس کو معزول کر دینا ضروری ہے اور یہ وہ نقطہ نظر ہے جس میں  
ابن عطیہ یہ دعویٰ فرما رہے ہیں کہ کسی کا اختلاف منقول نہیں ہے۔

غور فرمائیے کہ اگر مجلس شوریٰ کی بالادستی کا انکار صرف عملاً ہی نہیں پسندیدہ  
موقف کے طور پر کیا جانے لگے، صرف خلفاء و سلاطین ہی کی نسبت سے نہیں، ماتحت  
امراء کے مقابل بھی کیا جانے لگے، پھر اس موقف کو مدلل کرنے کے لئے قرآن کریم کی آیات  
کی تفسیر میں، قابل اعتماد طریقوں کی پابندی بھی نہ کی جائے، نیز احادیث پاک کی  
توجیہات بھی اپنی رائے کے مطابق کی جانے لگیں اور اس سلسلے میں رسول اکرم  
صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ وعید بطن الارض خیر لکم من ظہرها (کہ  
اس صورت میں تمہارا روئے زمین پر رہنے کے بجائے زیر زمین چلا جانا بہتر ہے) سے

بھی صرف نظر کر لیا جائے تو فتنوں سے امت کی حفاظت کی کیا سورت ہوگی؟  
اکابر دیوبند میں فلسفہ ولی اللہی اور حکمت قاسمی کے کامیاب ترجمان اور امین  
حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی قدس سرہ نے سلاطین سے شوری کی نسبت  
اور شوری کو درجہ وجوب سے گھٹا کر استحباب کا نقطہ نظر پیش کرنے والوں کے بارے  
میں اس طرح اظہار خیال فرمایا ہے۔

”مشاورت کا مسئلہ اسلام میں بہت بڑا مسئلہ ہے۔ لیکن اسلامی حکومتوں کو  
مشورے سے غالی کر کے مطلق العنان جاہل حکمرانوں اور امیروں کا کھیل بنا دیا گیا  
وہ مسلمانوں کی امانت اور کاروباری خزانے سے اپنی شہوت پرستیوں پر روپیہ صرف  
کرتے ہیں۔ وہ بڑی سی بڑی مصلحت کے مقابلہ میں خیانتیں کرتے ہیں اور ان سے  
کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اس قسم کی غلطیوں کا خمیازہ مسلمانوں کو صرف اس غلط تفسیر  
رجس میں شوری کی حیثیت وجوب سے گھٹا کر استحباب کر دی گئی ہے، کی وجہ سے  
بھگتنا پڑا، ورنہ ہر ایک مسلمان ایک حاکم کے اوپر نگیں تلوار ہے، وہ حاکم کیوں قانون  
اللہی کی اطاعت نہیں کرتا، اگر وہ اطاعت نہیں کرتا تو کس بنا پر ہم سے اطاعت کا  
طلبکار ہوتا ہے، یہ طاقت مسلمانوں میں پھر سے پیدا ہو سکتی ہے اور اس سے ان کی  
جماعتی زندگی آسانی کے ساتھ قرآن کے مطابق بن سکتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ شوری  
کو مستحب بنا کر اسے سیاست اسلامی سے نکال ڈالنے والوں نے اسلام کو سخت  
نقصان پہنچایا ہے۔“ (عنوان انقلاب ۱۲)

حضرت مولانا کا یہ فکر انگیز اقتباس، اسلامی سلطنت کے بارے میں ہے کہ  
سلاطین کو شوری سے بے نیاز بنانے میں اس تفسیر کا بڑا دخل ہے جس میں شوری کی

حیثیت وجوب سے گھٹا کر مستحب کر دی گئی ہے، کیونکہ سلاطین کو اس تفسیر کے مطابق آزادی اور مطلق العنانی مل گئی، اگر اہل علم اور اہل دین ارباب شوری کی نگرانی میں خلافت کی خدمت انجام دی جاتی اور خلفاء کو شوری کے وجوب پر عمل کرنے کا پابند رکھا جاتا تو اسلام کی تاریخ میں وراثت کی بنیاد پر آنے والی خرابیوں کا وجود نہ ہوتا۔ اب مدارس عربیہ کے نظام کار میں شوری کے وجوب سے انکار اور استہجاب کا موقف اختیار کرنے والوں کو ٹھنڈے دل سے اپنے نقطہ نظر پر غور کرنا چاہئے کہ مدارس عربیہ کو ان نقصانات سے محفوظ رکھنے کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔

## ماتحتی کے حق میں شوری کی بالادستی

خلیفہ راشد اور سلطان وقت کیلئے مجلس شوری کی ماتحتی میں کام کرنا ہی ضروری ہے اس کے لئے دلائل گزربچکے ہیں، خلیفہ راشد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مطابق تمام مسلمانوں کے لئے نہایت قابل احترام ہستی ہے لیکن خلیفہ کا راشد ہونا ہی مجلس شوری کی ماتحتی میں ممکن ہے، اگر خلیفہ مستبد الراء ہو جائے اور مشورہ ترک کر دے تو ابن عطیہ کے ارشاد کے مطابق یہ کہنا ضروری ہو جائیگا کہ اس کی خلافت، ملکیت میں تبدیل ہو گئی ہے اور وہ صرف اسی ایک وصف سے محروم ہونے کی بنیاد پر راشد نہیں ہے۔

خلیفہ راشد کے بعد دوسرا درجہ سلطان کا ہے، سلطان کے بے امرت دار آنے کا جو بھی طریقہ ہو لیکن جب وہ درجہ امامت پر فائز ہو جاتا ہے تو اس کو دیگر امراء



سے مختلف احکام میں امتیاز حاصل ہو جاتا ہے، یہاں ماتحت اور بالادست امراء کے درمیان فرق واضح کرنے کیلئے چند چیزیں پیش کی جا رہی ہیں۔

۱۔ سلطان کے مذمقابل محاذ آرائی صرف اسی صورت میں جائز ہے جب اس سے صریح کفر کا صدور ہو، اس سے کم درجہ کی چیزوں یعنی فسق و فجور وغیرہ کے ارتکاب کی صورت میں خروج اور مقابلہ کرنے کی اجازت نہیں ہے بلکہ صبر کرنا ضروری ہے جبکہ ماتحت امراء کی جانب سے ان چیزوں کا صدور ہو تو وہاں صبر کرنا واجب نہیں بلکہ وہاں دوسرا حکم ہے فیض الباری میں حضرت مولانا نور شاہ صاحب کشمیری کا ارشاد ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر امام صریح کفر کا حکم دے تو اس کے خلاف خروج کرنا اور اس کو منصب امامت سے اتار دینا واجب ہے اور اگر امام اس سے نیچے کے گناہوں کا مرتکب ہو یا ظلماً لوگوں کو تکلیف پہنچائے تو خروج جائز نہیں، صبر کرنا واجب ہوگا، البتہ امام کے علاوہ کوئی دوسرا ماتحت امیر یہ حرکت کرے تو اس کی اطاعت ضروری نہیں۔

وجملۃ الامر فیہ ان الامام  
لو امر بالکفر البواح۔ يجب  
الخروج علیہ و خلعہ عن  
الامامة وان عصی او اذی  
الناس يجب علیہم الصبر  
وان امر غیرہ بہا لا تجب  
طاعته۔

(فیض الباری ج ۲ ص ۲۹۹)

گویا قیام مملکت اور بقا نظم کی مصلحت کے سبب امام اور سلطان کو یہ امتیاز دیا گیا ہے کہ کفر کے نیچے فسق و فجور کے ارتکاب اور ظلم وغیرہ پر صبر کیا جائے گا

اور ان کے بالمقابل خروج کی اجازت نہ ہوگی، لیکن ماتحت امراء کا حکم اس سے مختلف ہے، شیخ ابو زہرہ مصری، علامہ ابن تیمیہ کے حوالہ سے سلطان اور ماتحت امراء کے درمیان فرق اس طرح بیان کرتے ہیں۔

” وجہ فرق و امتیاز یہ ہے کہ خلافت عالیہ کے منصب پر قابض ہونے والے کو فتنہ انگیزی کے بغیر سخت خلافت سے اتارنا ممکن نہیں ہے، ظاہر ہے کہ فتنہ گری میں انار کی پھیل جاتی ہے اور انار کی ایک لمحہ میں ایسے فسادات کو جنم دیتی ہے جو سالہا سال میں بھی رونما نہیں ہوتے، البتہ نچلے عہدہ والے کو فتنہ خیزی کے بغیر بھی معزول کر سکتے ہیں، خصوصاً جبکہ امام و خلیفہ سے مدد حاصل کر کے اس کو معزول کرنے کی کوشش کی جائے تو اس میں سرے سے کوئی اشکال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

(اسلامی مذاہب ص ۱۰۶ بحوالہ منہاج السنۃ ص ۷۱)

گویا خلاف شرع امور کے ارتکاب کی صورت میں، امام اور ماتحت امراء کے درمیان حکم میں فرق ہے اور امام کے حق میں اس کے مرتبہ اور درجہ کی رعایت رکھتے ہوئے امتیازی احکام دیئے گئے ہیں جبکہ ماتحت امراء کے حق میں اس کی رعایت نہیں رکھی گئی ہے۔

۲ — ملا جیون رحمہ اللہ، التفسیرات الاحمدیہ، میں شرح عقائد کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔

المستور فی کتب الشافعیۃ	شوافع کی کتابوں میں درج ہے کہ امام
ان الامام لا ینعزل	فسق کے ارتکاب سے معزول نہیں
بالفسق لان فی انعزالہ	ہوتا اس لئے کہ اس کو معزول کرنے

اور دوسرے کو مقرر کرنے میں فتنہ انگیزی ہے کیونکہ اس کو اقتدار حاصل ہے، برخلاف قاضی کے کہ وہ امام شافعی کے یہاں فسق کے سبب معزول ہو جائے گا، کیونکہ اس کو اقتدار حاصل نہیں ہے، شرح عقائد میں اس کی تصریح ہے۔

ونصب غيره اثارا الفتنه  
لما من الشوكه بخلاف  
القاضي فانه يعزل عنده  
بالفسق لانه غير ذي شوكة  
كما نص به في شرح العقائد  
(التفسيرات الحمديه ۲۹۱)

امام اور قاضی کے درمیان یہ واضح فرق ہے جس سے یہ ثابت ہے کہ ماتحت امار کے بعینہ وہ احکام نہیں ہیں جو سلطان کے ہیں۔  
۳۔ فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ میں، کتاب الحدود میں سلطان اور دیگر امار کے درمیان اجراء حدود میں فرق مذکور ہے۔

ہر وہ چیز جس کا ارتکاب اس امام سے ہو جائے جس کے اوپر کوئی امام نہیں تو اس کے اوپر حد جاری نہ ہوگی، علاوہ قصاص کے، اسلئے کہ قصاص اور اموال کا مواخذہ بالادست امام سے بھی ہوگا کیونکہ حدود حقوق الہی ہیں اور ان کا قائم کرنا خود امام کا کام ہے دوسروں کا نہیں اور وہ اپنے اوپر حد قائم نہیں کرے گا، کیونکہ یہ عمل بے فائدہ ہوگا،

وكل شئ صنعه الامام  
الذي ليس فوقه امام فلاحد  
عليه الا القصاص فانه يوحذبه  
وبالاموال لان الحدود حق  
الله تعالى واقامتها اليه لا الى  
غيره ولا يمكنه ان يقيمو على  
نفسه لانه لا يفيد  
بخلاف حقوق العباد  
لانه يستوفيه ولي

الحق اما بتمکینه او  
بالاستعانة بمنعة  
المسلمین والقصاص  
والاموال منها -  
(ہدایہ مج ۵۲)

البتہ حقوق العباد کا وصول کرنا حقداروں  
کا کام ہے اس لئے وہ اپنا حق وصول  
کریں گے اور ان کی وصولیابی اس طرح  
ہوگی کہ امام خود اپنے اوپر قابو دیدے  
یا مسلمانوں کی عوامی طاقت کے ذریعہ  
وصول کیا جائے، اور قصاص اور اموال  
حقوق العباد میں سے ہیں۔

اس عبارت میں بھی صراحت ہے کہ اجراء حدود کے سلسلے میں بھی امام اور  
ماتحت امر کے درمیان فرق کیا گیا ہے۔

ان چند حوالوں سے یہ بات ثابت ہوئی کہ تمام امراء کا ایک حکم نہیں ہے،  
ماتحت امر کے احکام الگ ہیں اور سلاطین کے احکام الگ ہیں، یہاں اس فرق  
کو واضح کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جس نقطہ نظر میں مہتمم کو امیر قرار دے کر انھیں مجلس  
شوریٰ پر بھی بالادستی دیدی گئی ہے اس پر یہ اشکال ہے کہ جب مجلس شوریٰ  
کی بالادستی خلیفہ راشد پر قائم ہے، سلاطین پر قائم ہے جب کہ انھیں امتیازی  
حیثیت حاصل ہے اور بعض احکام شرعیہ میں ان کی بالادستی کی رعایت ملحوظ ہے  
تو ماتحت امر کے اوپر مجلس شوریٰ کی بالادستی قائم کرنے میں احکام شرعیہ کی قطعاً  
خلاف ورزی نہیں ہے بلکہ ایسا کرنا ضروری ہے۔

اولاً تو اس وجہ سے ضروری ہے کہ عوامی چندے سے چلنے والے مدارس عربیہ  
میں چندہ کا جواز ہی ارباب صل و عقد کی مجلس شوریٰ کے قیام سے ہوتا ہے جیسا کہ

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہما اللہ کی مراسلت سے یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے، ثانیاً اس لئے کہ عصر حاضر میں کسی جماعت کے ہاتھ میں مدارس کی زمام کار کا دینا ہر اعتبار سے قرین مصلحت ہے اہلیت کی بنیاد پر مناصب کے لئے انتخاب کا عمل بھی آسان ہو جاتا ہے اور مالی دیانت کا وثوق بھی اسی سے بڑھتا ہے، حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب لکھتے ہیں:

”اگر اہل شوریٰ اور معاونین دارالعلوم کی اکثریت کسی ایک شخص کو تمام اختیارات تفویض کر دینے کے حق میں ہو تو مضائقہ نہیں لیکن فی زمانہ قومی اداروں کا نظم و نسق جماعت کے ہاتھ میں رہنا اوفیٰ بالمصالح ہے (کفایت المفتی مج ۲۲۳)

اس کا مفہوم یہ ہوا کہ اگر ایک ہی شخص کو تمام اختیارات دے جائیں تو ان اختیارات کو دینے والے بھی اہل شوریٰ ہی ہیں اس لئے شوریٰ کی بالادستی اس صورت میں بھی محفوظ ہے، اور تمام اختیارات کی تفویض میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں ہے، مگر حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایسا کرنا قرین مصلحت نہ ہوگا، مصلحت اسی میں ہے کہ قومی اداروں کا نظم و نسق جماعت کے ہاتھ میں رہے اور یہ جماعت، محدود اختیارات کسی شخص کو دے کر اس سے کام لے، اس طرح یہ شخص مجلس شوریٰ اور جماعت کی نسبت سے مامور، اور کارکنان ادارہ کی نسبت سے امیر ہوگا۔



## ایک ہی شخص کے امیر و مامور ہونے کی وضاحت

رہا یہ کہ ایک ہی شخص امیر بھی ہو اور دوسری حیثیت سے مامور بھی ہو۔ تو اس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ حضرات علمائے ... کلکورا ع و کلکو مسئلہ عن رعیتہ کے تحت یہ بحث منقح فرمادی ہے۔ اور ہماری اس تحریر کے آغاز میں اس کا خلاصہ دیا جا چکا ہے کہ علامہ ابن حجر نے فتح الباری ج ۳ ص ۱۳۱ پر ارشاد فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ”کلکم راع“ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب ہی راعی اور امیر ہو گئے تو اب ماتحت کون رہے گا۔ مگر جواب میں فرماتے ہیں کہ صاف بات یہ ہے کہ ہر انسان میں دو حیثیتیں ہو سکتی ہیں کہ وہ اپنے ماتحتوں کے لئے امیر ہو اور بالادستوں کے سامنے جواب دہ اور ان کا مامور ہو۔

نیز علامہ عینی رحمہ اللہ نے عمدۃ القاری ج ۳ ص ۲۶۸ میں یہ اضافہ فرمایا کہ اپنی بات کو مثال سے بھی سمجھا دیا، سوال تو یہی ہے کہ جب کلکم راع کے سب ہی انسان مصداق ہیں اور وہ اپنی اپنی جگہ امیر یا بالادست ہیں تو اب ماتحت کون رہا؟ اس کا علامہ نے بڑا محققانہ تجزیہ کیا ہے، اور وہ اس کے دو محمل بیان کرتے ہیں کہ اگر اس روایت کو صرف باب دیانت سے متعلق مانا جائے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر شخص راعی ہے اور مرعی اس کے اعضاء و جوارح ہیں یعنی وہ پروردگار کی بارگاہ میں آخرت میں جواب دہ ہوگا کہ اس نے اپنی ذمہ داریوں کو کہاں تک



پورا کیا۔

اور اگر اس روایت کو باب الاحکام سے بھی متعلق مانا جائے جیسا کہ امام بخاری کا اس روایت کو کتاب الاحکام میں ذکر کرنا بتلا رہا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہی شخص میں راعی اور مرعی یعنی بالادستی اور ماتحتی کی دونوں جہتیں جمع ہو سکتی ہیں مثلاً ہر شخص اپنے اہل خانہ کی نسبت سے بالادست ہے لیکن امام اور سلطان کی نسبت سے اس کو ماتحت، زیر دست اور جواب دہ قرار دیا جائیگا۔ ان معروضات کا خلاصہ یہ ہوا کہ امام اور سلطان کے علاوہ ہر امیر میں دو حیثیتیں ہو سکتی ہیں، اس لئے مدارس عربیہ کے مہتمم کے بارے میں یہ بات کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ ان میں یہ دونوں حیثیتیں ہیں وہ ماتحتوں کے حق میں امیر۔ . . . . . اور بالادستوں یعنی ثوری کے حق میں مامور ہیں کیونکہ یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ مہتمم سلطان کے درجہ کے امیر نہیں ہیں۔

بالفرض اگر ان مدارس عربیہ کا انتظام اسلامی حکومت کے تحت ہوتا تو مہتمم کی حیثیت نہ سلطان کی ہوتی اور نہ وزیر تعلیم کی بلکہ ان کی حیثیت وزارت تعلیم کے تحت محدود دائرے میں کام کرنے والے ناظم مدرسہ یا پرنسپل کی ہوتی کہ طلبہ اور کارکنان پر ان کو امیر تسلیم کر لیا جاتا لیکن اپنے بالادستوں یعنی وزراء اور سلطان کے مقابلہ میں انھیں ماتحت اور مامور ہی قرار دینا ضروری ہوتا۔

اس لئے مدارس عربیہ کے موجودہ طریق کار میں مہتمم کے بارے میں یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ اس کو سلاطین کی طرح ایسی سربراہی اور امارت حاصل ہے کہ

اس کے اوپر کسی کی بالادستی درست نہ ہوگی، اور اگر اس کے اوپر کسی کو مقرر کر دیا گیا تو یہ خلاف شرع ہو جائیگا، امیر مامور کے درجہ میں آجائے گا اور جس دستور اساسی میں امیر کو مامور کا درجہ دیدیا گیا ہو اس کو بدل ڈالنا اور نظام شریعت کے مطابق کرنا ضروری ہو جائے گا۔

## مشورہ طلب مسائل کیا ہیں

یہاں تک یہ مسائل شرعی دلائل کے ساتھ واضح ہو چکے ہیں کہ شریعت میں مشورہ کا کیا مقام ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس سلسلے میں کیا عمل رہا، آپ کے لئے مشورہ کی کیا حیثیت تھی، خلفاء راشدین کے زمانہ میں کیا تعامل رہا۔ خلیفہ راشد کیلئے مشورہ کا کیا حکم ہے، سلطان کو مجلس شوری سے کیا نسبت ہے اور ماتحت امار کے لئے اس کا کیا درجہ ہے، اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مشورہ کن مسائل میں ہے؟

اجمالاً یہ بات سامنے آچکی ہے کہ مشورہ کسی بھی سلسلے میں حکم شرعی تک پہنچنے کے لئے ہوتا ہے اس لئے جس مسئلہ میں بھی حکم شرعی خفا میں ہو اس میں مشورہ کرنا ضروری ہے، اور جب کسی معاملہ میں حکم شرعی واضح ہو جائے تو سب کے لئے اس کا تسلیم کر لینا ضروری ہے، عام طور پر امور دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک دینی امور، اور دوسرے انتظامی۔ دینی امور میں فیصلے کی طاقت صرف کتاب و سنت میں ہے فان تنازعتم فی شئ فردوا الی اللہ والرسول کے تحت یہ بحث گذر چکی ہے اور اس

سلسلے میں خلفاء راشدین کا طرز عمل بھی سامنے آچکا ہے کہ ان کے یہاں تمام مشوروں میں کوشش یہی ہوتی تھی کہ قرآن و حدیث کا حکم معلوم ہو جائے، اگر حکم صراحت سے مل جاتا تو فوراً اس کو قبول کر لیا جاتا اور اگر صراحت سے نہ ملتا تو اس کی تطبیق پر قیاس کیا جاتا، قواعد کلیہ کے تحت جزئیات کو داخل کر کے حکم معلوم کیا جاتا، علت کا تعدیہ کر کے معلوم کیا جاتا وغیرہ، اور اگر انتظامی امور سے متعلق بات ہوتی تو مشورہ میں جو بات طے ہو جاتی اس پر عمل درآمد کیا جاتا، اور مشورہ میں اختلاف ہوتا تو اکثریت کی بنیاد پر فیصلہ کیا جاتا۔

اب نوعیت یہ ہے کہ مجتہدین کرام اور ان کے بائع نظر متبعین فقہاء نے علمی مجلس مشورہ منعقد کر کے، یا اجتہاد فرما کر لاکھوں جزئیات کا حکم قلم بند کر دیا ہے اس لئے امور مشورہ طلب میں ہمارے لئے اتنی جانکاہی کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ مشورہ کی بنیاد پر یہ منزل بڑی حد تک سر کی جا چکی ہے، حضرت امام اعظم رحمہ اللہ کی مساعی جمیلہ کے بارے میں ہے۔

امام اعظم ابو حنیفہ کے فقہی اجتہادات بھی شوری ہی کے ذریعہ مدون کئے گئے ہیں، یہ بات گذر چکی ہے کہ جن حضرات نے امام صاحب کی کتابیں مدون کی ہیں ان کی تعداد چالیس تھی، جب کوئی تازہ واقعہ پیش آتا تو امام صاحب ان سے مشورہ کرتے سوال و جواب کرتے،

وفقه ابي حنيفة قد دون  
كذلك بالشورى فقد  
تقدم ان الذين دونوا الكتب  
لابي حنيفة كانوا اربعين  
رجلا فاذا نزلت نازلة  
شاورهم وسائلهم  
وسمع ما عندهم

من الآثار والاحادیث  
ویقول ما عندہ حتی  
یتفقوا علی احد الاقوال  
فیہا باثباتہ وکتابتہ۔

(مقدمہ اعلام السنن ۲۵)

امام صدر الائمہ لکھتے ہیں۔

فوضع ابوحنیفۃ رحمہ اللہ  
مذہبہ شوری بینہم ولم  
یستبد فیہ بنفسہ و نہم  
اجتہاد امنہ فی الدین  
ومبالغۃ فی النصیحة  
للہ ورسولہ والمومنین

(مناب موفق ۱۲۱)

ان کے پاس جو آثار و حدیث ہوتے ان  
کو سنتے اور اپنے پاس جو ہوتا وہ انکے  
سامنے پیش کرتے یہاں تک کہ سب  
کسی ایک بات پر متفق ہو جاتے تو اس  
کو لکھ لینے کا حکم دیتے۔

امام ابوحنیفہ نے اپنا مذہب شوری کے  
ذریعہ مدون کیا ہے، اپنے اصحاب کے  
بغیر محض استبداد بالرائے کے طور پر  
نہیں کیا، یہ کام امام صاحب نے دین  
کی خدمت کے لئے پوری کوشش  
صرف کرنے کے جذبہ کے تحت کیا، اور  
اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم  
کے ساتھ خیر خواہی کے جذبہ کے تحت کیا

چالیس نفری مجلس شوری کے ذریعہ امام صاحب نے جو مسائل مستنبط  
فرمائے ان کی تعداد کے سلسلے میں مائلی قاری فرماتے ہیں۔

امام صاحب رحمہ اللہ نے تراسی ہزار  
مسائل کے احکام قلم بند کرائے ہیں جن  
میں سے اڑیس ہزار مسائل عبادات

انہ وضع ثلاثۃ الاف  
وشمانین الف مسئلۃ منها  
ثمانیۃ وثلاثون الفافی

العبادة والباقی فی المعاملات سے متعلق ہیں اور بقیہ مسائل معاملات سے متعلق ہیں۔

(ذیل الجواہر ۲/۲۱۲ بحوالہ مقام ابو حنیفہ)

جب ایک امام کی کوششوں کا یہ حال ہے تو غور کر لیا جائے کہ تمام ائمہ اور ان کے ہزاروں نہیں لاکھوں متبعین کی کوششوں اور کاوشوں سے کون سا جزئیہ ہوگا جس کا حکم مستنبط نہ ہوا ہوگا؟ اس لئے اب مجلس شوریٰ کا کام بہت کم رہ گیا ہے، اب براہ راست قرآن و حدیث کی طرف صرف انہی مسائل میں رجوع کرنا ضروری ہوگا جو واقعہً نئے ہوں اور ائمہ یا ان کے متبعین سے ان جزئیات کا تریح حکم منقول نہ ہو۔ یا مسائل تو پرانے ہوں لیکن ان کی نوعیت میں ایسی تبدیلی آگئی ہو کہ مسئلہ از سر نو قابل غور بن گیا ہو۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ کے تلمیذ مولانا محمد شاہد صاحب سلمیٰ المتوفی ۱۹۷۱ء نے اس موضوع پر رقم فرمایا ہے۔

” خلفاء راشدین کے زمانہ میں جو مشورہ ہوتا تھا وہ ذیل کی اغراض کے لئے ہوتا تھا (۱) کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ میں کوئی حکم موجود ہو تو اس کو واقعہ کے ساتھ تطبیق دینا (۲) اگر نہ ہو تو اجتہاد کرنا اور مجتہدین کی آراء میں ترجیح دینا (۳) جن امور کو شریعت نے خلیفہ وقت کے ہاتھ میں تفویض کر دیا ہے اس کے متعلق مصالح پر بحث کرنا۔

لیکن آج کل چونکہ جملہ قوانین سیاسیہ بشکل کتب مدون ہو چکے ہیں اس لئے آج کل صرف اغراض مذکورہ کے ماتحت مشورہ کیا جائے (۱) قوانین سیاسیہ شرعیہ کو واقع پر تطبیق دینے میں غور و خوض کرنا (۲) جن امور کو شریعت احمدیہ

نے چند اجمالی قوانین بیان کر کے خلیفہ وقت کی مصلحت اندیشی پر چھوڑ دیا ہے اس کی مصالح و مضار پر بحث کرنا: (فتح الکریفی فی سیاست النبی الامین ص ۲۵)

حضرت مولانا مشاہد صاحب کے اس قابل قدر تجزیہ پر یہ اضافہ ضروری ہے کہ اگر ارباب شوری نے اعتماد کر کے تمام اختیارات خلیفہ کے سپرد کر دیئے ہیں تو یہ تجزیہ درست ہے کہ وہ خلیفہ اپنے اختیار سے کام کرے گا اور شوری محض مصلحت و مضرت پر بحث کرے گی، لیکن اگر شوری نے تمام اختیارات خلیفہ کو نہیں دیئے ہیں بلکہ وہ محدود دائرے میں خلیفہ سے کام لینا چاہتی ہے اور امت کے حق میں یہی مناسب اور مصلحت کے مطابق سمجھتی ہے کہ اختیارات شوری ہی کے پاس رہیں تو نہ صرف یہ کہ اس کے عدم جواز کی کوئی دلیل نہیں بلکہ خلافت راشدہ میں اس کی نظیر صراحت کے ساتھ موجود ہے، کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابو لؤلؤ کے زخم کاری سے متاثر اور اپنی زندگی سے مایوسی کے وقت جو چھ نفری مجلس شوری مقرر کی تھی اس مجلس نے تین دن تک اقتدار کی زمام اپنے پاس رکھی اور محدود اختیارات دے کر حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے کام لیا، ان تین دنوں میں امامت کبریٰ یا خلافت عالیہ کا منصب کسی فرد واحد کے پاس نہیں تھا جب کہ شوری کی ہیئت اجتماعیہ ہی، ہیئت حاکمہ تھی، اس کی تصریح علامہ سعد الدین تفتازانی نے شرح عقائد میں فرمادی ہے

اگر یہ کہا جائے کہ امامت کو شوری کی  
چھ نفری کمیٹی کے سپرد کرنا کیسے صحیح  
ہوگا جبکہ ایک وقت میں دو اماموں

فان قيل كيف يصح جعل

الامامة شوری بین الستة

مع انه لا يجوز نصب امامين



کا تقرر جائز نہیں، ہم یہ جواب دینگے  
کہ ناجائز تو دو اماموں کا مستقل طور  
پر تقرر ہے جن میں سے ہر ایک کی اطاعت  
الگ الگ واجب ہو کیونکہ اس صورت  
میں متضاد احکام کی تعمیل لازم آئیگی  
لیکن شوری کی نوعیت بالکل دوسری ہے  
کیونکہ یہاں ان کی ہیئت مجموعی ایک  
امام کے درجہ میں ہے۔

فی زمان واحد قلنا  
غیر الجائز هو نصب امامین  
مستقلین تجب اطاعت  
کل منہما علی الافراد  
لما یلزم فی ذلک من امثال  
احکام متضادة واما فی  
الشوری فالکل بمنزلۃ  
امام واحد (شرح عقائد ص ۱۱۱)

علامہ نقضانی کے ارشاد کا صریح مفہوم یہ ہے کہ وہ امامت کبریٰ کو مجلس شوریٰ  
کے سپرد کر دینے میں عدم جواز کی کوئی دلیل نہیں پاتے، کیونکہ انھوں نے ہیئت  
مجموعی کو فرد واحد کا حکم دیا ہے۔

اس سے یہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس مجلس شوریٰ  
کو یہ ہدایت بھی فرمادیتے کہ انتخاب خلیفہ کے بعد بھی مجلس شوریٰ امام اور خلیفہ کی  
نگراں رہے گی تو اس میں کوئی حرج نہیں تھا، لیکن ایسا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے  
شاید اس لئے نہیں فرمایا کہ اول تو وہ دور ہی خیر القرون کا ہے جس میں خلیفہ شوریٰ  
سے بے نیاز اور مستبد بالرائے ہو کر کام کرنے کا وہم بھی نہیں رکھتا، دوسرے یہ کہ  
جب انتخاب خلیفہ کا کام جو امور سلطنت میں سب سے اہم کام ہے وہ مجلس شوریٰ  
کے سپرد ہے تو انتخاب کے بعد نگرانی کا معاملہ تو اس سے آسان اور کمتر درجہ کی چیز  
ہے، اور امر ہم شوریٰ بینہم کے عام اور صریح حکم کے بعد مزید تصریح کی ضرورت نہیں ہے

## ایک کام کیلئے ایک سے زائد افراد کی ہیئت مجموعی کا حکم

الشیء بالشیء یذکر بات سے بات نکلتی ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نہایت اختصار کے ساتھ اس مضمون کو بھی منقح کر دیا جائے کہ ایک خدمت کے لئے ایک سے زائد افراد کی ہیئت مجموعی کا اختیارات کی تفویض کے ساتھ تقرر کرنا شریعت اسلامی میں ناجائز نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مقرر فرمودہ چھ نفری مجلس شوریٰ پر آپ علامہ تفتازانی کا تبصرہ پڑھ چکے ہیں کہ شوری کی صورت میں چند افراد کی ہیئت مجموعی کو وہ فرد واحد کا حکم دے رہے ہیں، لیکن اس کے علاوہ بھی قرآن و حدیث اور فقہاء کی تصریحات اس سلسلے میں موجود ہیں، مثلاً۔

۱۔ احرام کی حالت میں شکار کرنے کی ممانعت ہے، اگر کسی شخص سے یہ غلطی ہو جاتی ہے تو اس کی جزا واجب ہے، کس شکار کے عوض کیا واجب ہوگا اس کا قرآن کریم میں یہ حکم ہے کہ شکار کے مثل جانور جزا کے طور پر واجب ہے جس کا فیصلہ دو عادل مسلمان کریں گے، ارشاد ہے۔

فجزاء مثل ما قتل من النعمان يحكم به ذوا عدل منكم۔  
توپا داس واجب ہوگی جو اس جانور کے مساوی ہوگی جس کو اس نے قتل کیا، جس کا فیصلہ تم میں سے دو معتبر شخص کریں گے۔

آیت میں فرمایا گیا ہے کہ احرام کی حالت میں شکار کرنے کی وجہ سے جو

پاداش واجب ہوتی ہے اس کا فیصلہ دو معتبر شخص کریں گے۔ یہ حکم کسی بھی سلسلے میں ایک سے زائد افراد کے ہئیت حاکم ہونے کی نظر کے لئے کافی ہے۔

۲۔ امام بخاری قدس سرہ نے ایک باب مستقل اسی عنوان سے قائم کیا ہے

باب امر الوالی اذا وجبہ

امیرین الی موضع۔ اس بات کا بیان کہ اگر والی کسی ایک جگہ کیلئے دو امیروں کو روانہ کرے۔

اس باب کے تحت فتح الباری میں ابن عربی کی طرف منسوب کرتے ہوئے

مقصود ترجمہ کا تعین اس طرح کیا گیا ہے۔

قال ابن العربی کان

النبی صلی اللہ علیہ وسلم

اشترکھما فی ما ولاھما

فکان ذلک اصلا فی

تولیۃ اثنین قاضیین

مشرکین فی الوکایۃ

عذاجزم بہ۔

فتح الباری ج ۱۲

معلوم ہوا کہ اگر ایک سے زائد افراد کو کسی کام کیلئے یکساں اختیارات دیئے

جائیں تو وہ باہمی مشورہ سے معاملات طے کرنے کے بعد امور مفوضہ کی انجام دہی

کریں گے۔

۳۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ البالغہ میں اس موضوع سے متعلق لکھتے ہیں

و لیس للاعوان حصر فی عدد

معین لکنہ یدور علی دقران

حاجات المدینۃ فریبا تنفع

الحاجة الی اتخاذ عونین فی حاجة

(حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۲)

معلوم ہوا کہ ایک کام کے لئے ایک سے زائد افراد کے تقرر میں کوئی قباحت

نہیں ہے پھر یہ کہ معاملہ اگر ان دونوں کے یکساں اختیارات کا ہے اور وہ معاملہ

رائے اور مشورے کا بھی محتاج ہے، تو دونوں کے اشتراک کے بغیر کارروائی

جائز نہیں۔

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ ایک استفتاء کے

جواب میں لکھتے ہیں۔

متولی کا فرد واحد ہونا لازم نہیں، اختیارات تولیت متعدد افراد کے

سپردے جاسکتے ہیں۔ (کفایت المفتی ص ۳۲)

غرض قرآن و حدیث کے مضامین اور علماء امت کے ارشادات و فتاویٰ

سے یہ بات پوری طرح ثابت ہے کہ ایک کام کیلئے ایک سے زائد افراد کی ہیئت

مجموعی کا تقرر از روئے شرع بالکل درست ہے اس لئے مدارس عربیہ کا انتظام اگر

فرد واحد کے ہاتھ میں نہ ہو بلکہ مجلس شوریٰ کی ہیئت حاکمہ کے سپرد ہو تو اس میں

کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ پہلے گزر چکا ہے کہ یہ طرز نہ صرف یہ کہ اس دوز کی مصلحت

کے مطابق ہے اور اس میں احتیاط کے زیادہ سے زیادہ پہلو ہیں بلکہ مدارس عربیہ

کے نظام کار میں چندہ کی وصولیابی کا جواز ہی اس سے پیدا ہوتا ہے کیونکہ یہ لولوامر کی وہ جماعت ہے جو ہندوستان میں سلطان کے قائم مقام ہو کر اس کی اجازت دیتی ہے

## اختلاف رائے کی صورت میں فیصلے کا طریقہ

البتہ اگر ایک سے زائد افراد کسی کام کے ذمہ دار ہوں گے تو ان میں اختلاف رائے ہو سکتا ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ اس میں فیصلے کا کیا طریقہ ہے، ظاہر ہے کہ یہ اختلاف رائے اس صورت میں ممکن نہیں ہے جب قرآن و حدیث میں حکم صریح پایا جاتا ہو یا حکم صریح نہ ہو لیکن زیر غور مسئلہ کی قرآن و حدیث میں صرف ایک ن نظر ہو، یا زیر غور مسئلہ کسی ایک ہی قاعدہ کلیہ کے ذیل میں آتا ہو۔

اختلاف اسی صورت میں ممکن ہے کہ زیر غور مسئلہ قرآن و حدیث میں صریح نہ ہو، اور اس کے لئے ایک سے زائد نظریں ہوں یا ایک ہی جزیئہ کئی حیثیتوں سے ایک سے زائد قواعد کلیہ کے تحت آتا ہو، ایسی صورت میں اہل مشورہ کے ذیل میں اختلاف ہو جائیگا کہ کیا فیصلہ کیا جائے، اس سلسلے میں سب پہلے تو یہ عرض ہے کہ مسائل فقہیہ کی تدوین کے بعد اس اختلاف کے مواقع بہت کم رہ گئے ہیں کیونکہ ان مسائل کے بارے میں قرآن و حدیث کا حکم امت کے عالی دماغ علماء نے غور و فکر اور مشورے کے بعد معلوم کر لیا ہے، دوستے اگر فقہ کی تدوین کے ساتھ ساتھ اصول فقہ کی تدوین بھی مکمل ہو چکی ہے اس لئے اگر تدوین ذخیرہ میں اس جزیئہ کا حکم نہیں ملتا تو اصول فقہ کی روشنی میں حکم معلوم کر لیا جائے۔

اب یہ بات بہت آسان ہے کہ جب کوئی تازہ واقعہ سامنے آئے تو سب سے پہلے فقہ و فتاویٰ کی کتابوں میں حکم معلوم کر لیا جائے اور اگر ان کتابوں میں بھی حکم معلوم نہ ہو تو اب چونکہ استنباط مسائل کا ائمہ کرام کا معین کردہ طریق کار تجربہ کی روشنی میں کامیاب اور امت کے قابل اعتماد علمائے کے نزدیک درست ثابت ہوا ہے اور اصولی طور پر اس کی صحت پر امت کا اجماع ہو چکا ہے اس لئے اگر فقہ کی کتابوں میں حکم معلوم نہ ہو تو اصول فقہ کی روشنی میں حکم معلوم کر لیا جائے۔ امت کے پاس حکام شرعیہ معلوم کرنے کے لئے اب یہ دو مضبوط بنیادیں ہیں اور امید کی جاسکتی ہے کہ اگر دیانت و اخلاص کے ساتھ فیصلہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے تو اختلاف کی نوبت نہیں آئے گی۔

مثلاً مدارس عربیہ میں شوریٰ کی بالادستی کا معاملہ ہے، اس سلسلے میں دو نقطہ نظر سامنے آئے ہیں، ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ مشورہ کا حکم صرف استیجاب کا درجہ رکھتا ہے اور مہتمم امیر ہیں اور امیر کو شریعت نے یہ اختیار دیا ہے کہ وہ اقلیت اکثریت یا اپنی رائے میں سے کسی بھی رائے کو ترجیح دے سکتا ہے، دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ مہتمم ماتحتوں کے لئے امیر اور مجلس شوریٰ کی نسبت سے مامور ہیں، مشورہ مستحب نہیں بلکہ واجب ہے، مجلس شوریٰ صرف مشورہ دینے والی جماعت نہیں بلکہ اولوالامر اور ارباب حل و عقد کی وہ جماعت ہے جس کی اجازت کے بغیر عوامی چنڈے کی دھویا بی ہی محل نظر ہو جاتی ہے۔

پہلے نقطہ نظر کی سب سے مضبوط دلیل قرآن کریم کی آیت و شاورہم فی الامر فاذا عزمتم فتوصل علی اللہ ہے، اس نقطہ نظر کے دلائل کا طریق



استدلال یہ ہے کہ اذا عزمت میں کوئی قید نہیں ہے کہ وہ اکثریت کے مطابق ہو یا اقلیت کے، نیز یہاں عزمت فرمایا گیا ہے عزمو انہیں فرمایا گیا، اس لئے امیر کو یہ اختیار ہونا چاہئے کہ وہ جس جانب کو چاہے اپنے عزم سے ترجیح دیدے، اس نقطہ نظر کے وکلاء کے پاس عہد رسالت یا خلافت راشدہ کے کچھ واقعات بھی ہیں جن کو وہ اپنے نقطہ نظر پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں

دوسرے نقطہ نظر کے وکلاء کے پاس قرآن کریم کی دونوں آیتوں شادھم اور امروھو شوریٰ بینہم کی اشارۃ النص ہے، اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم میں ولوالامر کے مصداق اولین کی حیثیت سے مجلس شوریٰ کی تعیین پر متعدد اہل علم کے استنباطات ہیں، عہد رسالت کے مختلف واقعات، اور خلافت راشدہ کا پورا دور اسی نقطہ نظر کا ترجمان ہے، اور مجلس شوریٰ کے بارے میں یہ حقیقت بالکل منقطع ہے کہ اس کو خلفاء اور سلاطین پر بھی بالادستی حاصل ہے، رہا ماتحت امرار یا ہتھم کے اوپر بالادستی کا سوال، تو اس سلسلے میں حقیقت بالکل بدامت کے درجہ میں ہے کہ یہ سلاطین کے درجہ کے امیر نہیں ہیں اور جب سلاطین پر بھی شوریٰ کی بالادستی شرعاً ثابت ہے تو اس طرح کے ماتحت امرار کو کسی بھی فرد یا جماعت کے ماتحت کر دینے میں کوئی خلاف شرع بات نہیں ہے

ان دونوں نقطہ ہائے نظر میں سے کون سا نقطہ نظر درست ہے اس کے لئے نہایت آسان بات یہ ہے کہ پہلے فقہ و فتاویٰ کی کتابوں میں حکم دیکھ لیا جائے وہاں نہ ملے تو حنفیہ نے قرآن و حدیث کے لئے فہم معانی کا جو طریقہ مقرر کیا ہے

اس کے مطابق فیصلہ کر لیا جائے، فقہ کی کتابوں میں اس موضوع پر جو موجود ہے وہ پیش کیا جا چکا ہے کہ وہ دو سے نقطہ نظر کی تائید میں ہے۔ اس کے اصول فقہ کی کسوٹی پر پرکھنے کے بارے میں عرض ہے کہ پہلے نقطہ نظر کے وکلاء نے جس طرز پر استدلال کیا ہے وہ حنفیہ کے نقطہ نظر سے درست نہیں ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ یہ آیت اصالة رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں نازل ہوئی ہے، اس لئے اس آیت سے آپ کے حق میں مشورے کے حکم پر استدلال عبارتہ النص ہے، لیکن دیگر امرائے حق میں یہ استدلال اسی وقت ممکن ہے جب اس کو اشارۃ النص یا اقتضاء النص کے طور پر جاری کیا جائے، اور یہ بات تفصیل سے بیان کی جا چکی ہے کہ شاید ہوا کی دلالت النص تو دیگر امراء کو مشورہ کا پابند بناتی ہے لیکن عزمت میں اس کا اجر لے کر دے دیا جائے کہ حق میں حکم معلوم نہیں کیا جاسکتا۔

اس نقطہ نظر کے وکلاء کا اصل استدلال یہ ہے کہ عزمت میں کوئی قید نہیں ہے کہ آپ کا یہ عزم اکثریت کے مطابق ہو یا اقلیت کے، اس لئے قید ہونے کے سبب یہ آیت دراصل مطلق ہے اور مطلق حنفیہ کے نزدیک مطلق ہی رہتا ہے، اس لئے عزم میں کوئی قید نہیں لگائی جائے گی بلکہ اس کو بلا قید اور اعلام رکھا جائیگا کہ یہ عزم جس جانب سے متعلق ہو جائے اسی کے مطابق اقدام کیا جائیگا یہ استدلال حنفیہ کے نقطہ نظر سے درست ہے، لیکن اس کا اجر صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے لئے تو ہوتا ہے دیگر امرائے حق نہیں ہوتا، دونوں نقطہ نظر کی تفصیل کے بعد اب یہ عرض ہے کہ حنفیہ کے لئے اس

مسئلہ میں فیصلہ آسان ہے کہ جو نقطہ نظر ان کے قابل اعتماد فقہاء کی تصریحات کے مطابق ہے، یا قابل اعتماد فقہاء کے طریق استنباط کے مطابق ہے وہ اس کو قبول کر لیں اور دوسرے کو ترک کر دیں جیسا کہ اکابر دارالعلوم میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، حضرت مولانا رفیع الدین صاحب نے اور قریب ترین اکابر میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی اور حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب رحمہم اللہ نے مجلس شوریٰ کی بالادستی کا اعتراف کیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ فقہی جزئیات کی تدوین اور قرآن و حدیث کے اصول استنباط کی تعیین کے بعد فیصلہ بہت آسان ہو گیا ہے، کیونکہ قرآن کریم میں اختلاف کی صورت میں کتاب و سنت کی طرف مراجعت کا جو حکم دیا گیا تھا اور اس کے علاوہ کوئی اور صورت نہیں بٹلائی گئی تھی، اب اس حکم پر عمل آسان ہو گیا ہے کیونکہ امت کے مالی دماغ فقہاء کرام نے لاکھوں جزئیات کا حکم قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان کر دیا ہے اور تازہ یا باقی ماندہ مسائل کیلئے اصول استنباط لائق اور منع کر دیئے ہیں، اب اگر حکم فقہاء کی تصریح کے مطابق معلوم ہو جاتا ہے تو معاملہ بہت ہی آسانی سے حل ہو جائیگا اور تصریح نہیں ملتی تو استدلال کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ لیا جائیگا کہ جو نقطہ نظر پیش کیا جا رہا ہے وہ قابل قبول ہے یا نہیں۔

مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند

مجلس

## کثرت رائے بھی فیصلہ کا ایک طریقہ ہے

لیکن اگر بالفرض کوئی ایسا جزئیہ سامنے آجاتا ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی ورجح نہیں ملتی مثلاً فقہاء کی تصریحات میں حکم نہیں ملتا، نظائر پر قیاس کرتے ہیں تو برابر کی ایک سے زائد نظیریں ہیں، قواعد کلیہ کے تحت لاتے ہیں تو جزئیہ اپنی دو حیثیتوں کے سبب دو متضاد قواعد کے تحت آتا ہے یا مثلاً مسئلہ بالکل انتظامی نوعیت کا ہے جس کا نصوص شرعی میں کسی بھی حیثیت سے مذکور ہونا ممکن نہیں تو اس طرح کے تمام معاملات میں حکم شرعی معلوم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ مسئلہ کو اہل نظر کی مجلس شوریٰ کے درمیان رکھ دیا جائے، اور اگر اتفاق رائے نہ ہو سکے تو کثرت رائے کو فیصلہ کا ذریعہ بنا لیا جائے، رہا یہ کہ شریعت میں کثرت رائے پر فیصلہ ہوا ہے یا نہیں۔ تو حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ شرعاً عوام کی کثرت رائے کا تو اعتبار نہیں ہے لیکن خواص اور اہل رائے کی کثرت رائے کے معتبر ہونے پر قرآن مجید اور علماء کے ارشاد سب ہی موجود ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں چند دلائل پیش کر دیئے جائیں۔

## کثرت رائے قرآن میں

۱۔ سب سے پہلے قرآن کریم کی آیت برعمدة المفسرین حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کا تفسیری حاشیہ ملاحظہ فرمائیں، آیت ہے :

مَآ يَكُونُ مِنْ نَجْوَى ثَلَاثَةٍ اَوْ اَرْبَعَةٍ اَوْ خُمَةٍ اَوْ سِتٍّ اَوْ سَبْعَةٍ اَوْ ثَمَانَةٍ اَوْ تِسْعَةٍ اَوْ عَشْرَةٍ اَوْ اَشَدَّ مِنْ ذَلِكَ شِرْكًا يَأْتُوا بِشَهَادَةٍ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَهُمْ وَهُمْ يَسْمَعُونَ  
 کہیں نہیں ہوتا مشورہ تین کا جہاں وہ نہیں  
 ہوتا ان میں چوتھا اور نہ پانچ کا جہاں نہیں

ولا ادنی من ذلك ولا اکثر الا

هو معهم اينما كانوا

(سورة المجادلة آیت ۸) جہاں کہیں ہوں۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب قدس سرہ لکھتے ہیں :

” مشورہ میں اگر صرف دو شخص ہوں تو بصورت اختلاف ترجیح دشوار ہوتی

ہے اس لئے عموماً معاملات مہم میں طاق عدد رکھتے ہیں اور ایک کے

بعد پہلا طاق عدد تین تھا پھر پانچ، شاید اس لئے ان دو کو اختیار

فرمایا اور آگے ولا ادنی من ذلك ولا اکثر سے تعمیم فرمادی باقی حضرت

عمر کا شوری خلافت کو چھ بزرگوں میں دائر کرنا ( حالانکہ چھ کا عدد طاق نہیں

ہے) اس لئے ہوگا کہ اس وقت یہی چھ خلافت کے سب سے زیادہ مستحق

تھے جن میں سے کسی کو چھوڑا نہیں جاسکتا تھا، نیز خلیفہ کا انتخاب ان ہی چھ

میں سے ہو رہا تھا تو ظاہر ہے کہ جن کا نام آتا اس کے سوارائے دینے والے

تو پانچ ہی رہتے ہیں، پھر بھی احتیاطاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بصورت مساوات

ایک جانب کے ترجیح دینے کے لئے حضرت عبداللہ بن عمر کا نام دیا تھا۔

واللہ اعلم۔“

اسی آیت کے ذیل میں یہی مضمون تفسیر کبیر میں بھی ہے :

ان اقل ما لا بد منه في المشاور

التي يكون الغرض منها تمهيد

مصلحة ثلاثة حتى يكون الاثنان

و مشورہ جس کا مقصد کسی بہتر فیصلہ تک پہنچنا ہو

اس میں کم از کم تعداد تین ہونی چاہئے تاکہ دو

افراد تو گویا نفی اور اثبات میں نزاع کر نہ سکیں



کاملتازعین فی النفی والاشبات  
والثالث کالمتوسط العاکوبینہما  
فحینئذ تکمل تلك المشورة ونیم  
ذلك الغرض یوحد فی کل جمع  
اجتمعوا للمشاورة فلا ید فیهم  
من واحد یكون حکما مقبول القول  
فلهذا السبب لا بد وان تكون  
ارباب المشاورة عدد هم فردا فذكر  
سبعاً فی لفظ دین الاولین واکفی  
بذكرها تبیینها علی الباقی

(تفسیر کبیر ص ۷۷)

قرار پائیں اور میرا ان کے درمیان فیصلہ کرنا  
حکم بن جائے، اسی صورت میں مشورہ ممکن  
ہو سکتا ہے اور مشورہ کی عرض پوری ہو سکتی ہے  
بائیکل تہی بات ہر اس جماعت میں ہے جو  
مشورہ کیلئے جمع ہوتی ہو کہ ان میں ایک ایسے فرد  
کا ہونا ضروری ہے جو فیصلہ کن اور لائق تسلیم  
ہو سکے اسی وجہ سے ضروری ہے کہ ارباب مشورہ  
کی تعداد طاق ہو چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اعداد  
میں سے پہلے دو طاق عدد ذکر کئے اور بقیہ  
طاق اعداد برتنید کرنے کیلئے انہی دو کے ذکر  
اکتفا فرمایا۔

امام بلذی قدس سرہ کے بیان میں تصریح ہے کہ اہل مشورہ کی تعداد طاق  
ہونی چاہئے تاکہ اختلاف کی صورت میں ایک ہی کی کثرت سے فیصلہ کیا جاسکے اور کثرت  
رائے کو ترجیح دی جاسکے۔

امام رازی رحمہ اللہ اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے آیت وما یكون من  
نجوى ثلاثة الا یبہ فی لفظ ثلاثہ اور خمسہ نے اہل مشورہ کے عدد کے طاق  
ہونے پر جو استدلال کیا ہے وہ حنفیہ کے مقرر کردہ اہم معانی کے طریقوں میں سے  
اشارۃ النص کے قبیل سے ہے کیونکہ یہاں ثلاثہ اور خمسہ کے ترجمہ لغوی سے یہ  
استدلال کیا جا رہا ہے۔



حقیقت یہاں ملحوظ رہنی چاہئے کہ دارالعلوم کے ایام تاسیس میں اکابر دارالعلوم نے ابتدائی مجلس ثوری کی تعداد سات رکھی ہے جیسا کہ ابتدائی صفحات میں ان حضرات کے نام سے شائع کیا جانے والا سب سے پہلا اشتہار نقل کیا گیا ہے، ابتدائی مجلس ثوری کی تعداد کا طاق ہونا محض اتفاق نہیں معلوم ہوتا بلکہ اس سے اکابر دارالعلوم کا مسلک محتار رہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اختلاف رائے کی صورت میں کثرت رائے کو وجہ ترجیح قرار دیں گے، چنانچہ ابتدائی دور کے بعض واقعات میں کثرت رائے کے وجہ ترجیح بنانے کا عمل بھی ثابت ہے، اور اس وقت کے دستور اسامی میں کثرت رائے کے ذریعہ فیصلہ کی صراحت بھی ہے جبکہ یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ موجودہ دستور اسامی مرتب ہو بعد میں ہوا ہے لیکن مرتبین نے حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی قدس سرہما کے دور سے تاریخ ترتیب تک کی ثوری کی بنیادی تجاویز کو اس میں شامل کر لیا ہے۔

## کثرت رائے حدیث ہیں

۲۔ اکثریت کی وجہ ترجیح کیلئے حدیث پاک میں بھی دلائل ہیں:

عن علی قال قلت یا رسول اللہ	حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے
ان نزل بنا امر لیس فیہ بیان امر	کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ اگر ہمارے
ولا نہی فیما امرنی قال شاوروا	سامنے ایسی صورت پیش آئے جس میں آپ کی
فیہ الفقہاء والعابدین ولا تمضوا	جانب سے امر یا نہی کی وضاحت نہ ہو تو آپ
فیہ رای خاصہ رواہ الطبرانی	ہمیں کیا حکم دیتے ہیں آپ نے فرمایا کہ اس

درجالہ موثقون من اہل الصحیح  
مجمع الزوائد ص ۱۱۱

مسلم میں فقہاء اور عابدین سے مشورہ کرو اور  
اس میں خاص لوگوں کی رائے نافذ مت کرو۔ طبرانی نے  
روایت کیا اور اس کے تمام رواۃ صحیح کے درجہ کے  
نقد ہیں۔

آپ کے اس ارشاد مبارک میں 'لا تمضوا فیہ رای خاصۃ' فرمایا گیا ہے،  
حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس کا ترجمہ کیا ہے، "اگتے دکتے کی رائے نافذ مت  
کرو" مفہوم یہ ہوا کہ جب اہل رائے مشورہ کیلئے بیٹھیں تو جو رائے ایک دو انسانوں  
کی ہے یعنی جو رائے اقلیت میں ہے اس کو نافذ کرنا درست نہیں ہے۔ قابل نفاذ  
وہ رائے ہوگی جو عام اہل رائے کے نزدیک قابل قبول ہو۔

۳۔ عن انس بن مالک یقول

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم یقول ان امتی لا تجتمع

على ضلالة فاذا رأیتم اختلافا

فعلیکم بالسواد الاعظم۔

(ابن ماجہ ص ۲۹۲)

حضرت انس بن مالک سے روایت ہے  
کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ  
فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میری امت گمراہی پر  
اتفاق نہیں کرے گی اس لئے تم اگر اختلاف  
دیکھو تو امت کے سواد اعظم کے ساتھ رہو۔

علامہ سندھی نے "سنن المصطفیٰ" حاشیہ ابن ماجہ میں سواد اعظم کی  
تشریح اس طرح کی ہے۔

ای بالجماعة الکثیرۃ فان

اتفاقهم اقرب الی الاجماع

سواد اعظم سے مراد اکثریت رکھنے والی جماعت  
ہے، کیونکہ ان کا اتفاق اجماع سے زیادہ قریب

ہے، سیوطی نے سواد اعظم کی تفسیر میں کہا کہ اس سے مراد لوگوں کی وہ بڑی جماعت ہے جو صراطِ مستقیم پر چلنے میں اتفاق رکھتی ہو اور یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جمہور کے قول پر عمل کرنا چاہئے۔ اور مجمع الزوائد میں یہ ہے کہ اس روایت کی سند میں ابو خلف الاعمی ہیں جن کا نام حازم بن عطار ہے اور وہ ضعیف راوی ہیں، اور یہ حدیث اور بھی متعدد سندوں سے منقول ہے مگر ان سب میں کلام کیا گیا ہے۔

قال السيوطي في تفسير السواد اعظم  
اي جماعة الناس ومعظمهم الذين  
يجتمعون على سلوك النهج المستقيم  
والحديث يدل على انه ينبغي العمل  
بقول الجمهور وفي الزوائد وفي  
اسنادها ابو خلف الاعمي واسمه  
حازم بن عطا وهو ضعيف  
وقد جاء الحديث بطرف  
في كلها نظر۔

(سنن المصطفى ص ۶۴۴)

اختلاف کی صورت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سواد اعظم کے ساتھ رہنے کی تاکید فرمائی اور ظاہر ہے کہ سواد اعظم میں کوئی وجہ ترجیح عددی کثرت و قوت کے علاوہ نہیں ہے اس لئے عددی کثرت کے وجہ ترجیح ہونے پر یہ روایت نص کا درجہ رکھتی ہے۔

البتہ اس روایت میں حضرت انسؓ سے روایت کرنے والے ابو خلف الاعمی کے بارے میں ضعیف ہونے کا قول ہے، لیکن اس سلسلہ میں تفصیل یہ ہے کہ ابو خلف الاعمی حضرت انسؓ سے روایت کرنے والے دو راویوں کی کنیت ہے، ایک حازم بن عطار اور دوسرے مروان الاصفر، حازم بن عطار ضعیف راوی ہیں لیکن مروان الاصفر درجہ صحیح کے راوی ہیں اور ابو خلف سے اگرچہ بیشتر حضرات حازم بن عطار ہی کی تبعین کر کے

روایت کو ضعیف قرار دیا ہے لیکن اسرار رجال کے بعض اساطین مروان الاصفہانی  
راوی کے ہیں، اس لئے روایت قابل احتجاج ضرور ہے۔

لیکن یہ کہ اس روایت کے جس جملہ سے عددی کثرت کے وجہ ترجیح ہونے  
مضمون ثابت ہو رہا ہے وہ علیکم بالسواد الاعظم ہے اور یہ الفاظ  
وہی ہیں جن کے ساتھ مختلف صحیح روایات کے اندر موجود ہیں مثلاً مسند احمد میں

نعمان بن بشیر سے روایت ہے کہ رسول  
اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لکڑیوں پر یا  
اس شہر پر کھڑے ہو کر فرمایا کہ جو قلیل  
شکر گزار نہیں ہوتا وہ کثیر پر بھی شکر ادا  
نہیں کرتا اور جو انسانوں کا شکر ادا نہیں  
کرتا وہ اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ادا نہیں کرتا  
اور اللہ کی نعمت کا اعتراف شکر ہے اور  
اعتراف نہ کرنا ناشکری ہے اور جماعت  
کے ساتھ رہنا رحمت ہے علیحدگی پسندی

عن النعمان بن بشیر قال قال  
رسول الله صلى الله عليه وسلم  
على هذه الاعوام او على هذا  
المذبح من لم يشكر القليل لم  
يشكر الكثير ومن لم يشكر الناس  
لم يشكر الله والتحدیث بنعمہ  
ایہ شکر وکر کیا کفر والجماعۃ  
رحمة والفرقة عذاب قال  
فقال ابو امامة الباهلی علیکم

بالسواد الاعظم۔  
عذاب ہے راوی کہتا، کہ اس پر حضرت ابوامامہ باہلی  
نے فرمایا کہ تمہیں سواد اعظم کیسا رہنا لازم ہے۔  
حضرت عبداللہ بن ابی اوفی سے مسند احمد میں روایت ہے کہ  
سواد اعظم کے ساتھ رہنا ضروری ہے،  
سواد اعظم کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔

یہ دونوں روایتیں بسند صحیح منقول ہیں جن میں سواد اعظم کے ساتھ رہنے کی تاکید کی گئی ہے اور علامہ سندھی سواد اعظم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اصل طاقت و اجماع میں ہے، لیکن عدد و کثیر، عدد قلیل کی نسبت اجماع سے قریب ہوتا ہے۔ گویا علامہ سندھی کے یہاں اکثریت کیلئے وجہ ترجیح یہ ہے کہ اس میں اجماع نہ بھی لیکن اجماع کے قریب ہونے کی وجہ سے طاقت آجاتی ہے

علیکم بالسواد الاعظم سے امام شافعی رحمہ اللہ نے بھی اجماع کے ثبوت پر استدلال کیا ہے اور شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے بھی اس روایت کے بارے میں تواتر معنوی کا قول کیا ہے، گویا علیکم بالسواد الاعظم لفظ اور معنی دونوں اعتبار سے درست ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ

فرماتے ہیں :

وحدیث متواتر المعنی علیکم بالسواد الاعظم اکثر طرق خویش کہ امام شافعی ان روایات اجماع روایت کرد، وعلامہ در فقہ اس احادیث مختلف اند، جمعے بروجوب طاعت خلیفہ (انزالہ یکن فی معصیۃ محل نمودہ اند و) اجماع بروجوب قول باجماع (ازالۃ الخفاء ص ۲۲) گناہ کی باز ہوا اور کچھ لوگ اس اجماع کا محبت ہونا نکالتے ہیں۔

مطلب یہ ہوا کہ علیکم بالسواد الاعظم کے الفاظ کی سند و



سے ثابت ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اس کو تو اتر معنوی کے درجہ میں سمجھ رہے ہیں اور قرن اول سے اس روایت سے مختلف مضامین پر استدلال کیا گیا ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس روایت سے صراط مستقیم کے تعین پر استدلال کیا ہے کہ جس جانب مسلمانوں کی اکثریت ہو وہی صراط مستقیم ہے۔ خوارج کے موقف کی تردید پر اس روایت سے استدلال اس طرح کیا گیا ہے کہ یہ لوگ سواد اعظم سے کٹ گئے ہیں اور ہمیں سواد اعظم کے ساتھ رہنا چاہئے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس روایت سے اجماع کی حجیت پر استدلال کیا ہے۔ علاء جلال الدین سیوطی اور علامہ سندھی اس سے اکثریت کے، اقرب الی الی اجماع ہونے کا مضمون ثابت کر رہے ہیں۔

۴۔ جماعت یا سواد اعظم میں قوت، عددی کثرت کے سبب آتی ہے، یہ مضمون حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جابریہ کے خطبہ سے بھی واضح ہے یہ خطبہ حاکم نے مختلف سندوں کے ساتھ نقل کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں :

عنیکم بالجماعة فان الشیطان  
مع الواحد وهو من الاثنين بعد  
جماعت کے ساتھ رہنا لازم سمجھو، اس لئے  
کہ شیطان تنہا انسان کے ساتھ رہتا ہے اور  
وہ ایک کی نسبت دو سے زیادہ دور ہو جاتا ہے  
(ازالة الحفار ص ۲۳)

اس روایت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صیغہ اکم تفضیل بعد استعمال فرمایا ہے، اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ شیطان ایک کے ساتھ رہتا ہے اور اس ایک کی نسبت دو سے دور ہو جاتا ہے۔ پھر اس کا صریح مفہوم یہ ہوگا کہ انسان دو کے بجائے تین ہو جائیں تو شیطان سے فاصلہ اور بڑھ جائے گا۔ اسی طرح



یعنی تعداد بڑھتی رہے گی اتنا ہی شیطان سے فاصلہ بڑھتا چلا جائے گا۔

۵۔ قرآن و حدیث کے عددی کثرت کے وجہ ترجیح ہونے کے لئے یہ دلائل قول ہیں، اب دیکھنا یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے عمل میں بھی عددی اکثریت کی یہی اہمیت ہے یا نہیں؟

یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو ہر اعتبار سے جو امتیاز حاصل ہے اس کی بنیاد بد اگر آپ کسی سلسلہ میں بھی مشورہ نہ فرماتے تو کوئی اشکال نہ تھا، اور مشورہ فرماتے لیکن مشورہ کے بعد اپنی ہی رائے پر عمل فرماتے تو اس میں بھی کسی بندہ مومن کیلئے کوئی خلیجان کی بات نہ ہوتی، لیکن اپنے ایسا نہیں کیا، بلکہ جہاں وحی کے ذریعہ حکم خداوندی معلوم ہو گیا وہاں وحی کے مطابق عمل کیا گیا اور جہاں وحی کے ذریعہ کوئی حکم نہیں دیا گیا ان معاملات میں مشورہ فرمایا عام طور پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا کسی ایک رائے پر اتفاق ہو گیا تو اس کو قبول فرمایا گیا، اور اگر اتفاق رائے نہ ہو سکا تو آپ نے اکثریت کی رائے کو بھی ترجیح دی ہے، اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں، ایک بار بھی کثرت رائے کی بنیاد پر ترجیح کا ثبوت مل جائے تو وہ دستور العمل بنانے کیلئے کافی ہے، لیکن یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ سیرت طیبہ کا مطالعہ کرنے والوں کو ایک سے زائد بار اس کا ثبوت مل جاتا ہے، عددی کثرت کی بنیاد پر فیصلے کی ایک نظیر تو غزوہ بدر کے موقع پر اسیران بدر کے سلسلہ میں کیا جانے والا مشورہ ہے، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہ نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

”بہر حال آپ نے صحابہؓ سے اس معاملہ میں رائے طلب کی، ابو بکر صدیقؓ

نے فرمایا کہ یا رسول اللہ! یہ سب قیدی اپنے خویش اقارب اور بھائی بند ہیں، بہتر ہے کہ فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے، اس نرم سلوک اور احسان کے بعد ممکن ہے کہ کچھ لوگ مسلمان ہو کر وہ خود اور ان کی اولاد و اتباع ہمارے دست و بازو بنیں اور جو مال بالغض ہاتھ آئے اس سے جہاد وغیرہ دینی کاموں میں سہارا لگے (باقی آئندہ سال ہمارے ستر آدمی شہید ہو جائیں تو مضائقہ نہیں درجہ شہادت ملے گا) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا میلان بھی فطری حمدی اور شفقت و صلہ رحمی کی بنا پر اسی رائے کی طرف تھا بلکہ صحابہ کی عام رائے اسی جانب تھی، بہت سے تو ان ہی وجوہ کی بنا پر جو ابو بکرؓ نے بیان فرمائیں اور بعض مالی فائدے کو دیکھتے ہوئے اس رائے سے متفق تھے (کما یظہر من قولہ تعالیٰ ترمیدون عرض الدنیا، صبح بہ الحافظ ابن حجر و ابن قیم رحمہما اللہ) حضرت عمر اور سعد بن معاذ نے اس سے اختلاف کیا، حضرت عمر نے فرمایا کہ یا رسول اللہ! یہ قیدی کفر کے امام اور مشرکین کے سردار ہیں ان کو ختم کر دیا جائے تو کفر و شرک کا سر ٹوٹ جائے گا، تمام مشرکین کی ہیبت طاری ہو جائے گی، آئندہ مسلمانوں کو ستانے اور خدا کے راستے سے روکنے کا حوصلہ نہ رہے گا، اور خدا کے آگے مشرکین ہماری انتہائی بغض و نفرت اور کامل بیزاری کا اظہار ہو جائے گا کہ ہم نے خدا کے معاملہ میں اپنی قربتوں اور مالی فوائد کی کچھ پرواہ نہیں کی اس لئے مناسب ہے کہ ان قیدیوں میں جو کوئی ہم میں سے کسی کا عزیز و قریب ہو وہ اسے اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔

الغرض بحث و مجاہد کے بعد ابو بکرؓ کے مشورہ پر عمل ہوا کیونکہ کثرت رائے اور ہمتی اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم طبعی رافت و رحمت کی بنا پر اس طرف

مائل تھے اور ویسے بھی اخلاقی اور کلتی حیثیت سے عام حالات میں وہ ہی رائے قرین صواب معلوم ہوتی ہے۔

(فوائد ترجمہ شیخ الہند ص ۲۴ سورۃ الانفال آیت ۷۳)

اسیران بدر کے سلسلہ میں، فدیہ لے کر رہا کرنے کی بات جہاں روایت اور تاریخ سے ثابت ہے کہ فیصلہ کثرت رائے کی بنا پر ہوا، وہاں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں یہ بیان کر رہے ہیں کہ کثرت رائے کا اشارہ خود اس آیت پاک میں بھی ہے۔ کیونکہ عام مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے ترمیدون عرض الدنیا کہ تم لوگ عام طور پر دنیوی سامان کی طرف مائل تھے، بہر حال یہ بات ثابت ہوئی کہ اسیران بدر کے سلسلہ میں فدیہ لے کر رہا کرنے کا فیصلہ مشورہ کے بعد کثرت رائے سے کیا جانے والا فیصلہ ہے۔

سیرت طیبہ میں کثرت رائے کی بنیاد پر کئے جانے والے فیصلے کی دوسری سب سے زیادہ واضح مثال غزوہ احد کے موقع پر منعقد کردہ شوری کا فیصلہ ہے جس میں یہ مسئلہ تھا کہ مسلمانوں کو مدینہ طیبہ کے اندر رہ کر مقابلہ کرنا چاہئے یا باہر نکل کر۔

اس سلسلہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے مدینہ طیبہ میں رہ کر مقابلہ کرنے کی تھی، جلیل القدر صحابہ کرام عام طور پر مدینہ طیبہ کے اندر رہ کر مقابلہ کرنے کی حکمت عملی کے حق میں تھے، لیکن پرہوش صحابہ کرام جن کی تعداد بہت زیادہ تھی باہر نکل کر مقابلہ کی رائے پر مصر رہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خواب اور اس کی تعبیر سے بھی مطلع کیا جیسا کہ فتح الباری کے حوالہ سے یہ باتیں ذکر کی جا چکی ہیں۔

چنانچہ آپ نے اپنی رائے کے غلی الرغم، اکثریت کی رائے پر عمل کرتے ہوئے

مدینہ طیبہ سے باہر نکلنے کا تہیہ اور عزم فرمایا، عزم فرمانے کے بعد پُر جوش صحابہ کرام نے اپنی رائے واپس لینے کی درخواست بھی کی لیکن آپ نے یہ کہہ کر درخواست کو قبول کرنے سے انکار فرمادیا کہ پیغمبر زرہ پہننے کے بعد رائے تبدیل نہیں کیا کرتے۔

اس واقعہ میں جہاں عزم فرمانے کے بعد مشورہ قبول نہ کرنے کی حقیقت واضح ہے وہیں عزم قائم ہونے سے پہلے اکثریت کے قول کے مطابق عمل کرنے کی حقیقت بھی بالکل واضح ہے، اکثریت کے علاوہ اور کیا بنیاد ہے کہ آپ اپنی رائے، اپنا خواب، اس کی تعبیر سب کچھ بیان فرما رہے ہیں لیکن چونکہ معاملہ وحی کے ذریعہ فیصل نہیں کیا گیا اس لئے آپ اکثریت کی رائے پر عمل کرنے کی سنت قائم فرما رہے ہیں، اکثریت کی وجہ ترجیح کیلئے اس سے زیادہ اور کیا وضاحت ہوگی کہ خود سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مدلل رائے، اور اپنے خواب کو بھی اسی اکثریت کی بنیاد پر ترک فرمادیا۔

## ایک غلط فہمی کا ازالہ

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ عہد رسالت کے جن بعض واقعات کو امیر کے استبداد بالرائے کیلئے نظیر اور دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور ان کی بنیاد پر اکثریت کی رائے کے کالعدم ہونے کا جو دعویٰ کیا جاتا ہے وہ سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے، اس سلسلہ میں بڑے اعتماد کے ساتھ صلح حدیبیہ کے واقعہ کو ذکر کیا جاتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صحابہ کرام کی رائے کے خلاف بحیثیت امیر ایسی دفعات پر صلح فرمائی جس سے صحابہ کرام کو اتفاق نہیں تھا۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر یہ واقعہ اسی طرح پیش آیا ہوتا کہ آپ نے مشورہ کے بعد اکثریت کی رائے کو قبول نہ فرمایا ہوتا اور محض اپنی بصیرت اور رائے کی بنیاد پر صلح فرمائی ہوتی تو یہ آپ کا خصوصی اقدام قرار دیا جاتا، آپ کا امتیازی وصف سمجھا جاتا، آپ کے اس اقدام سے دوسرے امر اکیلے استبداد بالرائے کا جواز فراہم کرنا غلط ہوتا۔

پھر اس سلسلہ میں دوسری بات جو حقیقت ہے یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کو رسولِ کرام صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ اور رائے کی بنیاد پر طے ہی نہیں فرمایا بلکہ اس کو آپ نے وحی خفی کے ذریعے طے فرمایا ہے، قرآن کریم کے اشارے بھی اسی حقیقت کو ثابت کرتے ہیں اور آپ کا اس موقع پر جواب بھی۔

اس واقعے سے متعلق قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے :

هو الذی کفایدہم عنکم  
وایدیکم عنہم ببطن مکة  
من بعد ان اظفرکم علیہم و  
کان اللہ بما تعملون بصیرا  
(سورۃ الفتح آیت ۲۴)

اور وہ ایسا ہے کہ اس نے ان کے ہاتھ  
تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے عین مکہ میں  
روک دئے، بعد اس کے کہ تم کو ان پر قابو  
دے دیا تھا اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں  
کو دیکھ رہا تھا۔ (ترجمہ حضرت تھانوی)

علامہ عینی نے ”باب شروط فی الجہاد“ میں اس آیت کی متعدد تفاسیر کے درمیان  
ایک تفسیر یہ بھی بیان فرمائی ہے :

(کف ایدیکم) بان امرکم ان لا  
تجاربوا المشرکین وکف ایدیکم  
حکم دیا کہ مشرکین کے ساتھ جنگ نہ کرو،  
اور کف ایدیکم عنکم کا مطلب ہے

عنکم بالقاء العرب فی قلوبہم

کفار کے قلوب میں رعب ڈال کر انہیں جنگ

سے روک دیا۔

(مبدۃ القاری ص ۱۱۱)

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے صلح حدیبیہ پر عام تبصرہ کرتے ہوئے

لکھا ہے :

”بہت سے صحابہ کرام خصوصاً فاروق اعظمؓ اس طرح کی صلح سے ناراض

تھے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باشارات ربانی اس صلح کو انجام کار

مسلمانوں کے لئے ذریعہ کامیابی سمجھ کر قبول فرمایا“ (معارف القرآن ص ۱۱۱)

گویا پروردگار عالم سورۃ الفتح میں یہ فرما رہا ہے کہ اس صلح کا امیر کی ذاتی رائے

سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ سب کام ہماری نگرانی میں ہوئے ہیں، جنگ سے ہاتھ

ہم نے روکے ہیں، اور جس طرح قرآن کریم میں صلح حدیبیہ کو خدا کے حکم کی تعمیل میں

کیا جانے والا عمل قرار دیا گیا، اسی طرح خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب سے

بھی یہی حقیقت سامنے آتی ہے، کیونکہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس صلح

کے بارے میں اپنا خیال ظاہر کیا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد

فرمایا :

میں اللہ کا رسول ہوں، میں اس کے حکم کے

اتی رسول اللہ، ولست اعصیہ

خلاف نہیں کروں گا۔ اور اللہ میرا مددگار ہے۔

وہو ناصری (بخاری جلد ۳ ص ۱۱۱)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کے جواب میں یہ نہیں فرمایا کہ میں امیر

ہوں اور امیر کو اس طرح کے اختیارات حاصل ہوتے ہیں، بلکہ آپ کا جواب یہ ہے

کہ شرائط صلح پر تمہیں اس طرح کا خیال نہ آنا چاہیے کیونکہ میری حیثیت اللہ کے



رسول کی ہے، اور میں حکم خداوندی کے خلاف ہرگز نہیں کروں گا اور اللہ میرا مددگار رہے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ صلح حدیبیہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کردار یہ نہیں ہے کہ عام صحابہ سے مشورہ کیا گیا ہو اور اس میں تمام صحابہ یا عام صحابہ کی رائے صلح کے حق میں نہ ہو لیکن اس کے باوجود آپ نے امیر کی حیثیت سے اختیارات استعمال فرماتے ہوئے صلح کر لی ہو، بلکہ صلح حدیبیہ خالص رب العالمین کے احکام کی تعمیل میں ہوئی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم خداوندی کو بحیثیت رسول نافذ فرمایا۔

## مشورہ کے باب میں عہد رسالت کے طریق کار کی وضاحت

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مشورہ کے سلسلہ میں آپ کے طرز عمل کی ایسی وضاحت ہو جائے کہ سیر طیبہ کے مختلف واقعات کا سمجھنا آسان ہو سکے۔ کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خصوصی اختیارات حاصل تھے ان کی بنیاد پر اگر آپ تنہا اپنی رائے سے فیصلہ فرمادیتے تو نہ صرف یہ کہ اس کا آپ سے زیادہ کوئی حقدار نہیں تھا بلکہ تمام صحابہ کرام کی اس وقت یہ ذمہ داری ہوتی کہ وہ اپنے آپ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کے مطابق مطمئن کر لیں، لیکن سیر طیبہ اور حدیث پاک کا مطالعہ کرنے والے کو اس طرح کی ایک بھی واضح نظیر نہیں ملتی کہ آپ نے اکثریت کی رائے کو قبول نہ کر کے محض اپنے اختیارات استعمال فرماتے ہوئے کسی معاملہ کا

فیصلہ فرما دیا ہو، بلکہ سیر طیبہ کا مطالعہ کرنے والوں کو جو باتیں اور بنیادیں ملتی ہیں وہ یہ ہیں :-

۱۔ جن معاملات میں وحی کا نزول ہو گیا، یا اشارات ربانی یعنی وحی خفی سے ان کی وضاحت ہو گئی ان تمام معاملات میں آپ نے حکم کے خلاف کسی کا مشورہ قبول نہیں فرمایا اور ان احکام کو بحیثیت پیغمبر نافذ فرما دیا جیسے صلح حدیبیہ، کہ وحی خفی کے ذریعہ آپ کو حکم خداوندی سے مطلع کر دیا گیا تھا، آپ نے اس سلسلہ میں کسی کا مشورہ قبول نہیں کیا بلکہ حکم کو بحیثیت پیغمبر نافذ فرما دیا۔

۲۔ جن معاملات میں یہ صورت نہیں ہوئی ان میں مشورہ کیا گیا، مشورہ کے دوران وحی نازل ہو گئی تو مشورہ ترک کر کے وحی کے مطابق عمل ہو کر آد کیا گیا، جیسے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سلسلہ میں افک اور بہتان کا معاملہ، کہ آپ ابھی مشورہ ہی فرما رہے تھے کہ قرآن کریم میں حضرت عائشہ کی براءت کا حکم نازل ہو گیا۔ تو آپ نے مشورہ ترک فرما دیا، اور اتہام تراشی کرنے والوں پر حد قذف جاری فرمادی گئی۔

۳۔ مشورہ کی بات مکمل ہو گئی تو عام طور پر ایسا ہوا ابتداءً تو رائے خواہ ایک یا دو ہی افراد کی رہی ہو، لیکن عام صحابہ کرام کا اس نقطہ نظر سے اتفاق ہو گیا تو اسی کو نافذ کر دیا کر دیا گیا جیسے غزوہ خندق کے موقع پر، خندق کی رائے ابتداءً تنہا حضرت سلمان فارسی کی تھی لیکن ان کی تنہا ہی کی رائے پر تمام صحابہ متفق ہو گئے۔

۴۔ اور اگر صحابہ کرام کا اتفاق رائے نہ ہو سکا تو آپ نے اکثریت کی رائے کے مطابق عمل درآمد فرمایا جیسے غزوہ بدر میں اسیران بدر کو زرفدیہ لے کر چھوڑ دینے کے مسئلہ میں اکثریت کی رائے کے مطابق فیصلہ فرما دیا، یا غزوہ احد کے

کے موقع ہر مدینہ کے اندر رہ کر، یا مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کے سلسلہ میں مشورہ فرمایا اور کثرت رائے کے مطابق مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کا حکم یا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل امور مشورہ طلب کے سلسلہ میں مندرجہ بالا تفصیلات پر مشتمل ہے، لیکن امراء کے لئے استبداد بالرائے کا نقطہ نظر پیش کرنے والوں سے غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے مختلف روایات کی حقیقی نوعیت پر غور نہیں کیا، مثلاً پہلی صورت، یعنی وحی خفی کے ذریعہ دیئے جانے والے احکام خداوندی کو انھوں نے امور مشورہ طلب میں امیر کے اختیارات اور بالادستی کا مقیس علیہ بنالیا، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور کسی کے لئے اس کی گنجائش نہیں تھی۔

اسی طرح دوسری صورت، یعنی دوران مشورہ، وحی کے ذریعہ صورت حال کی وضاحت کے اس نقطہ نظر نے یہ معنی لئے کہ مشورہ کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے، امیر قبول مشورہ یا ترک مشورہ میں آزاد ہے، حالانکہ وحی کے ذریعہ صورت حال کی وضاحت سے امیر کے اختیارات کی وسعت پر استدلال درست نہیں۔

تیسری صورت، یعنی ایک دو افراد کی وہ رائے جس پر اتفاق ہو جائے، یہ رائے اگرچہ اصلاً اقلیت کی تھی، لیکن اتفاق رائے حاصل ہو جانے کے بعد، یہ اکثریت کی نہیں سب کی رائے ہو گئی ہے، امیر کو بالادستی دینے والے نقطہ نظر کو اس طرح کے واقعات سے یہ غلط فہمی ہوئی کہ امیر کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اقلیت یا اکثریت میں سے کسی بھی رائے کو ترجیح دیدے، حالانکہ اتفاق رائے حاصل ہو جانے کے بعد اقلیت کی ترجیح یا امیر کے اختیارات کی وسعت سے اس طرح طرح کے واقعات کا کوئی تعلق نہیں۔

چوتھی صورت یعنی اکثریت کی رائے کے مطابق فیصلہ کے معاملات سے متعلق امیر کی بالادستی اور مطلق العنانی کا نقطہ نظر رکھنے والوں کی جانب سے جو تاویل کی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر امیر کی رائے اکثریت کے حق میں ہو تو وہ اکثریت کے مطابق فیصلہ کر سکتا ہے، لیکن بعض واقعات ایسے بھی ہیں جن میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے اکثریت کے ساتھ نہیں ہے جیسے غزوہ احد کے موقع پر مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کی رائے خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نہیں تھی، اس سلسلہ میں یہ نقطہ نظر غالباً مصلحت کا سہارا لے گا کہ اگر امیر اپنی رائے کے خلاف مصلحت یہ سمجھے کہ اسے اکثریت کی رائے قبول کرنی چاہئے تو اس میں کوئی تنگی نہیں۔

لیکن یہ سب تاویلات ہیں، حقیقت یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں مشورہ کی جو تفصیلات ہیں، ان سے یہ بات واضح ہے کہ آپ نے وحی کے ذریعہ ہدایت پالینے کے بعد مشورہ نہیں فرمایا، وحی کا نزول جن معاملات میں نہیں ہوا ان میں مشورہ فرمایا، دوران مشورہ وحی نازل ہوگئی تو مشورہ ترک کر دیا۔ اور اگر آخر تک وحی کے ذریعہ نہائی نہیں فرمائی گئی تو مشورہ میں اگر اتفاق ہو گیا تو اس پر عمل درآمد کیا گیا، اتفاق رائے نہیں ہو سکا تو اکثریت کے مطابق فیصلہ کر کے نافذ کر دیا گیا۔ واللہ اعلم

## کثرتِ رائے خلافتِ اشدہ میں

۶۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شیر پاک میں اکثریت پر عمل کرنے کی نظیر کے بعد خلفاء راشدین کے عہد میں دیکھا جائے تو یہ پوری تاریخ اس طرح کے واقعات سے

بسریر ہے ۔

یہ بات تفصیل سے گزر چکی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جو حیثیت آپ کی ذات کو حاصل تھی، آپ کی وفات کے بعد اب وہی حیثیت آپ کی سنت کو حاصل ہے، اور آپ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پیش آمدہ مسائل میں خسان تناز عتم فی شئی فردوہ الی اللہ والرسول پر عمل کرتے ہوئے ہمیشہ کتاب و سنت کی طرف مراجعت کر کے حل تلاش کیا ہے ۔

یہ بحث بھی گزر چکی ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے جب کوئی نیا معاملہ آتا تو وہ اس کو قرآن و حدیث میں تلاش کرتے وہاں نہ ملتا تو صحابہ کرام سے ان کے گھر جا کر ملاقات کرتے اور اس میں بھی کامیاب ہوتے تو اصحاب رائے صحابہ کو جمع کر کے ان کے سامنے مسئلہ رکھتے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی یہی معمول تھا، عام طور پر قرآن و حدیث کے سامنے آجانے کے بعد اتفاق رائے ہو جاتا، لیکن کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ قرآن و حدیث کی طرف مراجعت میں، خفا یا ظاہری تعارض کے سبب یا امور انتظامیہ میں اختلاف رائے کے باعث اتفاق نہ ہو سکا تو کثرت رائے کے ذریعہ فیصلہ کیا گیا ۔

خلافت راشدہ کے پورے عہد میں ایک نظیر بھی اس طرح کی پیش نہیں کیا جاسکتی کہ خلیفہ المؤمنین نے محض اپنی رائے کو یا اقلیت کی رائے کو یہ کہہ کر نافذ کیا ہو کہ ایسا کرنا اس کے اختیار تمیزی میں داخل ہے، البتہ اس طرح کے متعدد واقعات ملیں گے کہ خلیفہ المؤمنین اپنی مدلل اور مضبوط رائے کو نفاذ سے محض اس لئے روکے ہوئے ہیں کہ اکثریت ان کے حق میں نہیں ہے ۔

بلکہ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ خود خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی خلافت کا انعقاد بھی شوریٰ اور کثرتِ رائے کی بنیاد پر ہوا ہے، تاریخ کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ سقیفہ بنو ساعدہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا انتخاب بھی بھاری اکثریت نے کیا ہے۔ بنو ہاشم کے خواص اور انصار کے شیخ قبیلہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی رائے اس وقت ان کے حق میں نہیں تھی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مشورہ کیا تو مشورہ کی خصوصی مجلس میں اختلاف ہو گیا، پھر جب آپ نے رائے عامہ معلوم کی تو وہ بالاتفاق حضرت عمرؓ کے حق میں گئی اس لئے یہ انتخاب بھی شوریٰ اور کثرتِ رائے سے ہوا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد خلیفہ کے انتخاب کے لئے جو چوبھری مجلس شوریٰ نامزد کی تھی، اس نے بھی حضرت عثمان غنیؓ کے حق میں فیصلہ رائے عامہ کی کثرت دیکھ کر کیا ہے۔ اور اسی رائے عامہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کی گئی ہے۔

خلافت راشدہ میں عددی کثرت کے فیصلہ کن ہونے کی سب سے عمدہ وضاحت، حضرت عمرؓ کی نامزد فرمودہ چوبھری مجلس شوریٰ کی تفصیلاً سے ہوئی ہے کیونکہ حضرت عمرؓ نے ان حضرات کو یہ ہدایت کی تھی کہ اگر اتفاق رائے سے انتخاب عمل میں جائے تو سب سے اچھی بات ہے، اور اگر اختلاف رائے ہو جائے، تو



اکثریت کے مطابق انتخاب کیا جائے، اور اقلیت اگر فیصلہ تسلیم نہ کرے تو اسکو عبرتناک سزا دی جائے، اس موضوع پر علامہ شاطبی الاعتصام میں لکھتے ہیں:-

عمر بن میمون اودی سے روایت ہے کہ جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے کاری زخم آگیا تو انھوں نے حضرت صہیبؓ کہہ کہ آپ تین دن تک نمازیں پڑھاتے رہیں۔ اور میرے پاس عثمان، علی، طلحہ، زبیر، سعد اور عبدالرحمن آجائیں، ابن عمر بھی اس گھر میں موجود رہیں گے لیکن وہ اس انتخاب میں امیدوار نہ ہوں گے اور فرمایا کہ صہیب! تم ان لوگوں کے سر پر تلوار لے کر کھڑے رہنا اگر پانچ آدمی کسی کے ہاتھ پر بیعت کر لیں اور ایک اس چیز کو قبول نہ کرے تو اس کے سر پر تلوار مار دینا۔ اور چار بیعت کر لیں اور دو انکار کر دیں تو ان دونوں کے سر پر تلوار مار دینا یہاں تک کہ وہ ایک آدمی پر اعتماد کا اظہار کریں۔

روی عن عمرو بن میمون الاددی قال: قال عمر بن الخطاب حين طعن - لصهيب - صل بالناس ثلاثا وليد دخل عن عثمان، وعلي و طلحة والزبير وسعد وعبد الرحمن وليد دخل ابن عمر في جانب البيت وليس له من الامر شيء. فقم يا صهيب على رؤسهم بالسيف فان بايع خمسة ونكص واحد فاجلد راسه بالسيف وان بايع اربعة ونكص رجلان فاجلسد رؤسهما بالسيف حتى يستوثقوا. (الاعتصام ۳۶۵)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کثرت رائے کے ذریعہ کئے گئے فیصلہ کو شریعت کا اتنا محکم اور یقینی فیصلہ قرار دے رہے ہیں کہ اس کی خلاف ورزی کرنے والے کو قتل

جیسی سخت سزا کا مستحق قرار دے رہے ہیں، اگر کثرت رائے محض ظنی دلیل ہوتی تو شاید یہ آخری سزا تجویز نہ فرماتے۔

اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ یہ واقعہ تاریخ کی تمام کتابوں میں موجود ہے، ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

وقال للمقداد بن الاسود اذا  
وضعتوني في حفرتي فاجمع هؤلاء  
السرھط في بيت حتى يختاروا  
رجلا منهم وقال لصہیب  
بالناس ثلاثة ايام وادخل عليا  
وعثمان والزبير وسعدا وعبد الرحمن  
بن عوف وطلحة ان قدم (وكان غائباً)  
واحضر عبد الله بن عمر، ولا شيء  
لهم من الامر وقيم على رؤسهم فان  
اجتمع خمسة ورضوا رجلا وابي  
واحدا فاشدخ راسه بالسيف  
وان اتفق اربعة فرضوا رجلا  
منهم وابي اثنان فاضرب رؤسهما  
فان رضی ثلاثة رجلا وثلاثة رجلا  
فحكموا عبد الله بن عمر

حضرت عمرؓ نے حضرت مقداد سے کہا کہ  
کہ جب تم مجھے قبر میں رکھ دو تو ان لوگوں کو ایک  
گھر میں جمع کر دینا تاکہ یہ اپنے ہی میں سے ایک  
کا انتخاب کریں اور حضرت صہیبؓ فرمایا  
کہ تم تین یوم تک نمازیں پڑھانا اور علیؓ، عثمانؓ  
زبیرؓ، سعدؓ، عبد الرحمن بن عوفؓ اور طلحہؓ اگر  
آجائیں (اور وہ ان دنوں مدینہ میں تھے)  
کو ایک جگہ جمع کر دینا اور عبد اللہ بن عمرؓ کو بھی  
بلا لینا مگر وہ خلافت کے لئے امیدوار نہیں  
بن سکیں گے۔ اور اے صہیب! تم ان کے  
سر پر مسلط رہنا، اگر پانچ ایک پر اتفاق کرے  
اسکو منتخب کریں اور ایک انکار کرے تو  
اس کے سر کو تلوار سے اڑا دینا اور اگر چار  
کسی ایک پر اتفاق کریں اور دو انکار کر دیں  
تو دونوں کا سر اڑا دینا اور اگر تین کسی ایک

متفق ہوں اور دوسرے تین کسی دوسرے پر  
متفق ہوں تو عبداللہ بن عمر کو حکم بنا لینا وہ جس  
فریق کے حق میں رائے دیں وہ فریق اپنے میں  
کسی کو منتخب کر لے اور اگر عبداللہ بن عمر کے  
فیصلے سے رضامند نہ ہوں تو ان لوگوں کے  
ساتھ رہنا جن میں عبدالرحمن بن عوف ہوں۔  
اور باقی حضرات اگر لوگوں کے منتخب کردہ  
امیر سے اختلاف باقی رکھیں تو ان کو قتل

فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ حَكَمَ لَمْ  
فَلْيُخْتَارُوا رَجُلًا مِنْهُمْ  
فَأَنْ لَمْ يَرْضُوا بِحَكْمِ  
عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ فَيَكُونُوا  
مَعَ الَّذِينَ فِيهِمْ عَبْدُ الرَّحْمَنِ  
بْنُ عَوْفٍ وَاقْتُلُوا الْبَاقِينَ  
أَنْ رَغِبُوا عَمَّا اجْتَمَعَ عَلَيْهِ  
النَّاسُ

(تاریخ الامم الاسلامیہ) ۲/۳۲۲ کر دیا جائے۔

یہاں سب سے پہلے ہمیں یہ واضح کرنا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ان  
ہدایات میں کثرت رائے کے وجہ ترجیح ہونے کی اس طرح وضاحت کر دی گئی ہے کہ  
اس سے زیادہ ممکن نہیں، کیونکہ کثرت رائے کے بعد، خلاف ورزی کرنے والوں کو  
وہ سب آخری یعنی قتل تک کی سزا کی ہدایت دے رہے ہیں، اگر کثرت رائے کے  
ذریعہ کیا گیا فیصلہ شریعت کی نظر میں ذرا بھی کمزور ہوتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہرگز  
اتنا اہم اقدام کرنے کی ہدایت نہ دیتے، کثرت رائے کے حجت قطعہ ہونے کے  
علاوہ بھی اس واقعہ میں متعدد باتیں توجہ طلب ہیں اور ان سے مختلف نتائج  
اخذ کئے جاسکتے ہیں:

(الف)۔ خلیفہ کے انتخاب کے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک چھ  
صغری مجلس شوری نامزد فرمائی ہے، معلوم ہوا کہ شوری کے لئے افراد

کی نامزدگی جائز ہے اور جس کام کے لئے جو حضرات نامزد کئے گئے ہیں انہی سے مشورہ کرنا ضروری ہوگا، واردین و صادرین سے کیا جانے والا مشورہ، مقرر کردہ افراد کے مشورہ سے بے نیازی کا سبب نہیں بنے گا، کیونکہ حضرت عمرؓ نے نامزد افراد کے علاوہ دوسرے حضرات کو اس معاملہ میں شرکت سے منع فرما دیا تھا۔

(ب) — خلیفہ کے انتخاب کے سلسلہ میں شوریٰ پر اعتماد کا مطلب یہ ہوا کہ امور انتظام کا سب سے بڑا مسئلہ شوریٰ کے زیر اختیار ہے تو اس کے کم درجہ کے معاملات و مسائل کیلئے شوریٰ کا با اختیار بنایا جانا بدرجہ اولیٰ درست اور جائز ہوگا۔

(ج) — ان چھ حضرات کو حضرت عمرؓ نے جو ہدایتیں دی ہیں ان میں کثرت رائے کے ذریعہ انتخاب کی بات بالکل بدیہی ہے اور اس سلسلہ میں وہ اس قدر وضاحت فرما گئے ہیں کہ اختلاف پانچ اور ایک ہی کا نہیں بلکہ تین اور تین کا اختلاف بھی اگر ترجیحی رائے کے ذریعہ فیصلے تک پہنچ جائے تو اب اقلیت کا اس فیصلے سے انحراف جائز نہیں اور ان کو سخت سے سخت سزا دی جاسکتی ہے۔

(د) — شوریٰ کو حضرت عمرؓ نے تین دن کے اندر انتخاب کے اعلان کا پابند بنایا تھا، معلوم ہوا کہ ان تین دنوں میں مسلمانوں کا زمام اقتدار فردو اہل کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اختیار امت پر مشتمل چھ منفرد جماعت شوریٰ کی ہیئت اجتماعی کے ہاتھ میں تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ خیر القرون میں بھی زمام اقتدار چند ہی روز کے لئے سہی، لیکن ہیئت اجتماعی کے ہاتھ میں رہی ہے۔

(۴) — خلیفہ کے نصب اور تقرر کا اختیار دینے کے معنی یہ ہیں کہ اگر خلیفہ سے ایسی باتیں صادر ہو جائیں جو شرعاً قابل برداشت نہیں تو شوری یا ارباب حل و عقد ہی اس کو معزول کریں گے، کیونکہ نصب و تقرر کا اختیار دینے کے بعد عزل کا اختیار دینے پر کوئی دلیل قائم نہیں بلکہ تمام اہل عقل کا اتفاق ہے کہ جسے نصب کا اختیار ہوتا ہے اسے عزل کا بھی اختیار ہوتا ہے۔

(۵) — جب خلافتِ عالیہ جیسے اہم منصب کا یہ معاملہ ہے تو اس سے نیچے کے مناصب پر اگر شوری کو بالادستی دے دی جائے اور کسی دستوراساسی کی رو سے اس طرح کا معاملہ بھی ہو گیا ہو تو ضروری ہے کہ یہ جائز ہے بلکہ اس کی پابندی کرنا واجب ضروری ہے۔

۷۔ کثرتِ رائے کے فیصلہ کن اور شرعاً حجت ہونے کے بارے میں خلافتِ راشدہ میں تنہا یہی واقعہ نہیں ہے بلکہ اگر عہدِ خلافت کا یہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو صاف طور پر معلوم ہو گا کہ اگرچہ عصرِ حاضر کی طرح اقلیت و اکثریت کے تعین کے لئے باقاعدہ رائے شماری تو نہیں کی گئی لیکن اختلاف کی صورت میں کثرتِ رائے ہی کے ذریعہ فیصلہ کیا گیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب بھی کوئی مسئلہ شوری میں آیا تو حدیث و قرآن کی طرف مراجعت کی اگر کوئی صورت نکل آئی تو عام طور پر اتفاق رائے ہو گیا لیکن اگر کوئی انتظامی معاملہ ایسا پیش آیا جس میں کتاب و سنت کی طرف مراجعت کر کے فیصلہ نہیں کیا جاسکا، یا مسئلہ انتظامی نہیں دینی ہی تھا لیکن کتاب و سنت کی طرف مراجعت میں ابہام یا تعارض کی بنیاد پر اختلاف رائے ہو گیا تو ان دونوں صورتوں میں کثرتِ رائے ہی کو فیصلہ کن قرار دیا گیا ہے، ہم ان دونوں طرح کے مسائل کی ایک ایک نظیر پیش کرتے ہیں۔

(الف) — پہلے مسئلہ کی نظیر جنگ نہادند کے موقع پر کئے گئے مشورہ کے بعد فیصلہ ہے، مسئلہ یہ ہے کہ محاذ جنگ سے جو خبریں آرہی ہیں ان کی بنیاد پر خلیفہ المومنین بذات خود محاذ پر جانا ضروری سمجھتے ہیں اور بھی بہت سے مسلمان اس اقدام کو مناسب سمجھتے ہیں لیکن بہت سے اہل رائے خلیفہ المومنین کے محاذ جنگ پر جانے سے اختلاف رکھتے ہیں، اب یہ ایک ایسا انتظامی مسئلہ ہے جس کا قرآن و حدیث میں مذکور ہونا بعید از قیاس ہے۔ اس لئے جو مجلس شوریٰ منعقد ہوئی ہے وہ کتاب سنت کی طرف مراجعت کی کوشش کے لئے نہیں بلکہ خود اس مسئلہ کے نتائج و عواقب پر غور کرنے بہتر صورت حال کی تلاش و تجویز کے لئے ہے چنانچہ یہاں فیصلہ کثرت رائے کی بنیاد پر کیا گیا، مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں :-

”اس میں جب نہادند کا سخت معرکہ پیش آیا اور غمیوں نے اس سرد سامان سے طیاری کی کہ لوگوں کے نزدیک خود خلیفہ وقت کا اس مہم پر جانا ضروری ٹھہرا تو بہت بڑی مجلس شوریٰ منعقد ہوئی، حضرت عثمان، طلحہ بن اشر، زبیر بن العوام اور عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم باری باری کھڑے ہو کر تقریریں کیں اور کہا کہ خود آپ کا موقع پر جانا مناسب نہیں، پھر حضرت علی کھڑے ہوئے اور ان لوگوں کی تائید میں تقریر کی غرض کثرت رائے سے یہی فیصلہ ہوا کہ خود حضرت عمرؓ موقع پر نہ جائیں۔“ (الفاروق ص ۱۲)

(ب) — دوسرے مسئلہ کی نظیر عراق و شام کی زر خیز زمینوں کے مجاہدین کے درمیان تقسیم کرنے کا مسئلہ ہے، یہ انتظامی مسئلہ نہیں ہے دینی مسئلہ ہے، جب یہ علاقے فتح ہوئے تو مجاہدین نے جن میں صحابہ کرام و تابعین



تھے ان زمینوں کے تقسیم کرنے کا مطالبہ کیا، ان کے پیش نظر قرآن کریم میں مال غنیمت کی تقسیم کا واضح حکم تھا، حضرت عبدالرحمن بن عوف، حضرت زبیر بن العوام اور حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہم نے اس موقف پر بہت اصرار کیا، عام مجاہدین کی رائے بھی یہی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے یہی تھی کہ مال غنیمت کی تقسیم کا قرآنی حکم اموال منقولہ کے بارے میں ہے، اموال غیر منقولہ اس کے ذیل میں نہیں آتے، غور فرمایا جائے کہ قرآن کریم میں واعلموا انما غنمت من شئ کا حکم موجود ہے، لیکن ایک فرق اس کو عام سمجھ کر زمینوں کی بھی تقسیم کے حق میں ہے، اور دوسرا فرق مال غنیمت کو صرف اموال منقولہ سے متعلق کئے ہوئے ہے۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہل مشورہ کو جمع کیا جس میں مہاجرین اور انصار کے دونوں قبیلوں اور خزانہ میں سے پانچ پانچ رو سا شریک ہوئے کئی دن تک مسئلہ پر بحث ہوتی رہی، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے موقف پر قرآن کریم کی تین آیات سے تفصیلی استدلال کیا، سورہ حشر کی ان آیات میں فرمایا گیا ہے: مَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ الْآيَةُ، اس آیت میں فے یعنی مال غنیمت کا ذکر اور اس کے مصارف کا بیان ہے اس کے بعد للفقراء الذين اخرجوا من ديارهم میں مہاجرین کو مصرف فے میں داخل کیا گیا ہے اس کے بعد والذين تبوءوا الدار والايمان من قبلهم يجزون من هاجر اليهم الآية میں انصار کو بھی مصرف فے میں داخل کیا گیا ہے، پھر اس کے بعد والذين جاءوا من بعدهم يقولون ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذين سبقونا بالايمان الآية میں قیامت تک جتنے لوگ مہاجرین و انصار

کے اتباع کرنے والے آئیں گے ان سب کو فے کا مصرف قرار دیا گیا ہے ، اب اگر ان زمینوں کو مجاہدین پر تقسیم کر دیا جائے تو بعد میں انے والوں کیلئے ان سے استفادہ کی کوئی راہ نہیں رہ جاتی ، بعد میں انے والوں کے لئے اس زمین سے استفادہ کا مصرف ہی راستہ ہے کہ ان زمینوں کو حکومت کی تحویل میں رکھ کر ان کی آمدنی کو ان مصارف پر صرف کیا جائے ، چنانچہ حضرت عمرؓ کے اسب زبردست استدلال کے بعد رائے عامہ ان کے موقف کی تائید میں گئی ، چنانچہ چند صحابہ کرام کا اختلاف اس کے باوجود باقی رہا ۔ مگر کتاب سنت کی طرف مراجعت کی کوشش میں تعارض کی بنا پر اختلاف رائے ہوا تو کثرت رائے کو فیصلہ کن قرار دیا گیا ۔

انہی دو نظیروں پر انحصار نہیں ہے ، بلکہ خلافت راشدہ میں عام طور پر مسائل کے حل کے لئے مجلس شوریٰ نے کتاب سنت کی طرف مراجعت کی ہے اور جب کوئی مسئلہ صاف ہو گیا ہے تو عام طور پر اتفاق رائے ہو گیا ہے اور اختلاف باقی رہا ہے تو کثرت رائے کے ذریعہ فیصلہ کیا گیا ہے ۔

## کثرت رائے فقہاء کی نظر میں

۸۔ نصوص شرعیہ ، اور عہد رسالت نیز خلافت راشدہ کے تعامل سے کثرت رائے کا حجت شرعیہ ہونا معلوم ہو چکا ہے لیکن مناسب ہو گا کہ اس موقع پر یہ بھی بیان کر دیا جائے

۱۔ پیغمبر کتاب الخراج امام ابو یوسف ، ازاد الخفاء ، الفاروق اوسع الکریم فی سیاستہ ابی الامین سے ماخوذ ہے ۔

کہ یہ کثرتِ رائے بعد میں نے والے فقہاء کے یہاں بھی حجت شرعیہ کے طور پر موجود ہے، اگر کسی مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف رائے ہو تو وہاں کثرتِ رائے کی بنیاد پر ترجیح کا اصول موجود ہے۔ کثرتِ رائے کی بنیاد پر ترجیح کی بات دو موقعوں پر کہی گئی ہے، ایک صورت یہ ہے کہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں ائمہ احناف سے کوئی قول منقول نہیں ہے اور فقہاء متاخرین کے یہاں اس مسئلہ میں اختلافِ رائے ہو جائے تو اس سلسلہ میں شرح عقود رسم المفتی میں یہ حکم لکھا گیا ہے :

واذا لم يوجد في الحادثة عن واحد منهم جواب ظاهر وتكلم فيه المشايخ المتأخرون قولاً واحداً يوجب به . فان اختلفوا يوجب قول الأكثرين . (شرح عقود رسم المفتی ص ۱۰۰)

اگر اس تازہ واقعہ میں ائمہ احناف کی جانب سے کوئی ظاہر جواب ہو اور متاخرین نے اس میں ایک ہی قول کیا ہو تو اس ایک ہی قول کو لیا جائے گا۔ اور اگر فقہاء متاخرین کے درمیان اختلاف ہو جائے (یعنی کئی اقوال منقول ہوں) تو اکثریت کے قول کو لیا جائے گا۔

دیکھئے یہاں صاف یہ لکھا ہے کہ اگر ائمہ احناف کوئی حکم منقول نہ ہو اور متاخرین کے یہاں اختلافِ رائے ہو جائے تو ایسی صورت میں کثرتِ رائے کا اعتبار ہے اور اسی رائے کو ترجیح دی جائے گی جسے اکثریت فقہاء کی تائید حاصل ہو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک مسئلہ میں دو قول ہیں اور دونوں ہی کو صحیح قرار دیا گیا ہے، ان دونوں صحیح اقوال میں سے ایک قول کو ترجیح دینے کے سلسلہ میں شرح عقود رسم المفتی میں ہے :-

السادس ما اذا كان احد القولين المصححين قال به جل المشايخ العظام جمعاً اصول : ہے کہ اگر دو صحیح شدہ اقوال میں سے ایک قول ایسا ہو کہ جس کو عام مشائخ نے اختیار

فقہ البیری علی الاشباہ ان المقررا  
عن المشايخ انه متى اختلف  
في المسئلة فالعبرة بما قاله لاكثر.  
کیا ہو تو الاشباہ پر بری میں لکھا ہے کہ ایسی  
صورت میں مشایخ کے نزدیک طے شدہ بات  
ہے کہ اگر مسئلہ میں اختلاف ہو جائے تو وہ قول معتبر  
(شرح موسوم المفتی ص ۱۰)

دیکھ لیا جائے کہ اختلافی مسئلہ میں اکثریت کے قول کو ترجیح دینے کی بات  
اصول طور پر فقہاء کے یہاں مسلم ہے، جب دینی معاملات میں بھی اختلاف کی صورت  
میں اکثریت کا قول معتبر ہے تو انتظامی معاملات میں اکثریت کے قابل اعتبار نہ ہونے  
کا دعویٰ قابل قبول نہیں ہو سکتا بلکہ عقل سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ جب دینی مسائل میں  
اکثریت کا قول معتبر ہے تو انتظامی معاملات میں اس کو بدرجہ اولیٰ معتبر ہونا چاہیے،  
کیونکہ دینی مسائل میں تو ترجیح کا ایک اور طریقہ موجود تھا یعنی کتاب و سنت کی طرف  
مراجعت، لیکن اس کے باوجود ایک قول پر اتفاق نہ ہو سکا تو جس معاملہ میں ترجیح کی  
کوئی صورت نہ ہو وہاں بدرجہ اولیٰ کثرت رائے کی بنیاد پر ترجیح دی جاسکے گی۔ ہاں  
اگر ترجیح کا کوئی اور طریقہ متعین کر لیا گیا ہو جیسے قرعہ اندازی یا تمکیم وغیرہ، یا پہلے سے متعین  
نہ ہو بلکہ بروقت متعین کر لیا جائے تو انتظامی معاملہ میں ن تمام ہی صورتوں پر عمل کرنے کی  
گنجائش ہے۔

غرض یہ ہے کہ کثرت رائے کے وجہ ترجیح یا شرعاً معتبر ہونے کے لئے قرآن کریم  
احادیث پاک، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل، خلفاء راشدین کا عمل اور فقہاء کرام  
کی تصریحات سب ہی موجود ہیں، اس لئے اگر شوریٰ میں اختلاف رائے ہو جائے تو ایسی  
صورت میں اکثریت کی رائے کے مطابق فیصلہ کرنے میں شرعاً کوئی تنگی نہیں ہے۔

اور اگر اکثریت پر فیصلے کی بات باہمی معاہدہ یا دستور اساسی کی صورت میں ملے کر لی گئی ہو تو پھر صرف اکثریت ہی کی بنیاد پر فیصلہ کرنا ضروری ہو جائے گا۔

## مجلس شوریٰ میں امیر کی رائے کا درجہ

اس موقع پر ایک بحث کی تنقیح بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مجلس شوریٰ میں اختلاف رائے ہو جائے اور اکثریت کی بنیاد پر ترجیح دی جا رہی ہو تو امیر کی رائے کا کیا درجہ ہوگا، اس موضوع کی سب سے عمدہ وضاحت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عراق اور شام کی زر خیزہ مفتوحہ زمینوں کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے بلائی گئی مجلس شوریٰ میں کی گئی تقریر کے تمہیدی کلمات سے ہوتی ہے۔ یہ تمہیدی کلمات حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے کتاب الخراج میں حدیثی غیر واحد من علماء اہل المدینہ کہہ کر نقل فرمائے ہیں، یعنی قاضی ابو یوسف فرماتے ہیں کہ مجھ سے متعدد علماء اہل مدینہ نے بیان فرمایا کہ جب عراق و شام کی زمینوں کے تقسیم کے مسئلہ پر غور و خوض کے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مہاجرین و انصار کے نمائندوں پر مشتمل مجلس شوریٰ منعقد کی تو اس موقع پر ارشاد فرمایا:

فلما اجتمعوا حمد الله واشتق عليه	جب سب جمع ہو گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باری تعالیٰ
بما هو اهلہ ثم قال اني لمر ازعكم	کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ میں نے آپ حضرات کو مر
الا لان تشتركون في امانتي فيما	اپس لئے تکلیف دی ہے کہ آپ سب امانت میں شریک ہیں جو
حملت من اموركم فاني واحد	میرا د پر ڈال دیا گیا، اور اس مجلس شوریٰ میں میری حیثیت
كا حدكم (كتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۳۳)	بھی تم میں سے کسی ایک فرد کے برابر ہے۔

حضرت عمرؓ کا ارشاد انی واحد کا حد تک شوری کے موقع پر امیر کی رائے کا درجہ معین کرنے میں نقص صریح کا درجہ رکھتا ہے اس تمہیدی تقریر میں آگے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ تمہارے سامنے قرآن موجود ہے، میں نہیں چاہتا کہ آپ میری ہوئی (خواہش، یعنی رائے) کے مطابق بات کہیں بلکہ قرآن کریم کے مطابق جو صحیح موقف ہو اس کے مطابق رائے دیں۔ میری رائے تم میں سے کسی ایک فرد کے برابر ہے۔

غور فرمایا جائے کہ حضرت عمرؓ یہ نہیں فرما رہے ہیں کہ مجلس شوری کے انعقاد کی وجہ یہ ہے کہ آپ حضرات اپنی اپنی رائے دیں، اگر اختلاف ہوتا ہے تو بحیثیت امیر مجھے یہ حق ہوگا کہ اقلیت، اکثریت یا اپنی رائے میں سے کسی ایک موقف کو ترجیح دیدوں بلکہ آپ پوری وضاحت کے ساتھ یہ فرما رہے ہیں کہ میں بھی شوری کا ایک فرد ہوں۔ اور میری رائے بھی تم میں سے کسی ایک فرد کے برابر ہے۔

امیر کی رائے کا یہ درجہ کہ اس کو کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے، اگر حضرت عمرؓ کی جانب سے متعین فرمایا گیا ہو تب بھی اہل سنت والجماعت کے نقطہ نظر سے واجب التسلیم ہوتا، لیکن اس کی اہمیت اس لئے اور زیادہ بڑھ گئی ہے کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس طرح کے الفاظ منقول ہیں، مجمع الزوائد میں ہے :

عن معاذ بن جبل ان رسول الله صلى الله عليه وسلم لما اراد ان يسرح معاذاً الى اليمن فاستشارنا من اصحابه فيهم ابوبكر وعمر وعثمان وعلي وطلحة وزبير واسيد بن حضير	حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ کو یمن بھیجنے کا ارادہ کیا تو صحابہ کرام سے مشورہ کیا جن میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت اسید بن حضیرؓ تھے
---	---



فاستشارهم فقال ابو بکر  
لولا انک استشرتنا  
ما تکلمنا فقال انی فیما  
لم یوح الی کا حد کم قال  
فتکلم کل انسان برایہ الی آخر  
الحديث - (مجمع الزوائد ج ۱۵)  
بیان کی۔

اس روایت میں جو مجمع الزوائد میں طبرانی کی المعجم الکبیر سے نقل کی گئی ہے ایک  
راوی ابو العطف کے بائے میں لکھا ہے لہٰذا من ترجبہ یعنی ان کے احوال کی اطلاع  
نہیں ہے، لیکن بقیہ تمام روایات کے بائے میں توثیق کی گئی ہے، اس روایت میں  
انی فیما لہ یوح الی کا حد کہ فرمایا گیا ہے کہ جو باتیں وحی کے ذریعہ معلوم نہ ہوں ان میں  
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بائے میں فرما رہے ہیں کہ میں بھی تم میں سے کسی ایک کی  
طرح ہی ہوں۔

کتنی صاف بات ہے کہ مجلس شوریٰ منعقد ہوئی ہے، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ  
نے ارشاد فرمایا کہ حضرت! آپ نے مشورہ طلب کیا تو ہم اپنی رائے ظاہر کر رہے ہیں  
اگر آپ کی اجازت نہ ہوتی تو اظہار رائے کی جرأت نہ ہوتی، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس  
مؤدبانہ عرض کرنے پر آپ کی جانب سے ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ آپ پوری تکلفی  
سے رائے ظاہر کریں کیونکہ جن معاملات میں وحی نہیں آتی ان میں میری رائے بھی تم میں  
سے کسی ایک کے برابر ہے، اگر نوعیت وہ ہوتی جو دو سے نقطہ نظر کے دکلاؤ پیش  
کر رہے ہیں تو آپ یقیناً یہ وضاحت نہ فرماتے بلکہ ارشاد یہ ہوتا کہ آپ پوری

بے تکلفی سے رائے دیں، مشورہ کا مقصد یہ ہے کہ مسئلہ کے تمام پہلو واضح ہو جائیں  
پھر بحیثیت امیر میں جس رائے کو مناسب سمجھوں گا اختیار کروں گا۔ مگر سرکارِ دو عالم  
صلی اللہ علیہ وسلم صاف ارشاد فرماتے ہیں ابی فیما لہ یوح الی کا حد تک،  
کا حد تک میں کافی تشبیہ کیلئے ہے، موقع مجلس شوریٰ کے انعقاد کا ہے، حضرت  
ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نہایت مودب ہو کر عرض کیا ہے کہ حضرت! آپ کی اجازت  
ہے اس لئے لب کشائی کی جرات کر رہے ہیں، ورنہ بارگاہِ رسالت میں اپنی رائے پیش  
کرنے کی جرات کہاں ہے؟ اس کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں کہ وحی سے  
مستثنیٰ تمام معاملات میں پیغمبر علیہ السلام کی رائے، دوسرے صاحب رائے کی طرح ہے۔  
حضرت عمرؓ کے ارشاد ابی واحد کا حد تک اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم  
کے ارشاد ابی فیما لہ یوح الی کا حد تک سے بالکل صراحت کے ساتھ یہ  
حقیقت منقح ہو جاتی ہے کہ اگر کسی شخص کو واقعہ امارت عالیہ حاصل ہے تب بھی کسی  
رائے دوسرے ممبران کی رائے پر فوقیت یا امتیاز نہیں رکھتی، پھر ماتحت قسم کے وہ امراء جو  
مجلس شوریٰ کے بحیثیت عہدہ ممبر بنائے گئے ہوں ان کی رائے کو اتنی اہمیت دینا کہ وہ  
اقلیت یا اکثریت یا اپنی رائے میں سے کسی کو ترجیح دیں، مذکورہ بالا تصریحات کے  
بالکل منافی ہوگا۔

## حضرت حکیم الامتؒ کے نقطہ نظر کی وضاحت

اس موضوع کے آخر میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی  
قدس سرہ کے نقطہ نظر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کیونکہ شوریٰ کی بالادستی

کے انکار، اور ہمت کے اختیارات کی وسعت کے لئے حضرت اقدس کا نام لے کر غلط فہمی پیدا کی جا رہی ہے۔ اور حضرت اقدس ہی کے حلقہ اثر کے بعض علماء نے اس نقطہ نظر کی تائید کی ہے۔

حالانکہ مدارس عربیہ کے نظام کار میں ثوری کی بالادستی کے سلسلہ میں حضرت حکیم الامت قدس سرہ کی متعدد تحریریں ہیں، وہ ۱۲۲۲ھ سے ۱۳۵۲ھ تک دارالعلوم دیوبند کے سرپرست رہے ہیں اس دور میں حضرت اقدس کی جتنی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ تحریریں (جو محافظ خانہ دارالعلوم میں محفوظ ہیں) ہیں ان سے ثوری کی بالادستی ہی معلوم ہوتی ہے۔۔۔ مثلاً جب حضرت مولانا محمد طیب صاحب رحمہ اللہ کو دوبارہ نائب مستہم مقرر کیا گیا اور اس وقت حضرت علامہ کشمیری رحمہ اللہ اور ان کے تلامذہ کی جانب سے اہتمام میں وراثت قائم کرنے پر نیکر کی گئی اس وقت حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے دارالعلوم کے سرپرست کی حیثیت سے ایک تحریر ”الکلم الطیب“ کے نام سے مرتب کر کے اہتمام میں بھیجی، اس کے اقتباسات ملاحظہ ہوں :-

”خود احقر کے قلب میں یہ امر وارد ہوا کہ مستقبل کے لئے ابھی سے کوئی ہمت تجویز ہو جانا ضروری ہے کہ اس وقت ثبات پر مقرر ہو، پھر موقع پر ہمت بنادیا جائے تاکہ عین وقت ضرورت پر ثباتی نہ ہو، اس وارد کو میں نے حضرات ارکان کی خدمت میں سفارش کے ساتھ پیش کر کے منظور کرایا۔“

۱۔ اس موضوع سے متعلق حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے ایک وعظ کے کچھ حصے بھی شائع کئے گئے تھے، مگر یہ وعظ مسئلہ کا ہے اور حضرت اقدس نقطہ نظر کی وضاحت میں جو عبارتیں دی گئی ہیں وہ اس کے بعد کی ہیں اور مرتب ۱

اگر حضرت اقدس رحمہ اللہ، شوری کی بالادستی تسلیم نہیں فرماتے تو اپنے وارد قلبی کو ان کی خدمت میں سفارش کے ساتھ پیش کر کے منظور کرانے کا کیا مفہوم ہوگا، پیش کر کے منظور کرانا بالادستی کا صریح اعتراف ہے، خصوصاً جبکہ حضرت اقدس اس دور میں سرپرست بھی تھے۔

پھر اس تحریر میں طولانی تمہید کے بعد ایک اعلان عام ہے، جو اس وقت کے اخبارات و رسائل میں طبع کرایا گیا تھا، اس کا متن درج ذیل ہے :

”اعلان عام کیا جاتا ہے کہ دارالعلوم کسی کا مملوک نہیں، نہ اس کے اہتمام میں وراثت جاری ہو سکتی ہے، خاندان مولانا محمد قاسم صاحب کو دارالعلوم کے ساتھ خصوصیت بے شک حاصل ہے مگر اس کا یہ ثمرہ نہیں ہو سکتا کہ اہتمام دارالعلوم بطور وراثت اسی خاندان میں قائم رہے، اگر ہر زمانہ کی مجلس شوریٰ بطور حق شناسی و بخیال حسن انتظام و مصالح دارالعلوم اسی خاندان کے اہل افراد کا انتخاب کریں تو مستحسن ہے، اور اگر باوجود مذکورین کی اہلیت کے کسی دوسرے شخص کا انتخاب کریں یہ بھی ان کو اختیار ہے۔“

یہ بھی اعلان کیا جاتا ہے کہ مولوی عاقل قاری محمد طیب صاحب دارالعلوم کی مدرسے کے ساتھ نیابت اہتمام کے لئے بھی نامزد کئے گئے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ وہ مہتمم ہی بنائے جائیں یا ہمیشہ کے لئے وہ نائب مہتمم رہیں، مجلس شوریٰ کو ہر وقت تغیر و تبدل کا اختیار ہے۔“

کتبہ اشرف علی تھانوی

سارس شعبان ۱۳۴۷ھ

اس اعلان میں حضرت مولانا قدس سرہ نے مجلس شوریٰ کی مہتمم پر بالادستی کی مکمل تصریح کی ہے، کیونکہ وہ ہر زمانہ کی مجلس شوریٰ کو مہتمم کے انتخاب کا اختیار دے رہے ہیں اور تغیر تبدیل کا بھی ہر وقت اختیار دے رہے ہیں اس سے زیادہ اور کیا صراحت ہو سکتی ہے؟ اس کے علاوہ ”بیاض شرفی“ میں مدارس عربیہ کے لئے ایک دستور اساسی دیا گیا ہے، جسے بنیادی اور اجمالی حیثیت سے حضرت تھانویؒ ہی نے مرتب فرمایا ہے، اس میں مجلس شوریٰ اور مہتمم کے بارے میں کئی دفعات ہیں، انکے الفاظ یہ ہیں:

دفعہ ۳ — ”اسی طرح مہتمم کا نصب عزل بھی قواعد منظور شدہ کے تحت میں صرف ممبروں کی متفقہ رائے سے ہو سکے گا، اور کسی کا اس میں دخل ہوگا“

(ص ۶۶ بیاض شرفی)

دفعہ ۷ — مہتمم سے کسی قسم کی باز پرس کا حق صرف ممبروں کو ہے خواہ ایک ہی ممبر ہو، پھر اس باز پرس کے بعد اگر مہتمم اس کی اصلاح میں متفق ہو جاویں فہما، اور اگر مہتمم کو اپنے طرز عمل پر اصرار ہو تو اس ممبر کو صرف یہ حق ہوگا کہ دوسرے ممبروں کو اطلاع کر دے۔ اگر سب متفق ہو جاویں تو مہتمم کو اپنا طرز عمل بدلتا واجب ہوگا اور اگر ممبروں میں اختلاف ہے تو حسب قواعد جس شق کو ترجیح دی جائے مہتمم کو اس کی پابندی لازم ہوگی (ص ۷۰ ایضاً) ۱

ان عبارتوں میں مجلس شوریٰ کی مہتمم پر بالادستی بالکل واضح ہے کیونکہ ان عبارتوں میں مجلس شوریٰ کو مہتمم کے عزل و نصب اور مہتمم سے باز پرس کا اختیار دیا گیا ہے اور مجلس شوریٰ کے متعین کردہ موقف کے مطابق، مہتمم پر اپنے طرز عمل کا تبدیل کرنا لازم قرار دیا گیا ہے۔

حضرت حکیم لامت قدس سرہ کے نقطہ نظر کی وضاحت کے سلسلہ میں دوسری بات اختلاف رائے کی صورت میں سرپرست کے اختیارات کی وسعت کا مضمون ہے اس سلسلہ میں اس حقیقت کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ جب حضرت حکیم لامت قدس سرہ نے ۱۲۴۳ھ میں دارالعلوم کی سرپرستی قبول فرمائی اس وقت تک موجودہ دستوراساسی نہیں تھا، بلکہ دارالعلوم کی رودادہی میں آئین مدرسہ کے نام سے کچھ دفعات طبع کردی جاتی تھیں، باقاعدہ پہلا دستوراساسی ۱۲۴۵ھ میں مرتب ہوا ہے، دستوراساسی سے پہلے بھی مجلس شوریٰ اسی طرح ہئیت حاکمہ تھی جیسے آج ہے، بلکہ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب مہتمم دوم کے اصول ہشتگانہ سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ مجلس شوریٰ جزئیات تک میں پوری طرح ذخیل تھی، کیونکہ مہتمم دوم نے ۱۲۸۸ھ میں مجلس شوریٰ سے امور جزئیہ کی انجام دہی کی اجازت لی ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ سرپرست کا ہر اعتبار سے احترام ملحوظ رہتا تھا اور مجلس شوریٰ اپنی تمام تجاویز سے سرپرست کو مطلع کرتی تھی۔ تعامل میں یہ بات تھی کہ اگر تجاویز مجلس شوریٰ اتفاق رائے سے پاس کرتی تھی تو سرپرست بھی اس کے ساتھ اتفاق کرتے تھے اور اگر سرپرست کو اختلاف ہوتا تو وہ اپنی رائے مدلل کر کے دوسری مجلس شوریٰ میں پیش کرتے تھے، مجلس اگر سرپرست کے دلائل سے اتفاق کرتی تو تجویز میں تبدیلی کرتی اور اگر سرپرست کے اختلاف کے باوجود مجلس سی تجویز کو نافذ کرنا ضروری سمجھتی تو سرپرست کو اتفاق کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اگر کسی تجویز میں ممبران شوریٰ کی رائے میں اتفاق نہ ہوتا تو اکثریت یا اقلیت کی رائے کی ترجیح کے سلسلہ میں سرپرست کی طرف رجوع کیا جاتا تھا، ۱۲۴۵ھ کے دستوراساسی میں اسی تعامل کو ضابطہ کی صورت



دی جانے لگی تو ممبران شوریٰ کو اس پر شرح صدر نہ ہوا، آخر کار ۱۳۵۲ھ میں  
حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے سرپرستی سے استعفیٰ لے دیا۔  
تاریخ دارالعلوم میں سید محبوب صاحب ضوی نے تفصیل ان الفاظ میں  
قلم بند کی ہے :

”زمانہ قدیم سے دارالعلوم کی سرپرستی کی یہ شکل تھی کہ جماعت میں شخصیت اپنے علم و فضل  
ورع و تقویٰ، بزرگی اور اصابت رائے کے لحاظ سے زیادہ ممتاز ہوتی تھی اس کو  
دارالعلوم کے انتظامی امور کا مرجع الامر تصور کر کے، مجلس شوریٰ اپنی تجاویز کے  
فیصلوں میں سرپرست سے رجوع کرتی تھی البتہ اسکے لئے کوئی ضابطہ مقرر نہ تھا  
اور واقعہ بھی یہ ہے کہ دارالعلوم میں نمود و نمائش کی ضابطہ بند یوں کے بجائے درحقیقت  
ریاست و اخلاص و خلوص و ولایت پر زیادہ تر کاموں کی سرانجامی کا مدار رہتا  
آیا ہے، سرپرست کے اختیارات کا حاصل یہ تھا کہ ممبران میں اختلاف رائے  
کی صورت میں سرپرست کی رائے کے مطابق فیصلہ ہوتا تھا اس میں خواہ سرپرست  
کی رائے قلت کی ہی جانب کیوں نہ ہو، البتہ اگر ممبران متفقہ طور کی چیز کو پاس کرتے  
اور سرپرست کو اس کے اختلاف ہوتا تو وہ وجہ اختلاف کو مدلل تحریر کر کے  
مجلس میں دوبارہ غور و خوض کے لئے بھیج دیتے تھے، اس صورت میں اگر  
مجلس اپنی سابقہ رائے سے رجوع نہ کرتی تو البتہ مجلس ہی کی رائے برقرار رہتی۔  
اور بغیر استرضائے سرپرست اس کا نفاذ ہو جاتا تھا“

(تاریخ دارالعلوم جلد اول ص ۲۸۶)

اس تحریر سے یہ بات معلوم ہوئی کہ مجلس شوریٰ کے اتفاق رائے کی صورت میں

سرپرست بھی مجلس کے پابند تھے اور ان کے لئے یہ پابندی بالکل ضروری اور شرعی تھی کیونکہ مجلس شوریٰ نے اس سلسلہ میں انکو کوئی اختیار یا کوئی امتیازی حق نہیں دیا تھا۔ مجلس شوریٰ نے محض اختلاف رائے کی صورت میں انکو اختیار دیا تھا، اسکے بعد تاریخ دارالعلوم میں حضرت حکیم الامت کے استعفی کے بارے میں اجمالی طور پر لکھا گیا ہے :

” ۱۳۳۵ھ میں جب انتظامی امور کے لئے قوانین مدون ہوئے تو مندرجہ بالا طریق عمل کو باضابطہ بنادیا گیا، مگر ۱۳۳۶ھ میں کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ اس بارے میں مجلس شوریٰ کے اندر اختلاف رائے پیدا ہو گیا، ایک جماعت کی رائے اس طریق عمل کی حمایت میں تھی اور دوسری جماعت اس کو مجلس شوریٰ کی بے کسی اور عدم ضرورت سے تعبیر کرتی تھی اور فیصلہ کا مدار کثرت رائے پر رکھنا چاہتی تھی چنانچہ مجلس شوریٰ کے متعدد اجلاسوں میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ جو ۱۳۳۴ھ سے دارالعلوم کے سرپرست تھے از خود مصلحتاً سرپرستی سے مستعفی ہو گئے۔ رجب ۱۳۵۳ھ میں مجلس شوریٰ نے حسبِ الفاظ میں یہ استعفی منظور کیا۔“

” مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس بدورے غور و فکر اور احترام و تقدس اور عظمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے حضرت مولانا تھانوی مدظلہ کے استعفی کو نہایت افسوس کے ساتھ منظور کرتا ہے اور حضرت مجددِ صریح درخواست کرتا ہے کہ اپنی دعوات صالحہ اور توجہاتِ عالیہ سے دارالعلوم پر ہمیشہ نظر گستر رہیں گے۔“

(تاریخ دارالعلوم جلد اول ص ۲۸)

پیش کردہ حقائق سے اور ذکر کردہ اقتباسات چند باتیں پوری طرح ثابت ہیں:

۱۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے شوری کی بالادستی، یا ہیتِ حاکمہ ہونے سے انکار نہیں فرمایا ہے۔

۲۔ اتفاق رائے سے پاس ہونے والی تجاویز کے سلسلہ میں سرپرست بھی مجلس شوریٰ کے پابند تھے۔

۳۔ اختلاف رائے کی صورت میں سرپرست کی جانب سے دی جانے

والی تریح کا معاملہ اس وقت کا ہے جب دستورِ اساسی میں کوئی بات اس سلسلہ میں طے نہیں کی گئی تھی کہ اکثریت کی رائے

کے مطابق تجویز کا نفاذ ہوگا، بلکہ اگر حقیقت پر نظر ہو کہ جب

مجلس شوریٰ الوامر کی وہ مجلس ہے جس کے احکام واجب الطاعت

ہیں اور ہندوستان کے مدارس عربیہ میں اس کی حیثیت

قائم مقام سلطان کی ہے جیسا کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب

سہارنپوری اور حضرت حکیم الامت کی خط و کتابت سے یہ بات

ثابت ہو چکی ہے اس لئے حقیقت پر نظر ہو تو کہنا ہوگا کہ

سرپرست کو یہ اختیار بھی مجلس شوریٰ کا دیا ہوا تھا، کیونکہ

جب مجلس شوریٰ کو اسلام میں وہ حیثیت حاصل ہے کہ

وہ سلطان کا بھی انتخاب کرتی ہے تو مدارس کے سرپرست

کی حیثیت سے کسی ہستی کا انتخاب بھی اسی کا کام ہے۔

اور یہ حقیقت اس طرح مزید منقطع ہو سکتی ہے کہ یہ معلوم

كر لىا جائے كہ كسى شىخى كى سرپرست كىون بنا تا هے ، ظا مىر هے كہ سرپرست خود هئى بن جا يا كرتے بلكه سرپرستى اكر كوى منصب هے تو اس منصب كے لئے تجويز ، انتخاب اور نصب كا عمل جس كى جانب سے وجود مىل آيا هوگا اسى كو بلا دست سمجها جائے گا ۔

چنا نچه جب كسى معاملة مىل ثورئى اور سرپرست كے درمىان اختلاف هوا تو سرپرست محترم نے از خود استعفى پش كرىا ، مجلس ثورئى كے سامنے استعفى پش كرنا بهى بلا دستى كے اعتراف پر مبنى هے ، ورنه اكر اكثرىت پر فصىلے كى بات ان كے نقطه نظر سے خلاف شرع هوتى تو وه ضرور ىه فرماتے كه اىسا كرنا خلاف شرع يانا جائز هے ، اس سلسله مىل زىاده سے زىاده هو الفاظ حضرت حكيم الامت كے قلم سے نكلے هئى وه بىان القرآن مىل موجود هئى :

”امور متعلقه بالرائے والمشوره مىل كثر تـ رائے كا ضابطه محض

بے اصل هے“

اس كے معنى ىه هرگز هئى هئى كه كثر تـ رائے كا ضابطه خلاف شرع يانا جائز هے بلكه اس كے معنى فقط اتنے هئى كه كثر تـ رائے پر فصىلہ كرنا ان كے نزديك كسى اصل سے صراحت كے ساتھ اس طر ح ثابت هئى كه دوسر رُخ كو اختيار كرنا ناجائز هو جائے حضرت حكيم الامت قدس سره كے قلم سے نكلا هوا اىك اىك

لفظ غور و فکر اور تدبیر کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اگر حضرت اقدس کثرت رائے کو ناجائز یا خلاف شرع سمجھتے تو وہ بڑا اس کو خلاف شرع فرماتے، اور اس موقف کو مدلل کر کے ممبران شوریٰ کو صداقت کے قبول کرنے کی تلقین فرماتے جیسا کہ اکابر دیوبند کا طرہ امتیاز ہے، لیکن اسکا کوئی ثبوت نہیں ملتا، اور اس سے یہ سمجھنا آسان ہے کہ حضرت حکیم الامت بھی اس کی گنجائش سمجھتے تھے خواہ یہ موقف ان کے نقطہ نظر سے رائج نہ رہا ہو۔

۴۔ نیز یہ کہ حضرت حکیم الامت قدس سرہ کا یہ اختلاف صرف سرپرست کے بارے میں تھا، مہتمم کے بارے میں نہیں تھا مہتمم کو حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے ہر جگہ مجلس شوریٰ کا ماتحت ہی سمجھ کر کلام فرمایا ہے۔“

اب غور طلب بات یہ ہے کہ مجلس شوریٰ ۱۳۵۴ھ نے جس کے ممبران بڑے بالغ نظر فقہاء، مشائخ اور اساطین ملت ہیں۔ سرپرست کو بھی یہ حق نہیں با کہ وہ مجلس شوریٰ میں اختلاف رائے کی صورت میں اکثریت، اقلیت یا اپنی رائے میں سے کسی کو ترجیح دیں جبکہ گمان غالب ہے کہ حضرت حکیم الامت قدس سرہ جیسے سرپرست کے لئے بجا طور پر اس کی گنجائش تھی، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ دستور اساسی میں شخصیات کی رعایت نہیں کی جاتی بلکہ اصول کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، کیونکہ اگر سرپرست کو مجلس شوریٰ پر کسی معاملہ میں بالادستی دے دی جائے

تو جب تک سرپرست حضرت حکیم الامت جیسے عبقری صفت بزرگ ہوں گے  
فصل خداوندی سے خیر ہی کی اُمید کی جائے گی۔ لیکن اگر کسی زمانے  
میں ایسے افراد مہیا نہ ہوتے تو مدارس عربیہ کے نظام کار میں خیر کے غالب  
ہونے کی توقع باقی نہ رہ سکے گی جیسا کہ مشاہدے میں آ رہا ہے کہ اہتمام کے  
بابے میں وراثت کی روش پر چلنے والے حضرات اس عمدہ نظام کار کو اپنے مقاصد  
میں حارج سمجھ کر اس کو نقصان پہنچانے کی سعی کر رہے ہیں۔

انہی مصالحتوں کے پیش نظر مجلس ثوری نے حضرت حکیم الامت قدس سرہ  
جیسے بزرگ کی سرپرستی سے محرومی کی تلخ حقیقت کو گوارا کیا لیکن دستوراساسی میں  
مجلس ثوری کی بالادستی کو محفوظ رکھا۔ اور اب جبکہ دستوراساسی میں ہر بات  
منقح کر دی گئی ہے مجلس ثوری، سرپرست، مہتمم اور تمام عہدے داروں کے  
اختیارات اور فرائض منصبی واضح کر دیئے گئے ہیں تو اب یہ دستوراساسی —  
وہ معاہدہ شرعی ہے۔ جس کی — از روئے قرآن و حدیث — پابندی  
لازم ہو گئی ہے۔ —



## دستور اساسی

دستور اساسی کی حیثیت اس مضبوط معاہدہ کی ہے جس کی پابندی ادارہ میں کام کرنے والے تمام کارکنان کے لئے واجب اور ضروری ہے، اسکے جواز و عدم جواز کا انحصار اس کی دفعات پر ہے، اگر ان دفعات میں سے کوئی دفعہ خلاف شرع ہے تو اس دستور کو ناجائز کہا جائے گا، اور اگر تمام دفعات عین شریعت کے مطابق ہیں تو اس کو ناجائز یا خلاف شرع قرار دینا درست نہ ہوگا۔

دارالعلوم دیوبند کا دستور اساسی، ایسے باغ نظر فقہاء اور پابند شریعت علماء کا مرتب کردہ ہے جن کے بارے میں شریعت سے انحراف کا شبہ تک نہیں کیا جاسکتا، پھر اس کی ترتیب و تدوین میں اس کی رعایت رکھی گئی ہے کہ حضرت نانوتوی، اور حضرت گنگوہی کے دور سے تاریخ تدوین تک مجلس شوری کی بنیادی تجاویز آجائیں، ان تمام دفعات کو شریعت اور فقہ کی کسوٹی پر پرکھا جا چکا ہے اور آج بھی ان دفعات میں سے کسی دفعہ پر انگلی نہیں نکائی جاسکتی دستور اساسی کی دفعات میں بعض چیزیں تو ایسی ہوتی ہیں جن کی ایک ہی جانب شریعت میں متعین ہوتی ہے مثلاً مقاصد، اور بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ شریعت میں ان کی صرف ایک صورت متعین نہیں ہوتی جبکہ دونوں جانب اصالتاً مباح ہوتی ہیں، لیکن نظام کار کے تعین کے لئے کسی ایک جانب

کو معین کر لیا جاتا ہے مثلاً اختلاف رائے کی صورت میں سرپرست کی رائے، یا اکثر رائے کے ذریعہ فیصلہ وغیرہ۔

ادارہ میں کام کرنے والے تمام کارکنان کا یہ فریضہ ہوتا ہے کہ وہ دستور اساسی کے مطابق کام کریں، دستور اساسی سے انحراف کی صورت میں مجلس اولوالامریہ ادارہ کے سربراہ کو باز پرس کا حق ہوتا ہے۔

دستور اساسی کی یہ پابندی اصول شریعت سے ثابت ہے، جن میں المسلمون عند شروطہم کہ تمام مسلمانوں کو باہمی شرائط کی پابندی کرنا لازم ہے الضرر یزال نقصان کی تمام صورتوں کو ختم کرنا ضروری ہے، وغیرہ ہیں۔ قرآن کریم میں بھی باہمی معاہدات کی پابندی کی تاکید فرمائی گئی ہے، سورہ مائدہ کی پہلی آیت۔

یا ایہا الذین امنوا اذنوا بالعقود اے ایمان والو! عہدوں کو پورا کرو پر معارف القرآن میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے لکھا ہے۔

یہ اس سورت کی پہلی آیت کا پہلا جملہ ایک ایسا جامع جملہ ہے کہ اس کی تفسیر و تشریح میں ہزاروں صفحات لکھے جاسکتے ہیں۔ (معارف القرآن ج ۱) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے فقہ و تفسیر کی کتابوں کے حوالہ سے بہت قیمتی کلام کیا ہے اور اس کے بعد خلاصہ کے طور پر لکھا ہے۔

یہ اسی لئے امام راغب اصفہانی نے فرمایا کہ معاہدات کی جتنی قسمیں ہیں سب اس لفظ کے حکم میں داخل ہیں، اور پھر فرمایا کہ اس کی ابتدائی تین قسمیں ہیں، ایک وہ معاہدہ جو انسان کا رب العالین کے ساتھ ہے مثلاً ایمان، طاعت کا عہد، یا حلال

حرام کی پابندی کا عہد۔ دوسرے وہ معاہدہ جو ایک انسان کا خود اپنے نفس کیساتھ ہے جیسے کسی چیز کی نذر اپنے ذمہ مان لے، یا حلف کر کے کوئی چیز اپنے ذمہ لازم کر لے تیسرے وہ معاہدہ جو ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ ہے اور اس تیسری قسم میں وہ تمام معاہدات شامل ہیں جو دو شخصوں یا دو جماعتوں یا دو حکومتوں کے درمیان ہوتے ہیں۔

حکومتوں کے بین العالمی معاہدات یا باہمی سمجھوتے، جماعتوں کے باہمی عہد و میثاق اور دو انسانوں کے درمیان ہر طرح کے معاملات نکاح، تجارت، شرکت اجارہ، ہبہ وغیرہ، ان تمام معاہدات میں جو جائز شرطیں باہم طے ہو جائیں اس آیت کی رو سے ان کی پابندی ہر فریق پر لازم و واجب ہے۔  
(معارف القرآن ۱۳۹۱ء جلد سوم)

دیکھئے دستور اساسی بھی وہی باہمی معاہدہ ہے جس میں باہم جائز شرطیں طے کر لی گئی ہیں، ان میں یہ دفعات بالکل واضح ہیں کہ مجلس شوریٰ کے ہاتھ میں دارالعلوم کا تمام نظم و نسق ہوگا اور ہر قسم کے اختیارات و انتظامات جو دارالعلوم کے استحکام و ترقی اور حصول مقصد کیلئے ضروری یا مفید ہوں وہ مجلس شوریٰ کے ہاتھ میں ہوں گے، ان دفعات میں یہ بھی ہے کہ مہتمم کو مجلس شوریٰ کی جانب سے حسب ذیل اختیارات حاصل ہوں گے، پھر ان اختیارات کی نمبر وار وضاحت کی گئی ہے، ان دفعات میں یہ بھی ہے کہ مہتمم مجلس شوریٰ اور مجلس عالمہ کے روبرو جواب دہ ہوں گے، وغیرہ۔ اس لئے مہتمم اگر کسی وقت مجلس شوریٰ کے عطا کردہ اختیارات سے تجاوز کر کے احکام کا نفاذ شروع کر دیں تو مجلس اولوالامر یا

مجلس شوریٰ کو بجا طور پر ان سے مواخذہ کا شرعی جواز ہے۔

حضرت مولانا فتح محمد صاحب تائب لکھنوی (طیعوا اللہ واطیعوا  
الرسول وادلی الامر منکم) کے تحت لکھتے ہیں۔

”سلطان اور مجتہد یا استاذ یا شیخ یا والد یا زوج وغیرہ (وغیرہ میں  
مجلس شوریٰ بھی یقیناً شامل ہے) جس امر مباح کو لازم کر دیں وہ دو حال سے  
خالی نہیں ہے۔ یہ کہ امر انتظامی ہو گا جیسے طریق جنگ یا تدبیر قواعد انتظامی، اس کے  
لزوم میں کوئی کلام نہیں ورنہ حکومتیں باطل اور مصلحتیں معطل اور نظم درہم برہم  
اور امر مختل ہو جائیں گے، اور یہ لزوم اس عہد پر مبنی ہے جو حاکم و محکوم میں ہوتا  
ہے۔ یہ کہ عبارات و عقائد میں ہو پس ایسا لزوم باطل ہو گا کہ دین میں نئی  
بات پیدا کرنے کا کسی کو حق نہیں اور بوقت اختلاف مامور کو حق رجوع حاصل ہے  
(خلاصۃ التفاسیر ۲۹۹ جلد اول)

حضرت مولانا مرحوم نے بالکل وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ انتظامی معاملات  
میں امر مباح کو لازم کرنا بالکل درست ہے اور فقہاء اس معاملہ میں کوئی اختلاف  
نہیں رکھتے، اور یہ لزوم اس عہد پر مبنی ہے جو حاکم و محکوم میں ہوتا ہے، گویا دستور  
اساسی میں، انتظامی معاملات میں، جن مباح چیزوں کی پابندی کو لازم کر لیا گیا  
ہے وہ سب واجب ہو جائیں گی، اور کسی کارکن یا مہتمم کے لئے اس سے انحراف  
کی اجازت نہ ہوگی۔

اسی طرح قرآن کریم کی دوسری آیت میں سورۃ الاسراء میں فرمایا گیا ہے۔

واذنوا بالعہد ان العہد کان مسئلوا پورا کرو عہد کو، بے شک عہد کی پوچھ گچھ ہوگی

قرآن کریم میں صیغہ امر سے پوری وضاحت کے ساتھ حکم دیا جا رہا ہے کہ تمام معاہدات کو پورا کیا جائے، عہد کا لفظ ہر طرح کے معاہدات کو شامل ہے، اس آیت کی تفسیر میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا ہے۔

(سورہ مائدہ کاٹھ دسواں حکم عہد کو پورا کرنے کی تاکید ہے، عہد دو طرح کے ہیں ایک وہ جو بندہ اور اللہ کے درمیان ہیں جیسے ازل میں بندے کا یہ عہد کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہمارا رب ہے، اس عہد کا لازمی اثر اس کے احکام کی اطاعت اور اس کی رضا جوئی ہوتا ہے، یہ عہد تو ہر انسان نے ازل میں کیا ہے خواہ دنیا میں وہ مومن ہو یا کافر، دوسرا عہد مومن کا ہے جو شہادۃ ان لا الہ الا اللہ کے ذریعہ کیا گیا ہے جس کا حاصل احکام الہیہ کا مکمل اتباع اور اس کی رضا جوئی ہے، دوسری قسم عہد کی وہ ہے جو انسان کسی انسان سے کرتا ہے جس میں تمام معاہدات سیاسی تجارتی، معاملاتی شامل ہیں جو افراد یا جماعتوں کے درمیان دنیا میں ہوتے ہیں پہلی قسم کے تمام معاہدات کا پورا کرنا انسان پر واجب ہے اور دوسری قسم میں جو معاہدات خلاف شرع نہ ہوں ان کا پورا کرنا واجب ہے، جس معاہدہ کا پورا کرنا واجب ہے اگر کوئی فریق پورا نہ کرے تو دوسرے کو حق ہے کہ عدالت میں مراجعہ کر کے اس کو پورا کرنے پر مجبور کرے۔ معاہدہ کی حقیقت یہ ہے کہ دو فریق کے درمیان کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا عہد ہو۔

(معارف القرآن ۲۶۸ جلد پنجم)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے ایک بات اور زائد ارشاد فرمائی کہ وہ معاہدات جن میں دستور اساسی بھی بالیقین شامل ہے اور جن کو پورا کرنا واجب

ہے اگر کوئی فرق ان کو پورا نہیں کرتا، تو دوسرے فرق کو عدالت میں مرافعہ کر کے پابندی پر مجبور کرنے کا حق ہوگا، مثلاً ہستم جو روز اول سے مجلس شوریٰ کے ماتحت کام کرنے کے مکلف تھے جن کو مجلس شوریٰ نے کام پر مامور کیا تھا، جن کی تنخواہ کا تعین مجلس شوریٰ نے کیا تھا، جن کے نصب کے ساتھ، جن کا عزل بھی مجلس شوریٰ ہی کے اختیار میں ہے، ہمیشہ کا تعال اور دستور اساسی کی صراحت جن کے بارے میں شوریٰ کی ماتحتی میں کام کرنے کی ہے وہ اگر اس معاہدہ شرعی اور دستور اساسی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی وقت مجلس شوریٰ ہی کو تحلیل کرنے کا اقدام کرنے لگیں تو حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں کہ دوسرے فرق کو یہ حق ہوگا کہ وہ عدالت میں مرافعہ کر کے معاہدہ کی تکمیل پر مجبور کرے۔

## عدالتی مرافعہ میں رجسٹریشن کی اہمیت

یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ رجسٹریشن صرف اس عدالتی مرافعہ کو مضبوط اور باقاعدہ بنانے کا قانونی طریقہ ہے، مدارس عربیہ کے رجسٹریشن کی حقیقت یہ ہے کہ (گورنگ باڈی) مجلس شوریٰ کی جانب سے مرتبہ دستور اساسی کے مطابق ادارہ کو چلانے کا حکومت وقت کے اس محکمہ میں اندراج کرا دیا جائے جو اسی مقصد کے لئے حکومت نے قائم کیا ہے۔

اس دور میں یہ ایک ضرورت بن گئی ہے، اگر رجسٹریشن نہ کرایا جائے تو عصر حاضر میں تحفظ کی ضمانت نہیں رہتی، جس طرح حکومت نے اوقاف کے تحفظ



کیلئے مسلم وقف بورڈ قائم کیا ہے، اور وہ اوقاف کی نگرانی اور حفاظت کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے ہے، اگر وقف بورڈ میں کسی جائیداد کا اندراج نہیں ہے تو بحیثیت وقف اس کے تحفظ کی ضمانت نہیں ہے، اسی مجبوری کے سبب، مدارس عربیہ کے ذمہ دار، ادارہ اور اس کے دستوراساسی کا، عصر حاضر کے قوانین کے تحت رجسٹریشن کرایینا مناسب خیال کرتے ہیں، تاکہ ادارہ کا نظم اگر کسی چھوٹے یا بڑے عہدے دار کی خلاف ضابطہ کارروائیوں سے متاثر ہو تو عدالتی کارروائی کر کے آسانی کے ساتھ مسائل کا حل نکالا جاسکے۔

چنانچہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ممبران نے انہی مصلحتوں کے پیش نظر رجسٹریشن کرایا، سوسائٹی ایکٹ کے تحت رجسٹریشن کی مجددخواست دی گئی اس کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے۔

## درخواست برائے رجسٹریشن

ایکٹ ۸۶ء کے تحت دارالعلوم دیوبند کے سلسلے میں دارالعلوم ایسوسی ایشن کا یہ نوٹم

- ۱۔ اس سوسائٹی کا نام دارالعلوم دیوبند ہوگا
  - ۲۔ اس سوسائٹی کا صدر دفتر دیوبند میں ہوگا
  - ۳۔ اس سوسائٹی کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہوں گے۔
- (الف) علوم عربیہ و دینیہ (یعنی قرآن مجید و تفسیر و حدیث و فقہ و عقائد و کلام و دیگر مذہبی فنون) کی مسلمانان عالم کو تعلیم دینا

(ب) ثانوی مرتبہ میں دیگر علوم و فنون کی تعلیم جو عربی زبان کی تحصیل یا مذہبی غرض کی تکمیل کیلئے ضروری یا مفید ہو، اسی طرح فارسی و اردو و دیگر زبانوں کی بقدر ضرورت تعلیم دینا۔

(ج) حفاظت و اشاعت اسلام کی خدمات بذریعہ تقریر و تحریر بجالانا اور مسلمانوں میں دینی تعلیم و تبلیغ اور جزو کل میں سلف صالحین جیسے اسلامی اخلاق و اعمال اور جذبات پیدا کرنا۔

(د) دوسرے فنون اور حرفتوں کو بقدر ضرورت اسی حد تک اختیار کرنا کہ اصل مقصد تعلیم میں نقصان واقع نہ ہو اور جنہیں اصل مقصد کے لئے معاون و مددگار سمجھا گیا ہو۔

(۴) علوم دینیہ کی اشاعت کے لئے مختلف مقامات پر مدارس عربیہ قائم کرنا اور قائم شدہ مدارس کا دارالعلوم سے الحاق کرنا۔

(۳) دارالعلوم کے معاملات کا انتظام، دارالعلوم کے دستور اساسی کے مطابق — مجلس شوریٰ اور مجلس عالمہ کے سپرد ہے جس کے ممبران

فی الحال حسب ذیل ہیں۔

### ممبران مجلس شوریٰ

نمبر سلسلہ	نام	عہدہ	پتہ
۱	مولانا الحاج قاری محمد طیب صاحب	مستتر دارالعلوم و مجلس شوریٰ و مجلس عالمہ	دارالعلوم دیوبند
۲	مولانا محمد ابراہیم صاحب	ممبر مجلس شوریٰ و مجلس عالمہ	پرنسپل دارالعلوم دیوبند
۳	مولانا سید فخر الدین صاحب	"	شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند

- ۴۔ مولانا سید محمد میاں صاحب ممبر مجلس شوریٰ مجلس عالم سکریٹری ٹرسٹ جمعیتہ علماء ہند
- ۵۔ مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب " " قائم مقام جمعیتہ علماء ہند دہلی
- ۶۔ مولانا محمد منظور صاحب نعمانی " " ایڈیٹر الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ
- ۷۔ مولانا قاضی زین العابدین صاحب " " استاذ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی
- ۸۔ مولانا سعید احمد صاحب " " ڈین فیکلٹی آف تصویب و جی، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
- ۹۔ مولانا مرغوب الرحمن صاحب رئیس " " محلہ قاضی پاڑہ، بجنور
- ۱۰۔ ڈاکٹر مصطفیٰ حسن صاحب علوی ممبر مجلس شوریٰ مولوی منزل، لکھنؤ
- ۱۱۔ مولانا ابوالحسن علی صاحب " " ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ
- ۱۲۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب " " محلہ پٹھانپورہ، مولانا اعظم گڑھ
- ۱۳۔ مولانا منت اللہ صاحب " " خانقاہ رحمانی، مونگیر
- ۱۴۔ مولانا عبدالصمد صاحب " " موضع ماڈر، وایا غنسی مونگیر
- ۱۵۔ مولانا مفتی محمود احمد صاحب " " مفتی اعظم ہونکٹ مدھیہ پردیش
- ۱۶۔ مولانا حامد الانصاری غازی صاحب " " ۲۷/۸ بیگ محمد علی روڈ بمبئی ۲
- ۱۷۔ مولانا محمد سعید صاحب " " بزرگ منزل سملک ضلع سورت
- ۱۸۔ مولانا سید حمید الدین صاحب " " شیخ الحدیث مدر عالیہ، کلکتہ
- ۱۹۔ مولانا عبد القادر صاحب " " محلہ سوپور مکان ۲۷/۸، ایگاد
- ۲۰۔ مولانا فضل اللہ صاحب " " عابد روڈ، حیدرآباد

دارالعلوم کے دستور اساسی کی نقل جس کے صحیح ہونے کی تصدیق مجلس شوریٰ کے سات ممبران نے کر دی ہے میں اس میمورنڈم کے ہمراہ منسلک کرتا ہوں ہم لوگوں

نے جن کے پتے ذیل میں درج ہیں ان مقاصد کے لئے جو میوزنڈم میں درج ہیں اپنے آپ کو متحد کر کے اس میوزنڈم میں درج کر دیئے ہیں اور آج سے ہم نے ایکٹ ۱۸۶۰ء کے تحت سوسائٹی قائم کر لی ہے۔

نمبر سلسلہ نام و پتہ دستخط

- ۱۔ مولانا الحاج قاری محمد طیب صاحب، مستم دارالعلوم دیوبند
- ۲۔ مولانا محمد ابراہیم صاحب، پرنسپل دارالعلوم دیوبند
- ۳۔ مولانا سید فخر الدین احمد صاحب، شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند
- ۴۔ مولانا سید محمد میاں صاحب، سکریٹری ٹرسٹ بورڈ جمعیت علماء ہند دہلی
- ۵۔ مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب، قائم مقام صدر جمعیت علماء ہند دہلی
- ۶۔ مولانا محمد منظور صاحب نعمانی، ایڈیٹر الفرقان لکھنؤ
- ۷۔ مولانا قاضی زین العابدین صاحب سجاد، استاذ جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ گزنی دہلی
- ۸۔ مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی ایم اے، ڈین فیکلٹی آف تھیولوجی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
- ۹۔ مولانا مرغوب الرحمن صاحب رئیس، محلہ قاضی پاڑہ بجنور۔

اس درخواست کے مطابق سوسائٹی ایکٹ کے تحت دارالعلوم دیوبند کا رجسٹریشن ہو گیا، اور بار بار اس کی تجدید کی جاتی رہی، لیکن ماضی قریب میں جب دارالعلوم کے نظم میں ابتری پیدا ہوئی تو ایک گروہ نے اسی رجسٹریشن کی بنیاد پر ان خلاف ضابطہ کارروائیوں سے ادارہ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی اور خداوند کریم کے فضل و کرم سے وہ ادارہ کی خصوصیات کو محفوظ رکھنے اور وراثت کے ناپسندیدہ

عمل سے ادارہ کو بچانے میں کامیاب ہوئے، لیکن دوسرے گروہ کی جانب سے رجسٹریشن کے خلاف شرع ہونے اور اس سے گریز کرنے کی باتیں سامنے آئیں۔

## رجسٹریشن پر کئے گئے اعتراضات کا جائزہ

رجسٹریشن کے خلاف ان لوگوں کا سب سے مضبوط استدلال یہ ہے کہ رجسٹریشن سے مدارس عربیہ کے وقف لٹھ ہونے کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ قانوناً منیجنگ کمیٹی (مجلس شوریٰ) کی ملک بن جاتا ہے، بلکہ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ادارہ کے حالات درست نہ رہنے کی صورت میں سوسائٹی کی ملکیت بھی ختم ہو جاتی ہے اور وہ گورنمنٹ کی ملکیت میں چلا جاتا ہے، جن دفعات کی بنیاد پر یہ بات کہی گئی ہے ان کا اردو ترجمہ یہ ہے۔

### سوسائٹی ایکٹ کی بعض دفعات کا ترجمہ

۵۔ ایسی املاک منقولہ وغیرہ منقولہ جو رجسٹرڈ سوسائٹی کی ملکیت ہیں، اگر پہلے سے ٹرسٹیان میں ودیعت نہیں کرتی وہ املاک عارضی طور پر اس سوسائٹی کی مجلس انتظامیہ میں ودیعت (ویسٹ) کریں گی، اور جملہ دیوانی و فوجداری کی کارروائیوں میں ان کو سوسائٹی کی گورننگ باڈی کی جائیداد بیان کیا جائیگا۔

۲۳۔ اگر رجسٹرار کو یہ اطلاع ملے کہ سوسائٹی کے حالات ٹھیک نہیں ہیں، اور ادارہ جس کو سوسائٹی چلا رہی ہے وہ بد نظمی کا شکار ہو جائے تو رجسٹرار خود یا اپنی طرف سے کسی بھی شخص کو مقرر کر سکتا ہے کہ وہ معائنہ کرے اور سوسائٹی کے حالات کی

تفتیش کرے، سوسائٹی کے ہر عہدے دار کا فرض ہوگا کہ سوسائٹی سے متعلق جملہ ریکارڈ جو اس کی تحویل میں ہے اور جملہ حسابات اس کے سامنے پیش کرے جس کی تفتیش اور معائنہ کے لئے وہ آیلہ ہے، رجسٹرار ایسی سوسائٹی کے عہدے دار یا ممبر یا ملازم کو سوسائٹی کے معاملات میں بھلف بیان لے سکتا ہے اور ایسے عہدہ دار ملازم و ممبر کا بیان لینے کے لئے حاضر ہونا رجسٹرار کے سامنے ضروری ہوگا، اور ایسا شخص جس نے تفتیش یا معائنہ سوسائٹی کا کیا تو اپنی تفتیش یا معائنہ مکمل ہو جانے کے بعد اس کی رپورٹ رجسٹرار کو پیش کرے گا، اس رپورٹ کے آنے کے بعد رجسٹرار کو یہ حق ہے کہ وہ سوسائٹی کی انتظامیہ کو یا کسی عہدے دار کو جیسا مناسب خیال کرے ہدایت دے کہ ایسے تمام نقائص کو سوسائٹی کے معاملات سے دور کریں بصورت قاصر رہنے افراد مذکورہ بالا کے رجسٹرار کو حق ہے کہ دفعہ ۱۲ (ڈی) اور دفعہ ۱۳ (بی) کے تحت کارروائی کرے یعنی رجسٹریشن کینسل کر دے یا کورٹ کو لکھ دے کہ یہ سوسائٹی کا عدم کی جائے اور اس صورت میں عدالت ہی یہ طے کرے گی کہ املاک کی ذمہ داری، حساب کتاب میباق کس طرح کیا جائے۔

ان دونوں دفعات کی بنیاد پر اس فریق کار رجسٹریشن پر یہ اعتراض ہے کہ پہلی دفعہ (یعنی دفعہ ۵) کی رو سے مدارس کی وقف املاک، رجسٹرڈ سوسائٹی کی ملکیت میں تبدیل ہو جاتی ہیں، کیونکہ اس دفعہ میں کہا گیا ہے کہ املاک منقولہ وغیرہ منقولہ کو جملہ دیوانی و فوجداری کارروائیوں میں گورنگ باڈی کی جائیداد بیان کیا جائے گا۔

اسی طرح دوسری دفعہ (یعنی دفعہ ۲۴) کی رو سے یہ اعتراض ہے کہ ان مدارس



کی املاک، گورنمنٹ کی تحویل میں چلی جائیں گی، کیونکہ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر سوسائٹی کے حالات درست نہ ہوئے تو عدالت طے کرے گی کہ املاک کی ذمہ داری اور حساب کتاب کس طرح بیباق کیا جائے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں دفعات کا یہ نتیجہ بالکل نہیں ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پہلی دفعہ میں اوقاف کو بالکل مستثنیٰ کر کے حکم لگایا گیا ہے، دفعہ کے الفاظ یہ ہیں کہ: "ایسی املاک منقولہ وغیرہ منقولہ جو رجسٹرڈ سوسائٹی کی ملکیت ہیں اگر پہلے سے ٹرسٹیان میں ودیعت نہیں کرتی وہ املاک عارضی طور سے اس سوسائٹی کی مجلس انتظامیہ میں ودیعت کریں گی۔"

اس میں یہ بات صاف ہے کہ جو املاک، ارکان سوسائٹی کی نہیں بلکہ سوسائٹی کی یعنی ادارہ کی ملکیت ہیں، اگر وہ پہلے سے ٹرسٹیان میں ودیعت نہیں کرتیں یعنی اگر وہ وقف نہیں ہیں تو ان املاک کو مقدمات میں گورننگ باڈی کی ملکیت بیان کیا جائیگا۔

گویا اس دفعہ کا اوقاف سے بالکل تعلق نہیں ہے، یہ دفعہ صرف ان املاک کے بارے میں ہے جو اوقاف کے علاوہ ادارہ کی ملکیت ہوں، رہا یہ کہ ادارہ کا وجود، ارکان سوسائٹی کے وجود سے الگ ہے یا ارکان ہی کو سوسائٹی کہا گیا ہے، تو اس کے لئے ایک مستقل دفعہ دی گئی ہے جس کا متن یہ ہے۔

(۲) ۱۹ سیکشن ۵۷ ایک رجسٹرڈ سوسائٹی خیراتی کام کی متولی ہو سکتی ہے اس قانون کے تحت جو سوسائٹی تشکیل پائے اس کی حیثیت ایک کارپوریشن کی ہے، یعنی اس کا اپنا ایک علیحدہ وجود ہوتا ہے علاوہ ارکان کے وجود کے۔

اس دفعہ میں ادارہ کا علیحدہ وجود تسلیم کیا گیا ہے، گویا ادارہ کی املاک، ادارہ ہی کی رہتی ہیں، ارکان ادارہ کی نہیں ہو جاتیں، اس حقیقت کو مزید ایک دفعہ میں منع کیا گیا ہے۔

(۵) منہ یہ حقیقت کہ وہ پراپرٹی جو سوسائٹی کی ہے ٹرسٹیوں (متولیوں) یا انتظامیہ کمیٹی (گورننگ باڈی) کے سپرد کی جاتی ہے، ٹرسٹیوں یا گورننگ باڈی کا اس پراپرٹی پر ذاتی مفاد نہیں بنتا اور ویسے وہ جائیداد سوسائٹی کی پراپرٹی تصور کی جانی چاہئے، قانون کے تحت، سوسائٹی کا نام، ارکان کے ناموں کے علاوہ علیحدہ وجود تصور کیا گیا ہے۔

اس دفعہ میں یہ بات بالکل صاف کر دی گئی ہے کہ ادارہ کا ایک الگ وجود ہے، اور اسکے ارکان بالکل الگ ہیں اس لئے اس گروہ نے جس دفعہ کا سہارا لے کر یہ اشکال پیش کیا ہے کہ رجسٹریشن سے اوقاف، ارکان کی ذاتی جائیداد بن جاتے ہیں صحیح نہیں ہے، کیونکہ اول تو اس دفعہ میں جن املاک کا تذکرہ ہے وہ املاک اوقاف کے علاوہ ہیں، دوسرے یہ کہ یہ املاک بھی ارکان کی نہیں ہو جائیں گی، ادارہ ہی کی رہیں گی، البتہ ان کو عارضی طور پر سوسائٹی کی مجلس انتظامیہ میں ودیعت کیا جائیگا، اور ان کو مقدمات میں گورننگ باڈی کی ملکیت بیان کیا جائیگا، اس کی مثال بالکل صحیح یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مسجد پر دعویٰ کرے تو وہ دعویٰ متولی پر کیا جاتا ہے اور اس مقدمہ میں جواب دہ متولی ہوتا ہے، اس کا مفہوم یہ نہیں ہوتا کہ متولی مسجد یا اس کی املاک کا مالک ہو گیا ہے دوسری دفعہ (یعنی دفعہ ۲۴) کی رو سے یہ اشکال ہے کہ ادارہ کی املاک

گورنمنٹ کی ملکیت بن جاتی ہے، کیونکہ اس میں عدالت کا یہ اختیار تسلیم کیا گیا ہے کہ اگر رجسٹرار کی مداخلت کے باوجود ادارہ کے حالات درست نہ ہوں تو وہ رجسٹریشن کو کنسل کر دیں گے اور اس صورت میں عدالت طے کرے گی کہ املاک کی ذمہ داری اور حسابات کے بیباق کرنے کی کیا صورت ہو۔

یہاں بھی یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ اولاً تو یہ ساری گفتگو، اوقاف کے علاوہ دیگر املاک کے بارے میں ہے، کیونکہ یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ رجسٹریشن کی رو سے جو املاک عارضی طور پر ادارہ کے بجائے ارکان ادارہ میں ودیعت کی گئی ہیں وہ اوقاف کے علاوہ ہیں۔

دوسرے کہ اگر ادارہ کے حالات درست نہیں ہوتے تو یہ اقدام کیا جائیگا کہ عدالت، املاک اور حسابات کے سلسلے میں فیصلہ کرے گی، یہ واضح نہیں کیا گیا کہ یہ فیصلہ یہی ہوگا کہ اس کو گورنمنٹ اپنی جائیداد بنالے گی، صرف یہ کہا گیا ہے کہ عدالت اس سلسلے میں فیصلے کی مجاز ہوگی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ عدالت کو ملکیت تبدیل کرنے کا اختیار ہی نہیں، جب یہ بات طے ہے کہ وہ املاک ادارہ کی ہیں تو وہ یقیناً ادارہ کی رہیں گی لیکن ان کے تحفظ یا جن رفاہی امور کے لئے ان کا تعین کیا گیا تھا ان کے لئے مفید بنانے کے سلسلے میں عدالت کو کارروائی کا حق ہوگا گویا یہ صرف انتظام کی تبدیلی ہے، ملکیت کی تبدیلی نہیں ہے بلکہ اس سلسلے میں یہ واضح رہنا چاہئے کہ انتظام کی تبدیلی شوری بھی کرتی ہے جیسے ضرورت پیش آنے پر مہتمم کو تبدیل کر دیا جاتا ہے وغیرہ، اس لئے انتظام کی تبدیلی سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وقف ختم ہو گیا اور حکومت کی ملک قائم ہو گئی وغیرہ، یہ سب غلط ہے

خلاصہ یہ ہوا کہ ان دونوں دفعات سے وہ اعتراض پیدا ہی نہیں ہوتا جو اس فریق نے رجسٹریشن کو خلاف شرع قرار دینے کے لئے بیان کیا ہے، بلکہ یہ وہ معنی ہیں جو ان دفعات کے الفاظ کے خلاف ہیں، چنانچہ مدرسہ مظاہر علوم کے رجسٹریشن کے بارے میں سہارنپور کے ۳۵ وکلاء کے بیان پر مشتمل ایک اشتہار شائع کیا گیا جس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ رجسٹریشن سے وقف کا تضاد نہیں ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں۔

مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے رجسٹریشن کے حق میں ۳۵ مسلم متنازع قانون دان اور نام وکلاء کا

## متفقہ بیان

مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کی مجلس شوریٰ اور اس کے دستور کے رجسٹریشن کو لے کر آج کل شہر و بیرون شہر میں کافی چرچے ہو رہے ہیں، اور اس بارے میں بہت کچھ غلط افواہیں پھیلائی جا رہی ہیں، ہم نے بحیثیت ایک مسلمان کے اپنا فرض سمجھتے ہوئے اس مسئلہ پر قانونی نقطہ نظر سے غور کیا پورے غور و خوض کے بعد ہم درج ذیل وکلاء اس نتیجہ پر پہنچے کہ مدرسہ مظاہر علوم کی مجلس شوریٰ اور اس کے دستور کا رجسٹریشن کسی بھی لحاظ سے مدرسہ کے لئے نقصان دہ نہیں ہے اور اس رجسٹریشن سے مدرسہ کی موقوفہ حیثیت ہرگز نہیں بدلتی اور مدرسہ اور اس کی املاک کی حیثیت بھی مجروح نہیں ہوتی مدرسہ مظاہر علوم اور اس کی املاک پھر بھی وقف رہیں گی، رجسٹریشن سے وقف ختم نہیں ہوتا رجسٹریشن مجلس شوریٰ اور اس کے دستور کا ہوا ہے

جناب مولوی انور علی صاحب ایڈوکیٹ کی رائے  
 میں نے مدرسہ مظاہر علوم کی سوسائٹی کے رجسٹریشن سے متعلق کاغذات  
 کا بغور مطالعہ کیا، مدرسہ کی وقف جائیدادوں کے متعلق وقف رجسٹر کا بھی  
 معائنہ کیا اور میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مدرسہ مظاہر علوم سوسائٹی کا ایکٹ  
 ۱۸۶۰ء کے تحت رجسٹریشن مسلم مفاد عامہ میں ہے، جو جائیدادیں مقاصد  
 مدرسہ کیلئے وقف ہیں ان کی ملکیت ارکان شوریٰ میں ودیعت (VEST)  
 نہیں کرتی بلکہ مجلس شوریٰ انتظام مدرسہ و جائیداد ہائے موقوفہ متعلقہ مدرسہ  
 مذکور کے انتظام کی حق ودیعت (VESTING) کلیم کرتی ہے اور جائیداد ہائے  
 موقوفہ کی ملکیت بدستور خداوند تعالیٰ کی رہتی ہے، مظاہر علوم کے اس رجسٹریشن  
 سے وقف کی حیثیت کا انہدام نہیں ہے، اور مدرسہ کے لئے ضرر رساں  
 نہیں ہے۔  
 انور علی ایڈوکیٹ، ۵ جنوری ۱۹۸۶ء

جناب مولوی محمد حسن صاحب ایڈوکیٹ کی رائے  
 میں انور علی صاحب ایڈوکیٹ کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں  
 محمد حسن ایڈوکیٹ

جناب مولوی نثار احمد صاحب ایڈوکیٹ کی رائے  
 جس طرز سے مدرسہ مظاہر علوم کا رجسٹریشن ہوا ہے اس سے موقوفہ  
 جائیداد پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے اور جائیداد موقوفہ کی نوعیت تبدیل نہیں ہوتی  
 نثار احمد ایڈوکیٹ

(المشتہدین :- انور علی ایڈوکیٹ - عزیز حسن ایڈوکیٹ)

داؤد احمد ایڈوکیٹ محمد طارق ایڈوکیٹ محمد قاسم ایڈوکیٹ  
 معین الدین حسین احمد عادل حسین زیدی محمد حسن  
 واجد علی خاں افضال احمد راؤ مختار علی خاں احسن عظیم  
 اسلوب احمد انوار احمد صدیقی خورشید احمد خاں محمد انوار انصاری تاباں  
 اقبال احمد خورشید احمد قریشی رضوان عظیم ظہیر انصاری  
 جی خان وسیم احمد رکن الدین ناصر حسن  
 معراج الحق کاظمی حافظ محمد فاضل اختر حسین زیدی فصیح الزماں  
 اکبر علی ارشد حسن زیدی طارق مرزا محمد فاروق محمد انور  
 ۳۵ مسلم وکلاء کے اس بیان میں واضح طور پر یہ اعتراف ہے کہ ایکٹ ۱۹۶۰ء  
 کے تحت رجسٹریشن، وقف جائیدادوں کی حیثیت پر بالکل اثر انداز  
 نہیں ہے، اور وجہ یہی ہے کہ جس دفعہ کی رو سے یہ اشکال کیا گیا ہے اس دفعہ  
 میں وقف، بلکہ اس سے بھی عام لفظ ٹرسٹ کو مستثنیٰ کر کے دیگر جائیدادوں  
 کے بارے میں بیان کیا گیا ہے، اس لئے مدارس کے اوقاف سے اس دفعہ کا  
 تعلق ہی نہیں ہے۔

رہا اوقاف کا معاملہ تو ان کے تحفظ کے لئے گورنمنٹ نے مستقل نظام  
 کیا ہے، مسلم وقف بورڈ کا قیام۔ اوقاف کے تحفظ اور ان کی نگرانی ہی کے  
 لئے عمل میں آیا ہے، مسلمانوں کے جتنے بھی اوقاف ہیں ان سب کا تعلق مسلم  
 وقف بورڈ سے ہے، دارالعلوم یا دیگر مدارس کے نام جتنی جائیدادیں وقف  
 ہیں ان سب کا تعلق مسلم وقف بورڈ ہی سے ہے، ان اوقاف کا جملہ بندوبست



واقفین کی تصریح کے مطابق کیا جاتا ہے، ان کی تولیت آمدنی اور مصارف کے سلسلے میں واقف کی شرائط کی مکمل پاسداری کی جاتی ہے، البتہ وقف کے علاوہ جو جائیدادیں مدرسہ کی ملکیت ہوتی ہیں ان کا انتظام سوسائٹی کے تحت، دستور اساسی کے مطابق کیا جاتا ہے

## وقف اور دیگر املاک

یہاں اس حقیقت کا منفع کر دینا نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مدارس عربیہ کی تمام جائیدادوں اور املاک کی نوعیت کیا ہے؟ حضرات فقہاء کرام ہر جائیداد کو وقف نہیں کہتے بلکہ وقف جائیداد کی ایک خاص نوع اور فقہ کی مخصوص اصطلاح ہے، اس کی مستقل تعریف، شرائط، الفاظ اور احکام ہیں، فقہاء کرام نے ان تمام چیزوں کی امکان انسانی کی حد تک اس طرح تفصیل کر دی ہے کہ ہر جزئیہ منفع ہو گیا ہے۔

اگر کسی جائیداد پر وقف کی تعریف صادق نہ آئے یا وہاں وقف کے شرائط نہ پائے جائیں تو اس کو اصطلاحی طور پر وقف نہیں کہا جائیگا یہ الگ بات ہے کہ وہاں شخصی ملکیت بھی مستحق نہ ہو، بلکہ ادارہ کی ملکیت یا عوامی ملکیت کے سبب اس کا انتظام و انصرام بھی وقف کی طرح کیا جائے، گویا کسی جائیداد کے وقف نہ ہونے سے اس کا ذاتی ملکیت ہونا لازم نہیں آتا۔

# وقف کی تعریف

وقف ثلاثی کا مصدر ہے اور اسکے لغوی معنی ہیں روکنا، بازداشت،

اصطلاحی تعریف میں امام اعظم ابو حنیفہؒ اور صاحبین یعنی امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نقطہ نظر میں فرق ہے، اس کی تشریح کے لئے ہدایہ کی عبارت پیش ہے

هو وقف الشرع عند ابي حنيفة

حبس العين على ملك

الواقف والتصدق

بالمنفعة بمنزلة العارية

وعند صاحب العين

على حكر ملك الله

تعالى فيزول ملك

الواقف عنه الى الله تعالى

على وجه تعود منفعة

الى العباد فيلزم ولا يباع

ولا يوهب ولا يورث

واللفظ ينتظمها -

شرعیت میں امام ابو حنیفہ کے نزدیک

کسی شئی کی ذات کو، واقف کی ملکیت

میں محبوس کر دینا اور اسکے نفع کو عاریتاً

کے طور پر تصدق کر دینا وقف کہلاتا

ہے، اور صاحبین کے نزدیک کسی شئی

کی ذات کو اللہ کی ملکیت کے حکم میں

روک رکھنا وقف ہے چنانچہ صاحبین

کے نزدیک اس شئی سے واقف کی

ملکیت ختم ہو جاتی ہے اور اللہ کی

ملکیت اس طرح قائم ہو جاتی ہے کہ

اسکے منافع بندوں کو حاصل ہوتے

ہیں، وہ وقف لازم ہو جاتا ہے اس

کو فروخت نہیں کیا جاسکتا، یہ نہیں

کیا جاسکتا اس کو وراثت میں تقسیم

نہیں کیا جاسکتا اور لفظ وقف امام  
صاحب اور صاحبین دونوں ہی کی تعریف کو  
شامل ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ امام صاحب کے یہاں کسی مخصوص چیز کو مالک کی ملکیت میں  
روک کر اس کے منافع کو واقف کی غشاء کے مطابق نیک کاموں کے لئے  
مخصوص کر دینا وقف کہلاتا ہے، امام صاحب کے نقطہ نظر کی تعبیر یہ ہے کہ  
مالک کے تصرفات کی حد بندی کر دی جائے کہ ملکیت تو اگرچہ اصل مالک ہی  
کی قائم رہے گی لیکن حقوق تصرف میں حد بندی کر دی جاتی ہے کہ فلاں کام  
کر سکتے ہو، اور فلاں کام نہیں کر سکتے، جب کہ امام ابو یوسف اور امام محمد کے  
یہاں ہشی موقوفہ سے مالک کی ملکیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ معنوی طور پر خدا  
کی ملکیت میں اس طرح آ جاتی ہے کہ اس کے منافع سے مخلوق جائز طور پر مستفید  
ہوتی رہے۔

## وقف میں مالک کی ملکیت کے ازالہ کی شرطیں

یہاں یہ تفصیل بھی ضروری ہے کہ امام صاحب کے نزدیک بھی مالک کی  
ملکیت کا بقا ہر حال میں ضروری نہیں بلکہ اگر وقف کے ساتھ حاکم کا فیصلہ بھی  
شامل ہو جائے کہ مالک کی ملکیت ختم کر دی گئی ہے تو وہ ختم ہو جائے گی،  
یعنی مالک کی ملکیت کا بقا تسبیل اور رجسٹریشن سے پہلے ہے، اگر حاکم کا  
حکم شامل ہو جائے گا تو مالک کی ملکیت ختم ہو جائے گی جبکہ امام ابو یوسف

کے یہاں صرف وقف کر دینے سے ملک کی ملکیت ختم ہو جاتی ہے اور امام محمد کے یہاں وقف کرنے کے بعد متولی یا مستحقین کو سپرد کر دینا ازالہ ملک کی ضروری شرط ہے، ہدایہ میں ہے۔

امام ابو حنیفہ نے فرمایا کہ واقف کی ملکیت وقف سے زائل نہیں ہوتی مگر یہ کوئی حاکم اس کا حکم دیدے یا واقف اس کو اپنی موت پر معلق کر دے اور یہ کہے کہ جب میں مرجاؤں تو میں نے اپنا گھر اس کے لئے وقف کیا اور امام ابو یوسف نے فرمایا کہ واقف کی ملکیت وقف پر دلالت کرنے والا کلمہ کہتے ہی ختم ہو جاتی ہے اور امام محمد نے فرمایا کہ واقف کی ملکیت (قول سے) زائل نہیں ہوتی یہاں تک کہ وقف کے لئے متولی مقرر کرے اور جائیداد اس کے سپرد کر دے۔

قال ابو حنیفۃ لا یزول ملک الواقف عن الوقف الا ان یحکوبہ حاکم او یعلق بموتہ فیقول اذامت فقد وقفت داری علی کذا و قال ابو یوسف " یرذل ملکہ بمجرد القول و قال محمد لا یرذل حتی یجعل للوقف ولہا ویسلمہ الیہ۔

(ہدایہ ۶۱۴/۲)

علامہ ابن ہمام نے ہدایہ کی اس عبارت کی شرح ان الفاظ میں کی ہے

امام ابو حنیفہ نے فرمایا کہ واقف کی ملکیت وقف سے زائل نہیں ہوتی

قال ابو حنیفۃ رحمہ اللہ لا یرذل ملک الواقف

عن الوقف الا ان يحكم  
به حاكم اى بخروجہ عن  
ملكه او يعلقه اى يعلق  
الوقف بموت فيقول  
اذا مت فقد وقف  
دارى على كذا وقال  
ابو يوسف يزول بمجرد  
القول الذى قد منا  
صحة الوقف به وقال  
محمد لا يزول حتى  
يجعل للوقف متوليا  
ويسلم اليه بعد  
ذلك القول وبه اخذ  
مشايخ بخارى -

(فتح القدیر ج ۳ ص ۳۱۹)

مگر یہ کہ کوئی حاکم اس کا حکم (یعنی ملک  
کی ملکیت سے خارج کرنے کا حکم) دیدے  
یا وقف کو واقف اپنی موت پر معلق  
کر دے کہ میں مر جاؤں تو میرا مکان اس  
پر وقف ہے اور امام ابو یوسف نے  
فرمایا کہ واقف کی ملکیت محض قول سے  
ختم ہو جائے گی، یعنی وہ اقوال جن  
کے ذریعہ وقف کا صحیح ہونا بیان کیا  
جا چکا ہے اور امام محمد نے فرمایا کہ واقف  
کی ملکیت اس وقت تک زائل نہ ہوگی  
جب تک کہ وہ وقف کیلئے متولی مقرر  
کر کے شئی موقوف کو اسکے سپرد نہ کر دے  
یعنی وقف کے الفاظ کے ذریعہ وقف کرنے  
کے بعد سپرد نہ کرے، امام محمد کے مسلک  
کو مشایخ بخاری نے اختیار کیا ہے۔

معلوم ہوا کہ امام صاحب کے یہاں واقف کی ملکیت کی بقاء حکم حاکم سر  
پہلے تک ہے، اگر حاکم ازالہ ملکیت کا حکم دیدے تو واقف کی ملکیت ختم ہو جاتی  
ہے، البتہ امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک ازالہ ملک کے لئے حکم حاکم  
کی ضرورت نہیں، امام ابو یوسف کے یہاں جن کلمات سے وقف صحیح ہو جاتا ہے

ان کے ذریعہ وقف کرنے کے بعد ملک کی ملکیت کے ازالہ کے لئے کوئی شرط نہیں، اور امام محمد کے یہاں ان کلمات کے ذریعہ وقف کرنے کے بعد ازالہ ملک کے لئے یہ شرط ہے کہ وقف کا متولی مقرر کر کے شئی موقوف کو اس کی تحویل میں دیدیا جائے۔

یہ واضح رہے کہ امام محمد کے یہاں صرف متولی کے سپرد کر دینے کا عمل وقف نہیں ہے بلکہ سپرد کر دینا تکمیل وقف کی ضروری شرط ہے، وقف کی اصل حقیقت الفاظ وقف ہی سے متحقق ہوتی ہے، صاحب فتح القدیر نے امام محمد کے منسلک کی وضاحت میں "بعد ذلک القول" کا اضافہ اسی لئے فرمایا ہے کہ محض عمل کو وقف قرار دینا درست نہیں ہے۔

## وقف کی شرائط

وقف چونکہ اصل چیز کو باقی رکھتے ہوئے صرف منافع سے استفادہ کی راہ قائم کرنے کا عمل ہے اور شرعاً یہ خصوصی تصرف ہے اس لئے فقہاء کرام نے اسکی شرائط کو تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، یہ شرطیں فقہ کی متداول کتابوں میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں، فتح القدیر  $\frac{۴۸}{۱۰۰}$  اور البحر الرائق  $\frac{۱۹}{۱۰۰}$  میں گیارہ شرطیں ذکر کی گئی ہیں، یہاں فتاویٰ عالمگیری سے ان شرائط کو نقل کیا جا رہا ہے۔

اما شرائطہ فمنہا العقل  
والبلوغ ومنہا الحرۃ  
بہا وقف کی شرائط کا بیان تو ان  
شرطوں میں سے واقف کا عاقل



واما الاسلام فليس  
بشرط. ومنها ان يكون  
قربة في ذاته  
ومنها الملك وقت الوقف  
حتى لو غصب ارضا  
فوقفها شر اشتراها  
من مال كها و دفع  
الثلث اليه او صالح  
على ما دفع اليه  
لا يكون وقفاً كذا  
في البحر الرائق. رجل  
وقف ارضا لرجل آخر  
في برسماء ثم ملك  
الارض لمويجن. و  
ان اجاز المالك  
جاء عندنا  
كذا في فتاوى قاضي  
خان. ولو اشترى ان  
البائع بالخيار فيها

اور بائع ہونا ہے، آزاد ہونا ہے، البتہ  
اسلام صحت وقف کی شرط نہیں ہے  
اور انہی شرائط میں سے یہ ہے کہ جس  
کام کے لئے وقف کیا گیا ہے وہ بذات  
خود ثواب کا کام ہو، اور انہی شرائط  
میں سے یہ ہے کہ واقف وقف کے  
وقت اس چیز کا مالک ہو، یہاں تک کہ  
اگر کسی شخص نے کسی زمین کو غصب کر کے  
وقف کر دیا پھر اس کو مالک سے خرید  
لیا اور قیمت ادا کر دی یا جو مالک کو دیا  
تھا اس پر صلح کر لی تو یہ زمین وقف نہیں  
ہوگی (البحر الرائق) کسی شخص نے کسی  
دوسرے کی زمین کسی معین کام کے لئے  
وقف کر دی پھر واقف اس زمین کا  
مالک ہو گیا تو یہ جائز نہیں ہاں اگر  
مالک ہی نے اجازت دیدی تو درست  
ہے (فتاویٰ قاضی خان) اور اگر اس شرط  
پر زمین خریدی کہ بائع کو اختیار بیع حاصل  
رہے گا اسی دوران مشتری نے اس

فوقفها شراجا ان البائع  
 لم يحن الوقت كذا في  
 البحر الرائق ولو وقف  
 الموهوب له الارض قبل  
 قبضها لا يصح الوقف  
 كذا في فتح القدير  
 وينفرد على اشتراط  
 الملك انه لا يجوز وقف  
 الاقطاعات الا اذا  
 كانت الارض مواتا او  
 كانت ملكا للامام فاقطعها  
 الامام رجلا وان  
 لا يجوز وقف ارض الحوز  
 للامام لانه ليس بمالك  
 لها وتفسير ارض الحوز  
 ارض عجز صاحبها عن  
 زراعتها واداء خراجها  
 فندفعها الى الامام ليكون  
 منافعها جبر اللخراج

کو وقف کر دیا پھر بائع نے اجازت دے  
 دی تو وقف جائز نہیں (البحر الرائق) اور  
 اگر کسی شخص کو کوئی زمین ہبہ کی گئی اس  
 شخص نے قبضہ کرنے سے پہلے اس کو  
 وقف کر دیا پھر اس پر قبضہ کیا وقف صحیح  
 نہ ہوگا (فتح القدير)

ملکیت کی اسی شرط پر یہ مسئلہ بھی متفرع  
 ہے کہ سلاطین کی جانب سے جاگیروں  
 کا وقف کرنا بھی جائز نہیں الا یہ کہ زمین  
 غیر آباد اور ویران پڑی ہو یا خود امام  
 کی ملکیت ہو اور امام یہ زمین کسی کے  
 نام کر دے، اسی طرح امام کیلئے حوز  
 کی زمینوں کا وقف کرنا بھی جائز نہیں  
 کیونکہ وہ ان کا مالک نہیں ہے ارض  
 حوز کا مطلب یہ ہے کہ زمین کا مالک  
 زمین میں کاشت قائم رکھنے اور  
 خراج ادا کرنے سے عاجز ہو جائے  
 اور وہ زمین امام کے سپرد کر دے تاکہ  
 زمین کی آمدنی سے خراج کا تدارک

کذا فی البحر الرائق -

وکذا عدم جواز وقف

المرتد زمن رده ان

قتل علی ذلک او مات

لان ملکہ یزول بجاز والّا

موقوفاً، کذا فی النہر

الفائق -

ومنها ان لا یكون

محجوراً علیہ لفساد

دین ومنها عدم

الجهالة فلو وقف من

ارضه شیئاً ولو یسمی

کان باطلاً ومنها

ان یكون منجزاً

غیر معلق ومنها ان لا

یذکر معہ اشتراط

بیعہ وصرف الثمن الی

حاجتہ فان قالہ لـ

یصح الوقف فی المختار -

کیا جائے (البحر الرائق)

اسی ملکیت کی شرط پر یہ مسئلہ متفرع ہے

کہ مرتد کے لئے زمانہ ارتداد میں وقف کرنا

جائز نہیں اگر وہ اسی ارتداد کے سبب

قتل کیا گیا ہو یا اسی دوران مر گیا ہو،

کیونکہ اس زمانہ ارتداد میں اس کی ملکیت

موقوف کر دی جاتی ہے (النہر الفائق)

وقف کی شرائط میں سے یہ بھی ہے کہ

واقف پر کم عقلی یا مقروض ہونے کے

سبب پابندی مائدہ کی لگی ہو، انہی

شرائط میں مجہول نہ ہونا ہے چنانچہ اگر

کسی نے اپنی زمین کا غیر معین حصہ

وقف کر دیا تو باطل ہے۔ انہی شرائط میں

سے یہ ہے کہ وقف نافذ اور غیر معلق ہو

انہی شرائط میں سے یہ ہے کہ وقف کے

ساتھ واقف نے اس کو بیچنے اور اسکی

قیمت کو اپنے اوپر صرف کرنے کی شرط

نہ لگائی ہو، اگر اس نے ایسا کہا ہے تو وقف

قول مختار پر صحیح نہیں ہے۔

ومنها التابيد وهو  
 شرط على قول الكل  
 ولكن ذكره ليس  
 بشرط عند ابى يوسف  
 وهو الصحيح ومنها  
 ان يجعل الاجرة  
 لجهة لا تنقطع ابدا  
 عند ابى حنيفة ومحمد  
 وان لو يذكركم ذلك لم  
 يصح عندهما وعند  
 ابى يوسف ذكره هذا  
 ليس بشرط بل يصح  
 (فتاوى مالگیری منہجہ ۹۶ ج ۱)

اور انہی شرائط میں سے یہ ہے کہ وقف  
 ہمیشہ کے لئے ہو اور یہ تمام ائمہ کے  
 یہاں شرط ہے لیکن اس کا مذکور ہونا  
 امام ابو یوسف کے یہاں ضروری نہیں  
 اور یہی صحیح ہے اور انہی شرائط میں  
 سے یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ اور امام محمد  
 کے یہاں آمدنی کو ایسے کام کے لئے  
 مقرر کیا گیا ہو جو کبھی ختم ہونے والی  
 نہ ہو اگر یہ بات مذکور نہ ہو تو ان دونوں  
 کے نزدیک وقف صحیح نہیں ہے اور  
 امام ابو یوسف کے یہاں اس شرط  
 کا ذکر کرنا ضروری نہیں ہے، اس کے  
 بغیر بھی صحیح ہے۔

وقف کے تحقق کی یہ شرطیں شئی موقوفہ، واقف اور موقوف علیہم تینوں  
 ہی سے متعلق ہیں، اور ان شرطوں کے پائے جانے کی صورت میں وقف کی  
 حقیقت کا تحقق نہ ہونا تمام ہی فقہاء کے نزدیک تسلیم شدہ ہے، ان شرائط میں  
 سے وقف کے وقت، واقف کی ملکیت کو فقہاء کرام کے یہاں اتنی اہمیت دی  
 گئی ہے کہ اگر وقف کے وقت ملکیت میں کوئی بھی کمی ہے تو وہ اس وقف کو  
 درست قرار نہیں دیتے، اس شرط پر متعدد جزئیات متفرع کرتے ہوئے یہ بات

واضح کی گئی ہے کہ اگر زمین غصب کر کے وقف کر دی تو اگر بعد میں واقف کو صحیح طور پر ملکیت حاصل بھی ہو جائے تو وقف صحیح نہیں ہے، حدیہ ہے کہ اگر زمین بخیار شرط کے ساتھ خریدی گئی تھی اور بخیار بائع کو حاصل تھا تو مشتری کا وقف کرنا صحیح نہیں ہے خواہ بائع نے بعد میں بخیار ختم کر کے بیع کو تمام کر دیا ہو یا اگر کسی کو زمین ہبہ میں ملی لیکن اس نے قبضہ کرنے سے پہلے اس کو وقف کر دیا تو وقف صحیح نہیں ہے، اسی شرط پر یہ بھی متفرع ہے کہ سلاطین جن زمینوں کے مالک نہیں ہیں اگر وہ ان زمینوں کو وقف کرتے ہیں تو وقف درست نہیں ہے، مرتد اگر زمانہ ارتداد میں وقف کرتا ہے تو چونکہ اس زمانہ میں اس کی ملکیت کو موقوف کر دیا جاتا ہے اس لئے وقف درست نہیں، وغیرہ۔

## وقف کے الفاظ

اس کے ساتھ یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ تمام ہی فقہاء کرام نے وقف کے باب میں اس بحث کو بھی بہت اہمیت دی ہے کہ وقف شرعی کے تحقق کے لئے کن الفاظ کی ضرورت ہے اور کن الفاظ سے وقف کی حقیقت متحقق نہیں ہوتی، فتح القدیر میں ہے۔

واما ركنه فلا لفاظ الخاصة	رہا وقف کے رکن کا بیان تو وہ خاص
حان يقول ارضي هذه	الفاظ میں مثلاً یہ کہے کہ میری یہ زمین
صدقة موقوفة موبدة	ابدی طور پر مساکین کے لئے صدقہ
على المساكين ولا خلاف في	موقوفہ ہے اور وقف کے شرائط

ثبوتہ بهذا اللفظ      وقف پائے جانے کی صورت میں ان  
بعد شرطہ ولا باس      الفاظ کے ذریعہ ثابت ہونے میں کوئی  
ان نسوق شیئا من الالفاظ      اختلاف نہیں ہے اور مضائقہ نہیں  
(فتح القدیر ج ۱ ص ۱۲۱)

اس کے بعد علامہ ابن ہمام نے چند الفاظ اور ان کے احکام بیان فرمائے ہیں  
کہ ان الفاظ سے وقف ثابت ہو جائیگا اور ان الفاظ سے ثابت نہ ہوگا، اس طرح  
علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ نے البحر الرائق میں استقراء کر کے ان الفاظ کے استیعاب  
کی کوشش کی ہے۔ لکھتے ہیں۔

واما رکنہ، فالالفاظ الخاصة      رہا وقف کا رکن، تو وہ خصوصی الفاظ  
الدالة علیہ وہی ستة      ہیں جو وقف پر دلالت کریں اور چھ ہیں  
وعشرون لفظا، الاول ارضی      الفاظ ہیں، جن میں پہلا لفظ یہ ہے کہ  
هذه صدقة موقوفة      میری یہ زمین ابدی طور پر مساکین کے  
موبدة علی المساکین ولا      لئے صدقہ موقوفہ ہے اور اس میں کوئی  
خلاف فیہ الا (البحر الرائق ص ۱۱۹)      اختلاف نہیں۔

پھر علامہ ابن نجیم نے یہ چھ بیس کلمات تفصیل کے ساتھ شمار کئے ہیں، جن  
میں سے بعض کلمات میں وقف کی مراحت ہے، بعض کلمات میں وقف کی  
مراحت نہیں لیکن وہ معنی وقف پر دلالت کرتے ہیں، ان کلمات میں سے بعض  
کے بارے میں انھوں نے فقہاء کا اختلاف بھی نقل کیا ہے، ان میں سے بعض  
کلمات ایسے بھی ہیں جن سے وقف کی تہمیت ہونے والے کی نیت کی وضاحت



پر موقوف ہے اور ضمن میں ایسے کلمات بھی ذکر کئے گئے ہیں جن سے وقف صحیح نہیں ہوتا، اس بحث کو فتاویٰ عالمگیری میں پوری ایک فصل میں بیان کیا گیا ہے

فصل۔ فی اللفاظ التي ينو

بها الوقف وما لا يتو بها

فصل۔ ان الفاظ کے بیان میں جن سے وقف تمام ہو جاتا ہے، اور وہ

افتاویٰ عالمگیری میں

اس فصل میں فتاویٰ عالمگیری کے طرز کے مطابق متقدمین و متاخرین

کی کتابوں کے حوالے سے وہ الفاظ یا تعیرات جمع کی گئی ہیں جن سے وقف کا تمام

ہونا یا نہ تمام ہونا معلوم ہوتا ہے، یہ الفاظ اگرچہ تعداد میں البحر الرائق کے چھبیس

کلمات سے کچھ زائد ہو گئے ہیں لیکن حقیقت کے لحاظ سے یہ تعیر کا تنوع ہے،

یہاں طوالت کے خوف ان تمام کلمات کو نقل نہیں کیا جا رہا ہے، لیکن ان حوالوں کے

اجمالی طور پر یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ وقف کی تمامیت کے لئے مقررہ کلمات

یا ان کے ہم معنی تعیر کا ہونا ضروری ہے۔

یہ بات کہ وقف کے لئے، وقف پر دلالت کرنے والے الفاظ بھی ضروری

ہیں الاشباہ والنظائر میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے، علامہ ابن نجیم نے

پہلے ایک اصول بیان کیا ہے کہ لا یشترط مع نية القلب التلفظ في جميع

العبادات یعنی عبادات میں قلب کی نیت کے بعد تلفظ کی ضرورت نہیں ہے

پھر اس کے بعد صراحت فرمائی ہے۔

وخرج عن هذا الاصل

مسائل منها النذر لا تكفي

اس قاعدہ کلیہ سے چند مسائل

مستثنیٰ ہیں ان میں سے ایک

فی ایجابہ النیۃ بل لا بد  
من التلفظ بہ صرحوا بہ  
فی باب الاعتکاف، ومنها  
الوقف ولو مسجدًا لا بد  
من اللفظ الدال علیہ  
(الاشباہ والنظائر صفحہ ۴۸)

نذر ہے کہ اسکے وجوب کیلئے نیت  
کافی نہیں بلکہ نذر کا تلفظ بھی ضروری  
ہے، فقہاء نے باب الاعتکاف میں  
اس کی تصریح کی ہے، اور ان ہی  
مستثنیات میں سے وقف بھی  
ہے خواہ مسجد ہی ہو کہ اس کے لئے  
دلالت کرنے والے الفاظ کا ہونا ضروری ہے

علامہ ابن نجیم ایک دوسرے موقع پر وقف کے ایک جزئیہ کی تشریح  
کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ان المقاصد اذ الویدل  
علیہ اللفظ لا یعتبر -  
(الاشباہ والنظائر صفحہ ۳۱)

کہ وقف کے بارے میں اصول یہ ہے  
کہ اگر مقاصد پر الفاظ دلالت نہ کرتے  
ہوں تو ان کا اعتبار نہیں کیا جائیگا۔

ان تصریحات سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ وقف کے تحقق کے لئے  
الفاظ ضروری ہیں، بلکہ فقہاء  
بھی شمار کئے ہیں جن سے بظاہر وقف کے ثبوت کا شبہ پیدا ہو جاتا ہے  
لیکن متقدمین و متاخرین سب کا اتفاق ہے کہ اس کلمہ سے وقف کا تحقق  
نہیں ہوتا، مثلاً مبسوط سرخسی میں ہے۔

ثو لا خلاف انہ لو  
قال تصدقت بامرہنی

اس سلسلے میں کوئی اختلاف نہیں  
ہے کہ اگر کسی نے یہ کہا کہ میں نے اپنی

هذه على الفقراء والمساكين  
انه لا يكون وقفاً  
بل يكون ذلك نذراً  
بالصدقة اذا قصد  
به الالتزام فان عين  
انسانا فهو تصدق عليه  
بطريق التملك ولا يتو  
الاب التسلیم۔

(مبوط سرخسی ص ۱۱۲)

اس طرح کے کلمات کے بارے میں فتح القدیر میں ہے ۔

ارضی هذه صدقة او  
قال تصدقت بارضی هذه  
على المساكين لا تكون  
وقفاً بل نذراً يجب  
التصدق بعينها او بقيمتها  
فان فعل خرج عن  
عهدة النذر والاورثت  
عنه لمن عليه  
زكاة او كفارة فمات

میری یہ زمین صدقہ ہے یا یہ کہا کہ میں  
نے اپنی اس زمین کو مساکین پر صدقہ  
کیا تو یہ وقف نہ ہوگا بلکہ اس کو نذر  
قرار دیا جائے گا اور اس زمین کو یا  
(بیچ کر) اس کی قیمت کو صدقہ کرنا  
ضروری ہوگا، اگر ایسا کر لیا تو نذر پوری  
ہو جائے گی ورنہ (ترک نذر کا گناہ ہوگا  
اور وہ زمین اس کی مملوک سمجھی جائیگی)  
اسکی وراثت میں وہ زمین (منکے بعد)

بلا ایصاء تورث

عنه۔

(فتح القدیر ص ۴۱۸)

اس طرح کے کلمات کے بارے میں فتاویٰ مالگیری میں ہے۔

وفي الفتاوى رجل قال

ارضى هذه صدقة كان

نذرا بالتصدق حتى لو

تصدق بعينها او بقيمتها

على الفقراء جائز كذا في

الخلاصة، و لو قال تصدقت

بارضى هذه على المساكين

لا يكون وقفا بل نذرا

يجب التصديق بعينها او

بقيمتها فان فعل خرج

عن عهدة النذر والا

ورثت عنه كذا في

فتح القدیر ولا يجزى

القاضى على الصدقة

لان هذا بمنزلة النذر

شال ہوگی جیسے وہ شخص جس پر زکوٰۃ

یا کفارہ واجب ہو اور وہ وصیت کے

بغیر مر جائے تو مال وراثت میں تقسیم کیا جائے گا

فتاویٰ میں یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے

یہ کہا کہ میری یہ زمین صدقہ ہے تو یہ صدقہ

دینے کی نذر ہے حتیٰ کہ اگر اس نے اس

زمین کو یا بچکر اس کی قیمت کو فقراء

پر صدقہ کر دیا تو جائز ہے (کذا فی الخلاصہ)

اور اگر اس نے یہ کہا کہ میں نے اپنی یہ

زمین مساکین پر صدقہ کی تو زمین وقف

نہیں ہوگی بلکہ اس کو نذر قرار دیا جائیگا

اور خود اس زمین کو یا اس کی قیمت کو

صدقہ میں دینا واجب ہوگا، پھر اگر کہنے

والے نے صدقہ کر دیا تو نذر کی ذمہ داری

پوری ہو جائیگی ورنہ وہ زمین کہنے والے

کے مرنے کے بعد وراثت میں شامل ہوگی

(کذا فی فتح القدیر) اور قاضی اس کو صدقہ

کرنے پر مجبور نہیں کریگا اس لئے کہ یہ نذر کے

کذا فی فتاویٰ قاضی خان  
ولو قال ارضی هذه  
صدقة علی وجوه الخیر  
والبر لو یکن ذلک وقفا  
بل نذرا، کذا فی الظہیریہ (مالگیری ص ۹۳)  
(کذا فی الظہیریہ)

درجہ میں ہے (کذا فی فتاویٰ قاضی خان)  
اور اگر یہ کہا کہ میری یہ زمین خیر اور  
نیک کے کاموں کیلئے صدقہ ہے تو بھی  
وقف نہ ہوگا بلکہ نذر قرار دیا جائے گا،  
ان حوالوں کا حاصل یہ ہوا کہ زمین یا جائیداد کو محض نیک کاموں کیلئے  
دیدنا وقف نہیں ہے، بلکہ وقف قرار دینے کے لئے خصوصی الفاظ اور متعدد  
شرائط میں اور ان کے نہ ہونے کی صورت میں وقف کی حقیقت متحقق نہیں  
ہوتی، فقہاء کرام نے فتاویٰ کی کتابوں میں ایسے ہزاروں جزئیات قلم بند کئے  
ہیں کہ شرائط متحقق نہ ہونے کی وجہ سے وقف تمام نہیں ہوتا، مثلاً فتاویٰ مالگیری  
ہی میں امام خفاف کی طرف منسوب کرتے ہوئے یہ جزیئہ لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص  
اپنے بڑے گھر میں سے کوئی کوٹھری وقف کر دے لیکن اس کا راستہ وقف  
نہ کرے تو وقف کرنا درست نہیں ہے۔

ذكر الخفاف في وقفه  
اذا وقف بيتا من داس  
فان وقفه بطريقه جائز  
الموقف وان لم يقفه بطريقه  
لو يجرنا لوقف كذا في المحيط  
(فتاویٰ مالگیری ص ۱۰۳)  
خفاف نے وقف کے بیان میں ذکر  
کیا ہے کہ اگر کسی نے گھر میں کوئی  
کوٹھری وقف کی، تو اگر اس کا راستہ  
کے ساتھ وقف کیا ہے تو وقف جائز  
ہے اور اگر راستہ کے ساتھ وقف  
نہیں کیا تو وقف جائز نہیں (کذا فی المحيط)

انھی تمام بحثوں کا اختصار کرتے ہوئے حضرت مولانا فتح محمد صاحب تائب لکھنوی نے تطہیر الاموال المعروف بہ عطر ہدایہ میں وقف کی بحث میں وقف کو باطل کرنے والی چیزوں کو اس طرح بیان کیا ہے۔

**مبطل وقف ۱۔** وہ کلمے ہیں جو معنی خلاف پر دلالت کریں مثلاً یہ کہے کہ یہ گاؤں درویشوں کو دیا، یہ مکان مدرسہ کیلئے ہے، یہ وقف نہیں، ہبہ و تصدق ہے (مسئلہ) وہ تمام معافیاں اور جائیدادیں جن کے وقف ناموں میں اس قسم کی عبارتیں ہوں ہبہ ہیں وقف نہیں۔ ۲۔ مصارف محرمہ جیسے تھلنے کے خرچ کے لئے وقف کرنا (عالمگیری) یا تعزیرہ داری یا مجالس غنا کے لئے۔ ۳۔ مال کا غیر متقوم و ممنوع النفع ہونا جیسے محض نکمی شئی یا خمر یا خنزیر یا تصادیر یا مزامیر وغیرہ، ۴۔ غیر مملوک یا مستحق کا وقف کرنا، غصب کی زمین یا جس میں حق شفعہ یا حق مرتہن وغیرہ باقی ہو، ۵۔ توقیت و خیار یعنی یہ کہے کہ یہ زمین دس برس کے لئے وقف ہے یا مجھے اختیار ہے چاہے وقف باقی رکھوں یا نہ (عطر ہدایہ ص ۱۴۳)

حضرت مولانا فتح محمد صاحب نے ان پانچوں چیزوں کو مبطل وقف قرار دیا ہے جن میں کلمات وقف یا شرائط وقف پائے نہ جانے کی وجہ سے حقیقت وقف متحقق نہیں ہوتی، ان میں سے پہلی بات انھوں نے یہ فرمائی ہے کہ اگر ایسے کلمات استعمال کئے گئے جو وقف کے بجائے وقف کے خلاف کسی اور معنی پر دلالت کرتے ہوں، مثلاً یہ کہے کہ یہ گاؤں درویشوں کو دیا یا یہ کہا کہ یہ مکان مدرسہ کیلئے ہے تو اس کو وقف قرار نہیں دیا جائیگا، بلکہ یہ چیزیں درویشوں اور مدرسہ کیلئے



ہبہ اور صدقہ قرار دی جائیں گی۔

حضرت مولانا فتح محمد صاحب کا یہ ارشاد مبسوط سرخسی، فتح القدیر اور فتاویٰ مالگیری کے انہیں جزئیات کی طرح ہے جو اوپر نقل کی گئی ہیں کہ ان الفاظ کے ذریعہ وقف کی حقیقت متحقق نہیں ہوتی بلکہ جس طرح اراضی هذه صدقة علی المساکین کلمہ نذر ہے، اسی طرح یہ کلمات کہ گاؤں درویشوں کو دیا یا مکان مدرسہ کیلئے ہے، یہ تملیک کے کلمات ہیں جن سے ہبہ اور صدقہ کی حقیقت متحقق ہو جائے گی یعنی ان کلمات سے مدرسہ کی ملکیت قائم ہو جائے گی مگر مدرسہ کیلئے مکان وقف قرار نہیں دیا جائیگا۔

## مدرسہ یا مسجد کی ملکیت

اس سے یہ بات بھی ثابت اور واضح ہو گئی کہ اگر کوئی چیز مدرسہ یا مسجد کو ایسے الفاظ کے ذریعہ دی جائے جن سے حقیقت وقف متحقق نہ ہو بلکہ وہ کلمات تملیک پر دلالت کرتے ہوں تو وہ چیز مدرسہ اور مسجد کے لئے وقف نہیں ہوتی بلکہ ان کی ملکیت میں آجاتی ہے، فقہاء کرام نے ایسے جزئیات بھی لکھے ہیں جن میں وقف کے بغیر مسجد یا مدرسہ کاموں کے لئے اموال کا دیا جانا اور ان کا شرعاً صحیح ہونا مذکور ہے۔

ذکر الصدقات الشہید فی	صدر شہید نے باب واؤ میں یہ جزئیہ
باب الواو اذا تصدق بدارۃ	لکھا ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنا گھر
علی مسجد او علی طریق	مسجد میں یا مسلمانوں کے راستے کیلئے

المسلمین تعلّموا فیہ  
والمختار انہ یجوز  
کما لوقف عذافی  
الذخیرۃ -

(فتاویٰ مالگیری ۱۰۳۳/۲۶)

صدقہ کے طور پر دیدیا تو اس سلسلے  
میں اختلاف ہوا ہے لیکن مختار یہ  
ہے کہ ایسا کرنا یعنی ان کاموں کیلئے  
دینا شرعاً جائز ہے جس طرح کہ وقف کرنا  
جائز ہے (کنزانی الذخیرۃ)

مفہوم یہ ہوا کہ جس طرح مسجد کے لئے یا دوسرے امور خیر کیلئے جائیداد کو  
وقف کیا جاتا ہے اسی طرح وقف کئے بغیر ان کاموں کے لئے صدقہ دینا بھی  
وقف ہی کی طرح درست ہے، اس سے زیادہ صراحت کے ساتھ یہ جزئیات  
فتاویٰ میں موجود ہیں۔

رجل اعطی درهما فی  
عمارة المسجد او نفقة  
المسجد او مصالح المسجد  
صح لانه ان كان  
لا یمكن تصحیحه وقفاً  
یسكن تصحیحه تملیکاً  
بالهبة للمسجد ولو  
قال وهبت داراً  
للمسجد او اعطيتها  
لدا صحت ویكون تملیکاً

کسی شخص نے مسجد کی عمارت کے لئے  
یا مسجد کے خرچ کے لئے یا مسجد کی  
مصلحت کے لئے درہم دئے، تو یہ  
درست ہے کیونکہ اگرچہ اس کو وقف  
قرار دے کر تو صحیح نہیں کیا جاسکتا  
لیکن مسجد میں ہبہ کے ذریعہ مسجد کی  
ملکیت قرار دے کر صحیح کہا جاسکتا ہے  
اور اگر کسی نے یہ کہا کہ میں نے اپنا گھر  
مسجد کو ہبہ کیا یا عطا کیا تو یہ صحیح ہے اور  
اس کو مسجد کی ملکیت میں دینا قرار دیا جائیگا۔

و يشترط التسليم كما لو  
قال وقفت هذه الماشية  
للمسجد يصح بطريق  
التسليم اذا سلمه للقيم  
كذا في الفتاوى العتابية  
(فتاویٰ مالگیری مج ۱ ص ۱۰۳۲)

اور مہبہ کی طرح یہاں قبضہ دینا شرط  
ہوگا جیسے مثلاً اگر یہ کہا کہ یہ سورہیے  
میں نے مسجد کیلئے وقف کئے تو اگر  
اس نے یہ رقم متولی کو دیدی تو اس کو  
(وقف کے طور پر نہیں) مسجد کی ملکیت  
قرار دیکر صحیح کہا جائیگا (کذا فی الفتاویٰ العتابية)

ان عبارتوں کا صاف اور صریح مفہوم یہ ہوا کہ فقہاء کرام شرائط متحقق  
نہ ہونے کی صورت میں مسجد میں دینے کو صحیح اور درست قرار دے رہے ہیں  
لیکن یہ دینا مسجد کو مالک بنانا ہے، مسجد کیلئے وقف کرنا نہیں ہے، مثلاً مندرجہ  
بالا دو مثالوں میں غیر منقول جائیداد یعنی مکان کے سلسلے میں چونکہ دینے والے  
نے کلمات وقف کا استعمال نہیں کیا، بلکہ اعطاء یعنی کلمہ تسلیم استعمال کیا ہے  
اسلئے وقف کی حقیقت متحقق نہیں ہوتی تو انھوں نے اس کو مسجد کی ملکیت  
قرار دیدیا، یا منقول اموال یعنی رقم کے سلسلے میں اگرچہ دینے والے نے کلمہ وقف  
”وقف“ استعمال کیا ہے لیکن یہاں دوسری شرط پائے نہ جانے کے سبب  
لفظ وقف کے باوجود حقیقت وقف متحقق نہیں البتہ ملکیت یہاں بھی  
ثابت ہے۔

مسجد کی ملکیت کے اعتراف کا صاف مطلب یہ ہوا کہ فقہاء کرام نے  
تبرعات نافلہ کے باب میں مسجد کو شخص حکمی تسلیم کیا ہے اور جس طرح شخص  
حقیقی یعنی زید عمرو و بکر وغیرہ کی ملکیت اور جائیداد ہوتی ہے وہ اسی طرح مسجد

اور مسلمانوں کی دیگر ضروریات کے لئے قائم کئے جانے والے اداروں کو شخص حکمی قرار دے رہے ہیں اور ان کیلئے املاک کا وجود بھی تسلیم فرما رہے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ وقف قرار نہ دینے کا یہ مفہیم ہرگز نہیں کہ وہ جائیداد کسی کی ذاتی ملکیت بن جائے گی بلکہ ملکیت تو وہ مدرسہ یا مسجد ہی کی رہے گی اور اس میں وقف ہی کی طرح تحفظ بھی ہوگا، ہاں یہ ضرور ہے کہ اس پر وقف کے سب احکام جاری نہ ہوں گے، مثلاً وقف کا حکم یہ بھی ہے کہ اگر واقف نے تولیت کے بارے میں وراثت کی تصریح کر دی ہو تو واقف کی تصریح کے مطابق تولیت میں وراثت قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے لیکن اگر جائیداد مسجد یا مدرسہ کی ملکیت بن گئی ہے تو اب اس کی تولیت میں وراثت کے احکام جاری نہ ہوں گے۔

## سہ اشرف العلوم کانپور کی جائیداد کے سلسلے میں علماء کے فتاویٰ

اگر کسی جائیداد کو مدرسہ میں وقف کی تصریح کے بغیر دیدیا جائے تو وہ مدرسہ کی ملک تو ہو جاتی ہے لیکن وقف نہیں ہوتی، اس سلسلے میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ اشرف العلوم کانپور کے بارے میں پیش آنے والے واقعہ کی مختصر روداد پیش کر دی جائے۔

مدرسہ اشرف العلوم ایک مسجد میں قائم تھا کہ وہاں کے مہتمم کو یہ پیش کش کی گئی کہ تم مدرسہ کیلئے کوئی جگہ تلاش کر لو، ایک صاحب خیر

اس کو خرید کر اس پر مدرسہ کے لئے عمارت بنوادیں گے، چنانچہ وہاں کے مہتمم نے جگہ تلاش کی، وہ جگہ مدرسہ کیلئے خرید لی گئی، پھر اس پر تعمیر کی گئی اور مدرسہ شروع ہو گیا لیکن دو چار دن کے اندر ہی مہتمم مدد اور ان صاحب خیر کے درمیان اختلاف ہو گیا تو ان صاحب خیر نے مدرسہ کی عمارت خالی کرالی اور اس کو ایک یتیم خانے کے نام وقف کر دیا۔

اس صورت میں مہتمم مدرسہ کا دعویٰ تو یہ تھا کہ جائیداد مدرسہ کیلئے خریدی گئی اور مدرسہ ہی کے لئے تعمیر کی گئی ہے اس لئے وہ مدرسہ ہی کی ہے، اور یتیم خانہ کے متولی کا استدلال یہ تھا کہ صاحب خیر نے اگرچہ اس نیت سے جائیداد خریدی اور تعمیر کی تھی کہ مدرسہ کیلئے وقف کی جائے گی، مگر ابھی تک اس کی نوبت نہیں آئی تھی اس لئے صاحب خیر کا مدرسہ اشرف العلوم کے بجائے یتیم خانہ کے لئے وقف کرنا صحیح ہونا چاہئے۔

چنانچہ دونوں فریق نے اپنے اپنے بیانات قلم بند کر کے علماء کرام سے فتاویٰ حاصل کئے، مہتمم مدرسہ نے تفصیلی واقعات لکھ کر جو استفتاء مرتب کیا اس میں درج تھا کہ

۱۔ یہ جائیداد مدرسہ اشرف العلوم کیلئے وقف ہوگی یا نہیں؟

۲۔ یہ وقف نامہ جو یتیم خانہ کے حق میں لکھا گیا ہے وہ شرعاً صحیح ہے یا باطل؟

چنانچہ مولانا ظفر احمد صاحب نے تھانہ بھون سے جواب دیا۔

۱۔ یہ عمارت مدرسہ اشرف العلوم کی ہے اور مدرسہ مذکور کیلئے وقف ہو چکی

ہے۔ (۲)۔ جب یہ زمین و عمارت مدرسہ اشرف العلوم کے لئے وقف ہو چکی

تو اب یتیم خانہ کیلئے اس کا وقف بالکل باطل ہے۔

(ابراز المکتوم ضمیمہ عطر مدایہ صفحہ ۲۶)

جب کہ مولانا عبدالحفیظ صاحب طبع آبادی نے اس کے خلاف فتویٰ دیا، مولانا صدرالدین صدر مدرس جامع العلوم کانپور، مولانا غلام یحییٰ اور دہلی کے بیشتر علماء نے اس کی تصدیق کی، اس کا خلاصہ یہ تھا۔

۱۔ کہ محض نیت سے وقف نہیں ہوتا، اب جبکہ یہ جائیداد صاحب خیر ہی کی ملکیت میں ہے اور اشرف العلوم کیلئے نہ انھوں نے وقف کیا اور نہ وقف ثابت ہوا تو یہ جائیداد ابھی تک انہی کی ملکیت میں رہی لہذا اس کا یتیم خانہ کے لئے وقف کرنا بالکل صحیح ہے۔ (ایضاً صفحہ ۲۷)

ان متضاد فتاویٰ کے بعد، پھر خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون سے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے، اور حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب کانپوری سے رجوع کیا گیا، خانقاہ امدادیہ سے اصل جواب تو مولانا عبدالکریم صاحب نے لکھا لیکن حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے اس پر ایک خلاصہ تحریر فرمایا۔ حضرت کی عبارت یہ ہے

”خلاصہ یہ ہے کہ اگر یہ زمین مدرسہ اشرف العلوم کے لئے وقف ہو تب بھی اور اگر مدرسہ کیلئے وقف نہ ہو مگر مدرسہ کی ملک ہو تب بھی یہ حکم مشترک ہے کہ زمین کسی حال میں شیخ عبداللطیف کی ملک نہیں، اس لئے ان کو دوسری جگہ اس کے دینے کا کوئی حق نہیں، ہر حال میں مدرسہ کا حق ہے خواہ فنکار مدرسہ خواہ دفن مدرسہ۔“

کتبہ اشرف علی



حضرت حکیم الامتؒ نے اشرف العلوم کے لئے وقف ہونے کی مراحت کے ساتھ توثیق یا تردید نہیں فرمائی یعنی انھوں نے اس جائیداد کو یقینی طور پر وقف قرار نہیں دیا اور لکھا کہ یہ زمین اور تعمیر مدرسہ اشرف العلوم ہی کی ہوگی خواہ اس کو مدرسہ کی ملک قرار دیا جائے یا اس کو مدرسہ حق میں وقف قرار دیا جائے اس کے ساتھ یہ ہوا کہ دونوں فریق کے کاغذات شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کے پاس روانہ کئے گئے تو آپ نے تحریر فرمایا — مسی کے نزدیک یہ زمین خالص ملک مدرسہ اشرف العلوم کی ہے اور عمارت بھی اسی کی، نہ صاحب خیر کو اس میں کوئی حق تصرف ہے نہ تنیم خانہ کو ان میں سے کسی کو بھی اس میں حق مداخلت نہیں اور وقف نامہ برائے تنیم خانہ) باطل ہے ۱۶ (ایضاً ص ۲۸۲)

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے مدرسہ کیلئے وقف ہونے کی مراحت سے تردید نہیں فرمائی، لیکن ملک مدرسہ قرار دینا وقف ہونے کی تردید ہے کیونکہ وقف کسی کی ملک نہیں ہوتا، اس لئے کہا جائیگا کہ صاحب خیر نے جو زمین مدرسہ کو خرید کر دی تھی پھر اس پر مدرسہ ہی کیلئے تعمیر کرائی تھی وہ سب مدرسہ کی ملکیت بن گئی۔

اس کے بعد فریقین کے بیانات، ان تمام فتاویٰ کے ساتھ حضرت مولانا فتح محمد صاحب کے صاحبزادے اور شیخ الہند کے تلمیذ رشید حضرت مولانا سعید صاحب لکھنوی رحمہ اللہ کی خدمت میں پہنچے تو حضرت مولانا تحریر فرمایا۔

• چونکہ مسئلہ کا ایک لفظ بھی تقریر یا تحریر ایسا نہ ہو کہ نہیں جو چھبیس

لفظوں مخصوص وقف میں سے ہو یا جس کی دلالت معنی وقفی پر ہوتی ہو اس لئے صورت مسئلہ میں احقر کے نزدیک زمین و عمارت کا مدرسہ اشرف العلوم پر وقف ہونا ہمارے ائمہ ثلاثہ میں سے کسی کے مذہب پر ثابت نہیں ہوتا ہے پس مولانا ظفر احمد صاحب و مولانا عبدلکریم صاحب کے فتوؤں میں جو حکم وقف لگایا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ (ایضاً ص ۲۸۲)

پھر مفصل بحث کے بعد لکھا۔

یہ زمین مدرسہ ہی کی ملک میں آئے گی اور مدرسہ ہی اسکا مالک ہوگا نہ کہ عبداللطیف (صاحب خیر) صاحب خیر نے جو اس میں تعمیر کی ہے وہ بھی مدرسہ ہی کیلئے ہوگی نہ کہ عبداللطیف کیلئے (پھر چند صفحات کے بعد) چونکہ حسب تصریح فقہاء صحت وقف کے لئے موقوف کا بوقت وقف مملوک واقف ہونا ضروری ہے، اس لئے اس کا تقسیم خانہ کیلئے وقف بالکل باطل ہے اور اس عمارت کو مدرسہ اشرف العلوم کے قبضہ میں دینا واجب ہے (ایضاً ص ۲۸۹)

ابو انزالہ مکتوم فی اثبات التصدق علی اشرف العلوم کے نام سے مدرسہ اشرف العلوم کانپور کی زمین و عمارت کے سلسلے میں کی گئی یہ فقہی بحث مطر بدایہ کے ضمیمہ کے طور پر تقریباً تیش صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔

اسکا خلاصہ یہ ہوا کہ مدرسہ اشرف العلوم کانپور کے لئے ایک صاحب خیر نے زمین خریدی، پھر اس پر اپنی ذاتی ملک سے نہ کہ چندہ سے عمارت تعمیر کرائی اور اکابر علماء نے اس کے باوجود یہ فتویٰ دیا کہ یہ جائیداد مدرسہ اشرف العلوم کی ملک ہے وقف نہیں ہے، وجہ یہی ہے کہ وقف شریعت کی ایک مخصوص اصطلاح ہے

اور وہ شریعت کی مقررہ شرائط کے بغیر مستحق نہیں ہوتا۔

## سلاطین کی جانب سے بجائیوں کی عایدیوں وقف نہیں ہیں

در مختار میں تصریح ہے کہ سلاطین کی جانب سے علماء یا تعلیم گاہوں کیلئے جو جائیدادیں مقرر کر دی جاتی ہیں وہ اوقاف نہیں ہیں بلکہ ان کا نام ارماد یعنی مصارف تعلیم کے انتظام میں مقرر کردہ جائیداد ہے، در مختار میں ہے

والارصاد من السلطان لیست باوقاف البتہ (در مختار ص ۲۸۹)

سلطان کی جانب سے دی گئی جاگیریں ارماد کہلاتی ہیں وہ یقیناً وقف نہیں ہیں

اس پر علامہ شامی قدس سرہ نے تحریر فرمایا۔

الرصد الطريق و رصدتہ من باب قتل قعدتہ علی الطريق و قعد فلان بالمرصد ای بطریق الارتقاب والانتظار ومنہ سہی ارماد السلطان بعض القرائی والمزارع من بیت المال علی المساجد والمدارس ونحوھا

رصد کے معنی راستہ کے ہیں اور رصدتہ باب قتل (نصر) سے آتا ہے، کسی کا راستہ پر انتظار کرنا، قعد فلان بالمرصد کے معنی ہیں کہ راستہ میں بیٹھ کر کسی کا انتظار یا نگہبانی کرنا، اسی لغت سے ارماد السلطان کی اصطلاح ماخوذ ہے کہ سلطان بیت المال کی جائیدادیں سے کچھ کاشت کی زمین یا گاؤں وغیرہ کو مسجدوں، مدرسوں یا بیت المال

لَمَنْ يَسْتَحِقُّ مِنْ بَيْتِ الْمَالِ  
كَالْقَرَارِ وَالْأَثْمَةِ وَالْمَوْذِنِينَ  
وَنَحْوِهِمْ كَانَ مَا رَصَدَهُ  
قَائِمًا عَلَى طَرِيقِ حَاجَاتِهِمْ  
يَر\_اقِبُهَا وَإِنَّمَا لِرَبِّكَ  
وَقَفَا حَقِيقَةً لَعَدَمِ مَلِكِ  
السُّلْطَانِ لَهُ، بَلْ هُوَ  
تَعْيِينَ شَيْءٍ مِنْ بَيْتِ  
الْمَالِ عَلَى بَعْضِ مُسْتَحْقِيهِ  
فَلَا يَجُوزُ لِمَنْ بَعْدَهُ  
أَنْ يَغْيِرَهُ وَيَبْدِلَهُ  
كَمَا قَدْ مَنَّا ذَلِكَ مَبْسُوطًا  
(رد المحتار ج ۲ ص ۲۶۰)

کی آمدنی کا استحقاق رکھنے والے علماء  
ائمہ اور مؤذنین کو دیدیں تو یہ وہ امداد  
ہے جو ضروریات زندگی کے راستہ میں  
ان حضرات کا انتظار کر رہی ہے،  
سلطان کی جانب سے بیت المال سے  
دی جانے والی یہ املاک حقیقہً وقف  
اس لئے نہیں ہیں کہ وہ سلطان کی  
ملکیت میں نہیں تھیں بلکہ سلطان کا یہ  
عمل بیت المال کی کسی چیز کو بعض  
مستحقین کیلئے خاص کرنے کا عمل ہے  
اور اس لئے بعد میں آنے والے کسی  
حاکم کیلئے اس میں تغیر و تبدل جائز  
نہیں جیسا کہ یہ بحث مفصل گزر چکی ہے

اس عبارت میں فرمایا گیا ہے کہ سلاطین کی جانب سے اگر مساجد یا مدارس  
وغیرہ کو کچھ جائیداد بیت المال کی املاک میں سے دیدی جائے یا ان لوگوں  
کو دیدی جائے جو بیت المال سے امداد کے مستحق تھے تو حقیقی طور پر اسکو  
وقف قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ وقف کے لئے یہ ضروری ہے کہ وقف کرنے  
والا اس جائیداد کا مالک ہو اور وہ اپنی شخصی ملکیت ختم کر کے اسکی وقف  
کرے، یہاں سلطان چونکہ بیت المال کے اموال و املاک پر ملکیت نہیں

رکھتے اس لئے ان کا بیت المال کی جائیداد کو کسی کام کیلئے یا کسی فرد کیلئے دینا وقف قرار نہیں دیا جاسکتا، البتہ یہ کہا جائیگا کہ انھوں نے مستحقین کو ان کا حق پہنچا دیا۔ سلاطین کے اس عمل کے لئے فقہار احناف نے وقف کے علاوہ ایک اور مستقل اصطلاح ارصاد استعمال کی کہ سلاطین کا یہ عمل ارصاد کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے، علامہ شامی نے لغوی معنی سے اصطلاحی معنی کی مناسبت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ رصد کے معنی راستے کے ہیں اور رصد کے معنی راستہ پر بیٹھ کر انتظار کرنے کے ہیں، اس لئے ارصاد کے معنی ہوئے وہ اموال جو زندگی کی راہوں میں ضرورت مندوں کے منتظر رہتے ہیں، گویا ضروریات زندگی کی تکمیل کے طور پر، مستحقین کو بیت المال سے کچھ املاک سلطان کی جانب سے دیدی جائیں تو وہ "ارصاد" ہیں وقف نہیں ہیں۔

علامہ شامی فرماتے ہیں کہ یہ بحث ہم تفصیل سے کر چکے ہیں، یہ بحث جس کا انھوں نے حوالہ دیا ہے بڑے قیمتی افادات پر مشتمل ہے، بیت المال کی جائیداد اور سلاطین و امراء کے اوقاف پر بحث کرنے کے بعد لکھا ہے۔

نفی هذا تصریح بان اوقاف	اس سے یہ بات صراحت سے معلوم
السلطان من بیت المال	ہوئی کہ سلاطین نے بیت المال کے
ارصادات لا اوقاف حقیقة	اموال سے جو وقف کئے ہیں وہ
وان ما کان منها	ارصادات ہیں، حقیقتہً اوقاف نہیں
على مصارف لا ينقض	میں اور یہ کہ جو ارصادات ان لوگوں
بخلاف ما وقف	کیلئے ہوں جو بیت المال کا مصرف تھے

السلطان علی اولاده  
او عتقائہ مثلاً وانہ  
حیث کانت ارضاً  
لا یلزم مراعاة شروطها  
لعدم کونها وقفاً صحیحاً  
فان شرط صحته ملک  
الواقف، والسلطان  
بدون الشراء من  
بیت المال لا یملک  
وقد علمت موافقة  
الاعمال علی ذلک  
وهو موافق لما مر عن  
المبسوط وعن المولی  
ابی السعود ولما سید کرہ  
الشارح فی الوقف  
عن النہر من ان وقف  
الاقطاعات لا یجوز  
الا اذا کانت ارضاً  
مواتاً او ملکاً للامام

ان کو ختم کرنا جائز نہیں، بخلاف ان  
املاک کے جن کو سلطان نے اپنی  
اولاد یا اپنے موالی کیلئے وقف کیا ہو  
(کہ ان کا ختم کرنا جائز ہے) اور جبکہ  
یہ ارضاد کی صورت ہے تو وقف کی  
شرائط کا ملحوظ رکھنا لازم نہ ہوگا،  
کیونکہ یہ وقف صحیح نہیں ہے، کیونکہ  
وقف کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ  
وہ واقف کی ملکیت ہو اور سلطان  
ان املاک کو بیت المال سے خریدے  
بغیر ان کا مالک نہیں ہے، یہ معلوم ہو چکا  
ہے کہ علامہ اکمل الدین کی اس سلسلے  
میں یہی لائے ہیں، اور جو مبسوط سے  
اور مولی ابوالسعود سے نقل کیا گیا تھا  
وہ بھی اسی کے موافق ہے اور شارح  
جو کتاب النہر سے وقف کے باب میں  
نقل کریں گے وہ بھی یہی ہے کہ بیت المال  
سے نامزد کردہ جاگیروں کو وقف قرار دینا  
صحیح نہیں ہے الا یہ کہ وہ زمین غیر آباد



فاقطعها رجلا وهذا  
 خلاف ما في التحفة  
 المرضية عن العلامة  
 قاسم من ان وقف  
 السلطان لارض بيت  
 المال صحيح قلت -  
 ولعل المراد انه لانهم  
 لا يغير اذا كان على  
 مصلحة عامة كما  
 نقل الطرطوسي عن  
 قاضي خان من ان  
 السلطان لو وقف  
 ارضا من بيت مال  
 المسلمين على مصلحة  
 عامة للمسلمين جاز  
 قال ابن وهبان، لانه  
 اذا ابداه على مصرفه  
 الشرعي فقد منع من  
 يصرفه من امراء الجور

اور بنجر رہی ہو یا امام کی اپنی ملکیت  
 ہو پھر اس نے کسی شخص کے نام اس  
 کو الاٹ کر دیا ہو، البتہ یہ مضمون اسکے  
 خلاف ہے جو تحفہ مرضیہ میں علامہ قاسم  
 کی جانب منسوب کیا گیا کہ سلطان کا  
 بیت المال کی زمین کو وقف کرنا صحیح  
 ہے۔ میں عرض کروں گا کہ شاید وقف  
 سے مراد حقیقت وقف نہیں بلکہ یہ ہے  
 کہ عوامی مصلحت کیلئے ایسا کیا گیا ہے  
 تو اب یہ نامزدگی لازم ہو گئی ہے اور غیر  
 جائز نہیں ہے جیسا کہ طرطوسی نے  
 قاضی خاں سے نقل کیا ہے کہ سلطان  
 اگر عام مسلمانوں کی مصلحت کیلئے بیت المال  
 کی زمین وقف کر دے تو جائز ہے، ابن  
 وهبان نے اس کی تشریح یہ کی ہے  
 کہ اگر سلطان نے ابدی طور پر اس کا  
 مصرف شرعی معین کر دیا تو اس نے  
 ظالم امراء کو دوسرے غیر شرعی مصرف  
 میں صرف کرنے سے روک دیا، اس کا

فی غیر مصرفہ ۱۰ ، فقد  
افاد ان المراد من هذا  
الوقف تا بید صرفہ علی  
هذه الجهة المعينه التي  
عينها السلطان بما هو  
مصلحة عامة وهو  
معنى الارصاد السابق  
فلا ينافي ما تقدم  
( رد المحتار ج ۲ ص ۲۸۲ )  
مفہوم یہ ہوا کہ یہاں لفظ وقف کے  
اطلاق سے مراد وقف کے حقیقی معنی  
نہیں ہیں بلکہ یہاں وقف کے معنی  
سلطان کی جانب سے عوامی مصلحتوں  
کے لئے مصرف شرعی کا ابدی طور پر  
تعیین ہے اور بالکل یہی معنی اس  
لفظ ارصاد کے ہیں جو زیر بحث ہے  
اس لئے معنی مرادی کے اعتبار سے  
کوئی تعارض نہیں ہے۔

علامہ شامی کی اس عبارت میں پہلے تو یہ بیان کیا گیا ہے کہ بیت المال  
کے جو اموال سلاطین کی جانب سے وقف کئے جاتے ہیں وہ اوقاف نہیں ہیں  
دلیل یہ ہے کہ وقف تو اسی وقت صحیح قرار دیا جاسکتا ہے کہ اس پر واقف کی  
ملکیت، وقف سے پہلے قائم ہو، پھر اس شخص نے اپنی ذاتی ملکیت کو ختم  
کر کے اس کو ملکیت خداوندی میں دیدیا ہو لیکن جہاں واقف خور مالک ہی نہیں  
ہے تو دوسروں کی ملکیت کو یہ کیسے وقف کر سکتا ہے، اس مضمون کو علامہ  
شامی نے چار اکابر علماء کی طرف منسوب کیا ہے۔

۱۔ علامہ اکمل الدین شارح ہدایہ کی یہی رائے ہے

۲۔ مبسوط میں امام سرخسی نے بیت المال کی زمینوں کے سلسلے میں یہی

فرمایا ہے۔

۳۔ مولیٰ ابوالسعود جو اوقاف سلطانیہ کے سلسلے میں بڑی گہری نظر رکھتے ہیں، ان کی یہی رائے ہے۔

۴۔ اور خود صاحب درمختار آئندہ نہرہ سے نقل کریں گے کہ سلطان کی جانب سے جائیدادوں کو صرف اسی صورت میں وقف کہا جاسکتا ہے جب وہ زمینیں غیر آباد اور افتادہ ہوں یا امام نے اپنی ملکیت کو وقف کیا ہو، لیکن اگر وہ سلطان کی ذاتی ملکیت نہیں تھی بلکہ بیت المال کی ملکیت تھی اور وہ بھی غیر آباد نہیں بلکہ آباد زمین تھی تو ایسی جائیداد کی نامزدگی وقف نہیں ارصاد ہے جس کی تشریح گذر چکی ہے۔

اس مضمون کو چار حوالوں سے نقل کرنے کے بعد علامہ شامی نے ان حضرات کے قول کی تاویل کی ہے جنہوں نے اس طرح کی جائیداد پر وقف کا اطلاق کیا ہے، انہوں نے بتلایا کہ تحفہ مرضیہ میں علامہ قاسم خفگی کی جانب منسوب کیا گیا ہے کہ انہوں نے سلطان کی جانب سے بیت المال کی زمینوں پر اس طرح کے تصرف کو وقف صحیح قرار دیا ہے، مگر علامہ شامی کی تحقیق یہ ہے کہ ایسی زمینوں پر وقف کا اطلاق مجاز ہے کیونکہ یہاں وقف کا اطلاق شخصی ملکیت ختم کر کے ملکیت خداوندی کو قائم کرنے کے معنی میں نہیں اس لئے کہ شخصی ملکیت تو قائم ہی نہیں تھی بلکہ یہاں اگر وقف کے الفاظ استعمال بھی ہوئے ہیں تو یہ اطلاق مجازی ہے کہ سلطان نے بیت المال کے بعض اموال کا مصرف شرعی، ابدی طور پر معین کر دیا ہے، پھر انہوں نے یہ بتلایا کہ وقف کے یہ معنی مجازی وہی ہیں جو ارصاد کے مرادف ہیں۔

علامہ شامی رحمہ اللہ کی بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ بیت المال کی جائیدادوں میں سلطان کے اس طرح کے تصرفات کو وقف حقیقی قرار نہیں دیا جائیگا اور جن علماء نے بیت المال کی اہلاک میں سلاطین کے اس طرح کے تصرفات کو وقف کہا ہے انہوں نے وقف کے اصطلاحی اور حقیقی معنی مراد نہیں لئے بلکہ معنی مجازی مراد لئے ہیں۔

## ہندوستان کے مدارس عربیہ

یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ ہندوستان کے عربی مدارس جن کی بنیاد اسلامی حکومت کے ختم ہونے کے بعد عوامی چندہ پر رکھی گئی ہے بالکل نئی نوعیت کے حامل ہیں۔ یہ مدارس اپنے مقصد تاسیس اور مقاصد عظمیٰ کے لحاظ سے اسلام کے تحفظ کے قلعے اور دعوت و تبلیغ کے مراکز ہیں، طریق کار کے لحاظ سے یہ دینی اور مذہبی تعلیم کا ہیں اور اقتصادی نظم کے اعتبار سے یہ محدود قسم کے بیت المال ہیں۔ یعنی یہاں مجلس اولوالامر کی اجازت سے محدود ذرائع آمدنی اور اس کے معین مصارف ہیں، اسلامی بیت المال کی طرح یہاں کے ذرائع آمدنی اور مصارف عام نہیں ہیں مثلاً فے، خراج، عشر اور محصول وغیرہ کی آمدنی یہاں نہیں ہے، مصارف میں عام غریب و مساکین کی امداد اور نظارات نافعہ پٹی، ڈبلوڈی کا تصور تک نہیں ہے، نیز آمدنی کی وصولیابی کیلئے جبر کا کوئی حق نہیں ہے، بلکہ اس محدود بیت المال میں کچھ صدقات واجبہ اور کچھ صدقات نافلہ کی آمدنی ہوتی ہے اور علم دین کے لئے اپنی زندگی کو وقف کرنے والے طلبہ و علماء خاص طریق کار

کے ساتھ اسکے مصارف ہیں، ان صدقات نافلہ اور تبرعات ہی سے کبھی کوئی جائیداد بھی خرید لی جاتی ہے، یا کبھی کوئی جائیداد ہی چندہ میں حاصل ہو جاتی ہے یا ان کے نام وقف بھی کر دی جاتی ہے، اس لئے ان تمام مدارس پر وقف ہونے یا نہ ہونے کا یکساں حکم نہیں لگایا جاسکتا، بلکہ اس سلسلے میں صیغہ نتیجہ تک پہنچنے کے لئے مدارس عربیہ اور وقف کے سلسلے میں کی گئی گفتگو کے مندرجہ ذیل نقاط پر غور کرنے کے بعد تجزیہ کر کے حکم بیان کرنا ہوگا۔

الف :- جائیداد موقوفہ کا وقف کے وقت واقف کی ملکیت میں ہونا ضروری ہے  
ب :- وقف کی حقیقت کے تحقق کیلئے فقہاء کرام کے معین کردہ الفاظ یا معنی وقفی پر دلالت کرنے والی تعبیر کا ہونا ضروری ہے۔

ج :- اگر ایسی تعبیر اختیار کر لی گئی جو وقف کے علاوہ تملیک، ہبہ، یا نذر وغیرہ پر دلالت کرتی ہو تو وقف کے بجائے ہبہ، نذر یا تملیک کی حقیقت متحقق ہو جائے گی۔

ان نقاط کی بنیاد پر اعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ مدارس عربیہ اور ان کی تمام جائیدادوں کا ایک حکم نہیں ہے، اگر کسی فقیہ یا عالم نے ان پر علی الاطلاق وقف کا اطلاق کیا ہے تو علامہ شامی کی توجیہ کے مطابق یہی کہا جائیگا کہ یہ اطلاق اصطلاحی اور حقیقی معنی میں نہیں ہے بلکہ مجازی ہے، اور مندرجہ بالا نقاط اور اپنی نو صیتوں کے اختلاف کے سبب خود مدارس عربیہ کی اور ان کی املاک متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں اور ان کے احکام الگ الگ ہیں، مثلاً

۱ :- اگر یہ صورت ہے کہ کسی شخص نے اپنی مملوکہ جائیداد تمام شرائط وقف کو

پورا کرتے ہوئے مدرسہ کے طور پر وقف کی ہے یعنی مدرسہ پہلے سے نہیں تھا بلکہ مدرسہ کا آغاز ہی اس طرح ہوا ہے تو وہ مدرسہ اصطلاحی اور حقیقی وقف ہے۔

۲۔ اگر یہ صورت ہے کہ مدرسہ کرایہ کی یا عاریت کی جائیداد میں چل رہا ہے اور اس کی اپنی کوئی جائیداد نہیں ہے، جو چندہ آتا ہے وہ طلبہ اور علماء کی ضروریات میں خرچ ہوتا رہتا ہے تو ایسا مدرسہ کسی بھی طرح کا وقف نہیں ہے، کیونکہ وقف جائیداد ہوتی ہے اور یہاں کوئی جائیداد نہیں ہے۔

۳۔ اگر یہ صورت ہے کہ مدرسہ پہلے سے موجود تھا اور اس مدرسہ کے لئے کسی شخص نے اپنی مملوکہ جائیداد تمام شرائط وقف کو پورا کرتے ہوئے وقف کی ہے تو یہ جائیداد وقف ہے، اور مدرسہ کی حیثیت اس جائیداد کے لئے موقوف علیہ کی ہے، خود مدرسہ کے وقف ہونے یا نہ ہونے کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

۴۔ اگر یہ صورت ہے کہ مدرسہ پہلے سے موجود تھا اور اس مدرسہ کے لئے کسی شخص نے اپنی مملوکہ جائیداد اس طرح دی کہ اس میں شرائط وقف متحقق نہیں ہیں تو یہ جائیداد مدرسہ کی ملک ہو جائے گی مگر شرائط وقف متحقق نہ ہونے کے سبب وقف نہیں کہا جائیگا۔

۵۔ اگر یہ صورت ہے کہ یہ جائیداد کسی ایک شخص نے نہیں دی بلکہ مدرسہ کے لئے جو چندہ کیا جاتا ہے اس سے مدرسہ کیلئے جائیداد خرید لی گئی ہے تو اس جائیداد کی نوعیت کے تعین کے لئے چندہ کی نوعیت اور اس کے طریقہ استعمال کی نوعیت کے مطابق حکم لگایا جائیگا۔



اگر یہ چندہ عمومی تھا جو مدرسہ میں داخل کر دیا جاتا ہے اور وہ چندہ خود مدرسہ کی ملک بن جاتا ہے، پھر ارباب انتظام غیر دستوری مدارس میں اس چندہ کو اپنی صوابدید کے مطابق اور دستوری مدارس میں، دستور اساسی کے مطابق خرچ کرتے ہیں، تو یہ جائیداد ان بنیادوں کی وجہ سے وقف نہیں ہو سکتی۔

اولاً۔ اس لئے کہ یہ چندہ خود وقف نہیں تھا، چندہ کے وقف نہ ہونے کے سلسلے میں اکابر دیوبند کا اتفاق رائے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وقف نہیں ہے قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ سے معلوم کیا گیا کہ مدرسہ میں جو چندہ وغیرہ کاروبار پر آتا ہے وہ وقف ہے یا مملوک، اگر وقف ہے تو بقاء عین واجب ہے اور صرف بالاستحکام ناجائز، اگر مملوک ہے اور مستم صرف وکیل تو معطلی چندہ اگر مر جائے تو غریب و ورثاء کا حق ہے تو حضرت اقدس نے جواب تحریر فرمایا۔

مدرسہ کا مستم قیم و نائب جملہ طلبہ کا ہوتا ہے جیسا کہ امیر نائب جملہ عالم کا ہوتا ہے پس جو شئی کسی نے مستم کو دی مستم کا قبضہ خود طلبہ کا قبضہ ہے اسکے قبض سے ملک معطلی سے نکلا اور ملک طلبہ کا ہو گیا اگرچہ وہ مجہول الکفایت والذوات ہوں مگر نائب معین ہے پس بعد موت معطلی کے ملک ورثہ معطلی کی اس میں نہیں ہو سکتی اور مستم بعض وجوہ میں وکیل معطلی کا ہو سکتا ہے، بہر حال نہ یہ وقف مال ہے اور نہ ملک ورثہ معطلی کی رہے گی اور نہ خود ملک معطلی کی رہے گی۔ (تذکرۃ الرشید ص ۱۶۴)

بالکل یہی جواب حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے اس طرح کے سوال کے

جواب میں دیا۔

عاجز کے نزدیک مدارس کا روپیہ وقف نہیں مگر اہل مدرسہ مال بیت المال معطین و آخذین کی طرف سے وکلاء ہیں، لہذا نہ اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور نہ معطین واپس لے سکتے ہیں۔

(فتاویٰ مظاہر علوم جلد اول ص ۳۱۹)

حضرت حکیم الامت قدس سرہ سے بھی اس طرح کا سوال کیا گیا کہ چندہ کے احکام وقف کے ہوں گے یا اور تو جواب میں تحریر فرمایا۔

”یہ وقف نہیں۔“ (امداد الفتاویٰ ص ۵۲، جلد دوم)

گویا چندہ کے سلسلے میں اکابر دیوبند کا اتفاق ہے کہ یہ وقف نہیں ہے، اس لئے جب چندہ خود وقف نہیں ہے تو اس کے ذریعہ خرید کردہ جائیداد کے حقیقی وقف قرار دیئے جانے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

ثانیاً۔ اس لئے کہ یہ چندہ وقف نہ ہونے کے ساتھ مدرسہ کی ملک بن گیا تھا، اس لئے جو حکم مدرسہ کے حق میں چندہ کا تھا وہی حکم چندہ کے ذریعہ خرید کردہ جائیداد کا رہے گا، کیونکہ اس حکم کو بدلنے کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

ثالثاً۔ اس لئے کہ چندہ دینے والے جو رقم کے اصل مالک تھے مدرسہ میں رقم دینے کے بعد اس سے بے تعلق ہو گئے، شرعاً اس لئے کہ وہ مدرسہ کو مہربا یا صدقہ کرنے کے بعد رقم کے مالک نہیں رہے اور عملاً بھی ان سے کوئی رابطہ قائم نہیں ہے ان کی تعداد بھی اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ان کو ایک نقطہ نظر پر لانے کے لئے کوئی اقدام نہیں کیا جاتا، اس لئے چندہ کے ذریعہ خرید کردہ جائیداد

پر وقف کا حکم لگانا درست نہیں۔

رابعاً۔ اس لئے کہ جن ارباب انتظام نے جائیداد خریدی ہے، انہوں نے بھی وقف کی تصریح نہیں کی، اور اگر وہ تصریح بھی کر دیں تو چونکہ وہ خود رقم کے مالک نہیں ہیں اس لئے وقف کے لفظ کے استعمال سے حقیقت وقف متحقق نہیں ہو سکتی۔

۵۔ اور اگر یہ صورت ہے کہ جائیداد عام چندے سے نہیں خریدی گئی بلکہ خرید آراضی کے لئے خصوصی چندہ کیا گیا ہے یا کسی ایک ہی فرد نے خریداری کے لئے رقم عطا کی ہے تو اس میں یہ تفصیل ضروری ہوگی کہ

اگر معطلی نے صراحت کی ہے کہ جائیداد خرید کر اس کی طرف سے وقف کر دی جائے اور ہتم کو معطلی نے صرف وکیل بالشرع بنایا ہے اور ہتم نے ایسا ہی کیا اور تمام شرائط وقف کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ عمل کیا تو یہ جائیداد وقف ہو جائے گی، مدرسہ کی حیثیت اس جائیداد کے حق میں موقوف علیہ کی رہے گی، نیز یہ کہ چونکہ یہ رقم مدرسہ کی نہیں ہوئی تھی اس لئے اگر ایسی صورت میں خرید جائیداد سے پہلے معطلی کا انتقال ہو جائے تو یہ رقم وارثین کو واپس کرنا ہوگی

۶۔ اور اگر یہ صورت ہے کہ خرید آراضی کے لئے حاصل کیا گیا یہ چندہ اس طرح آیا ہے کہ ہتم وکیل بالشرع نہیں ہے بلکہ چندہ مدرسہ میں داخل کر دیا گیا ہے اور مدرسہ اس کا مالک ہو گیا ہے تو اس کے ذریعہ خرید کردہ جائیداد کے وقف ہونے اور نہ ہونے کے سلسلے میں دو نقطہ نظر ہیں۔

ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ جائیداد وقف ہے اور عملاً چونکہ یہ ہوتا ہے

کہ چندہ مدرسہ کی ملک بن جاتا ہے اور زمین وغیرہ کی بیع بھی مدرسہ ہی کے نام ہوتی ہے اس لئے اس نقطہ نظر کے مطابق یہ توجیہ ضروری ہے کہ یہ کارروائی بظاہر اسی طرح ہوتی ہے لیکن شرعاً اس کا اعتبار نہیں ہے بلکہ جو رقم مدرسہ میں آئی ہے وہ اگرچہ قانوناً مدرسہ کی ہو گئی ہے مگر معنوی طور پر وہ ابھی تک معطلی ہی کی ملک ہے، یعنی جو بیعنامہ مدرسہ کے نام ہوا ہے وہ صرف کافذات میں مدرسہ کے نام ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس رقم کے ذریعہ خرید کردہ جائیداد معنوی طور پر معطلی کی ملکیت میں آئی پھر معطلی کی جانب سے وہ مدرسہ کیلئے وقف کی گئی، مگر اس نقطہ نظر پر متعدد فقہی اشکالات ہیں۔

(الف) پہلا اشکال یہ ہے کہ وقف کے تحقق کیلئے کلمات وقف یا ان کے ہم معنی تعبیر کا ہونا ضروری ہے جب کہ یہاں ایسا نہیں ہوا۔

(ب) دوسرا اشکال یہ ہے کہ وقف کے تحقق کے لئے ضروری ہے کہ منافی وقف معنی پر دلالت نہ پائی جائے یعنی تملیک، ہبہ، نذر وغیرہ پر دلالت کرنے والے کلمات نہ پائے جائیں جبکہ یہاں یہ چیزیں پائی گئی ہیں۔

(ج) تیسرا اشکال یہ ہے کہ وقف کے وقت، واقف کی ملکیت کا تام ہونا ضروری ہے جب کہ یہاں رقم دینے والا مدرسہ میں رقم داخل کرنے کے بعد بالکل بے تعلق ہو گیا اور زمین کی بیع بھی مدرسہ کے نام ہوئی ہے۔

اس نقطہ نظر کے وکلاء ان اشکالات کا بھی جواب دیتے ہیں کہ یہ سب ظاہری عمل ہے، حقیقتہً زمین رقم دینے والے کی ملکیت میں آئی ہے، پھر اس کی جانب سے اس جائیداد کو مدرسہ کے حق میں وقف کیا گیا ہے۔

اس نقطہ نظر کے وکلاء کے پاس تین دلائل ہیں، ان کی پہلی دلیل یہ ہے کہ فقہ کی تمام کتابوں میں یہ مسئلہ موجود ہے۔

اگر کسی نے مسلمان کیلئے پانی پلانے کی جگہ بنائی، یا سرائے بنائی جس میں مسافرین رہیں یا مجاہدین کیلئے قیام گاہ بنائی یا اس نے اپنی زمین کو قبرستان بنا دیا تو اسکی ملکیت ان چیزوں سے اس وقت تک ختم نہ ہوگی جب تک کہ حاکم اس کا حکم نہ دیدے یہ امام اعظم کے نزدیک ہے اور امام ابو یوسف کے یہاں مالک کی ملکیت محض قول سے ختم ہو جاتی ہے اور امام محمد کے نزدیک جب لوگ سقایہ سے پانی پینے لگیں، سرائے اور مرکز مجاہدین میں مسافر قیام کرنے لگیں اور قبرستان میں تدفین کا عمل شروع ہو جائے تو ملکیت ختم ہو جائے گی

من بنی سقایۃ للمسلمین  
او خانایسکنہ بنوالسبیل  
اورباطا او جعل ارضہ مقبرة  
لریزل مملکہ عن ذلک  
حتی یعکوبہ الحاکم  
عند ابی حنیفۃ وعند  
ابی یوسف یزول مملکہ  
بالقول وعند محمد  
اذا استسقی الناس  
من السقایۃ وسکنوا  
الخان والرباط ودفنوا  
فی المقبرة زال المملک  
(فتاویٰ مالگیری بتغیر ۱۰۳/۱)

اس مسئلہ میں امام محمد رحمہ اللہ کا مسلک، اس نقطہ نظر کا مستدل ہے، اس عبارت کی بنیاد پر ان لوگوں کا خیال ہے کہ امام محمد کے یہاں ان چیزوں کا محض بنا کر دیدینا ہی وقف ہے، کسی کمرہ وقف کی ضرورت نہیں ہے مگر امام محمد

کے مسلک کی بنیاد پر یہ خیال قائم کرنا درست نہیں ہے کیونکہ فتح القدير کے حوالے سے یہ بات ۳۳۱ پر گزر چکی ہے کہ ان چیزوں کا بنادینا وقف نہیں ہے، وقف تو واقف کے وقف کرنے سے ہی متحقق ہوگا، اس عبارت میں واقف کے ازالہ ملک کی شرط کا بیان کیا گیا ہے کہ وقف کرنے کے بعد قبضہ دینا ازالہ ملک کی شرط ہے۔ مزید توضیح کے لئے صدر الشریعہ کی مختصر الوقایہ اور اس کی شرح جامع الرموز کی عبارت پیش ہے

حبس العین ومنع الرقبة  
المملوكة بالقول عن تصرف  
الغير حال كونها مقصورة على ملك  
الواقف۔ (بحوالہ جامع الرموز ۲۲۵)

شئی کی عین، اور مملوک چیز کی ذات کو  
قول کے ذریعہ واقف کی ملک میں روکتے  
ہوئے غیر کے تصرف سے محفوظ کر دینا  
وقف کہلاتا ہے۔

جامع الرموز میں قہستانی نے اس کی شرح میں لکھا ہے

وانما قيد بالقول بانه لوكت  
صورة الوقفية مع الشرائط  
بلا تلفظ لعبر وقفنا  
بالاتفاق معنا في  
الجواهر (جامع الرموز ج ۲ ص ۲۵۷)

وقف کی تعریف میں) قول کی قید اس  
لئے لگائی ہے کہ اگر شرائط کے ساتھ  
وقف کی دستاویز لکھ دی مگر تلفظ  
نہ کیا، تو بالاتفاق وقف متحقق نہ ہوگا  
جو اہر میں اسی طرح ہے۔

ان دونوں عبارتوں سے بالکل واضح ہے کہ وقف میں تلفظ اور قول بالکل  
مزدوری ہے، اور قہستانی نے تلفظ کے بغیر وقف نہ ہونے پر ائمہ احناف کا  
اتفاق نقل کر دیا ہے۔



ان مذکورہ بالا چیزوں کے بارے میں محض عمل سے وقف نہ ہونے کی بات یوں بھی واضح ہے کہ یہ تمام چیزیں موقوفہ بھی ہوتی ہیں اور مملوک بھی، ان دونوں کے درمیان امتیاز کے لئے مالک کی تصریح ضروری ہے، مثلاً قبرستان مملوک زمین میں بھی ہوتا ہے اور وقف میں بھی اس لئے تصریح کے بغیر محض تدفین کی اجازت کو وقف قرار دینا کسی بھی حال میں درست قرار نہیں دیا جاسکتا، البتہ جو چیزیں مملوک نہیں ہو سکتیں صرف وقف ہی ہوتی ہیں جن کی مثال مسجد ہے، ان کے بارے میں چونکہ وقف اور ملک کے درمیان فرق کی ضرورت نہیں اس لئے بعض فقہاء کے نزدیک مالک کی تصریح کے بغیر بھی وہاں وقف کا تحقق ممکن ہے جبکہ بعض فقہاء اس صورت میں بھی واقف کی جانب سے تصریح کی ضرورت بیان کرتے ہیں جیسا کہ الاشباہ والنظائر کے حوالہ سے ۲۰ پر یہ بات گزر چکی ہے اس نقطہ نظر کے وکلاء کی دوسری دلیل یہ ہے کہ صفحہ ۱۱ تمام کتابوں میں تصریح ملتی ہے۔

الوقف یثبت بالضرورة (البحر الرائق ۱۹۱) وقف ضرورت سے ثابت ہو جاتا ہے

ان حضرات کے نزدیک اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ وقف کے ثبوت کیلئے مندرجہ بالا شرائط کا واقعی وجود ضروری نہیں ہے بلکہ ضرورت کے موقع پر ان شرائط کے بغیر بھی وقف ثابت ہو جاتا ہے، لیکن ان الفاظ کا یہ عام مطلب نہیں ہے، ان کا خاص مفہوم ہے، البحر الرائق میں وقف کے جو چوبیس کلمے شمار کئے گئے ہیں، ان میں بیسواں کلمہ ہے۔

العشرون. اشتروا من غلہ بیسواں کلمہ یہ ہے کہ میرا اس

داری هذه كل شهر  
بعشرة دراهم خبزا و  
فرقوه على المساكين صارت  
الدار وقفاً (البحر الرائق ۱/۱۹۱)

مکان کی آمدنی سے ہر مہینے دس درہم  
کی روٹی خریدی جائے اور اسکو مساکین  
پر تقسیم کر دیا جائے تو یہ مکان وقف  
ہو جائیگا۔

اس بیسویں کلمہ کی وضاحت میں ابن عابدین رحمہ اللہ حاشیہ منحة الخالق  
میں لکھتے ہیں۔

قال في الفقه . فرع ،  
يثبت الوقف بالضرورة  
وصورته ان يوصى بغلة  
هذه الدار للمساكين  
ابدا او فلان وبعده  
للمساكين ابدافان  
هذه الدار تصير وقفاً  
بالضرورة (منحة الخالق ۱/۱۹۱ وفتح القدير ۲/۲۱۹)

فتح القدير میں ہے (فرع) وقف،  
ضرورت بھی ثابت ہو جاتا ہے اور اس کی  
صورت یہ ہے کہ کسی خاص گھر کی آمدنی  
کی مساکین کے لئے ابدی طور پر وصیت  
کر دے یا وصیت کسی خاص انسان  
کے لئے اور اس کے بعد ابدی طور پر  
مساکین کے لئے کر دے تو بلاشبہ یہ  
گھر ضرورت وقف ہو جائیگا۔

مفہوم یہ ہے کہ یثبت الوقف بالضرورة کا مطلب عام نہیں ہے کہ ضرورت  
کے موقع پر شرائط کے بغیر بھی وقف کو ثابت مان لیا جائے بلکہ اس کی خاص صورت  
ہے کہ اگر مشکلم نے ایسے الفاظ استعمال کئے جن کو صحیح قرار دینا وقف ثابت کئے  
بغیر ممکن نہیں تو صحیح کلام کی ضرورت سے وقف ثابت مان لیا جائے گا، چند لائنوں کے  
بعد پیر وضاحت فرماتے ہیں۔

فقہاء نے اس مسئلہ میں یہ تصریح کی ہے  
کہ بیسویں کلمہ کے الفاظ بمعنی وقف کو  
ستلزم میں اور یہ ایسا ہی ہے جیسے  
یہ کہے کہ میں نے اپنا یہ گھرا پنہ مرنے  
کے بعد مساکین پر وقف کیا اور اس  
مسئلہ میں مجھے اصحاب کے درمیان  
اختلاف کا علم نہیں ہے

ونصوا فیہا ان ہذا اللفظ  
یودی الی معنی الوقف  
وصار کما لو قال وقفت  
داری ہذا بعد موتی  
علی المساکین ولا اعلم  
فیہا خلافا بین الاصحاب  
(سنۃ الخلق ج ۱۹)

اس کا مطلب واضح ہے کہ بیسویں کلمہ کی وضاحت میں فقہاء نے تصریح  
کی ہے کہ یہ معنی وقف کو مستلزم ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ گویا کہنے والا یہ  
کہہ رہا ہے کہ میں نے اس مکان کو مرنے کے بعد مساکین پر وقف کر دیا، اسی  
بیسویں کلمہ کی وضاحت میں الوقف یثبت بالضرورت کے الفاظ استعمال کئے  
گئے ہیں، جن کا خاص مفہوم یہ ہے کہ اگر واقف نے ایسے کلمات استعمال کئے ہیں  
جن کی تصحیح معنی وقفی کے بغیر ممکن نہیں تو وہاں تصحیح کلام کی ضرورت میں وقف  
ثابت مان لیا جاتا ہے، فتاویٰ شامی میں بھی یہ بحث درکنہ الالفاظ الخاصة  
کے تحت دی گئی ہے اور جتنی مثالیں ذکر کی گئی ہیں ان سب میں تصحیح کلام کی  
مجبوری میں وقف کو ثابت مانا گیا ہے۔ فتاویٰ شامی ج ۲۹

اس نقطہ نظر کے وکلاء کی میسر دیں عرف ہے، یعنی عرف کی بنیاد پر شرائط  
کے بغیر یا طرحت کے بغیر وقف تسلیم کر لیا جائے لیکن وقف کی بحثوں میں عرف کی بنیاد پر یہ مضمون  
فقہ کی کتابوں میں مذکور نہیں ہے، عرف کا ذکر وقف کے دوران فقہاء نے تین مقام

پر کیا ہے۔

پہلی جگہ یہ ہے کہ منقول اشیاء کے وقف کے سلسلے میں عرف معتبر ہے،  
یعنی جن اشیاء کے سلسلے میں عرف وقف کرنے کا ن کا وقف کرنا درست  
ہے اور جن اشیاء میں عرف نہیں ہے ان کا وقف کرنا درست نہیں ہے۔  
(فتاویٰ شامی ج ۲)

دوسری جگہ الفاظ وقف کے بارے میں ہے کہ جو الفاظ عرف میں وقف کے  
لئے استعمال کئے جاتے ہیں وہ وقف کے بارے میں معتبر ہوں گے۔  
یہ بحث فتاویٰ شامی میں نہایت اختصار کے ساتھ موقوفۃ کے لفظ  
کے ذریعہ وقف کرنے کے ذیل میں آئی ہے۔

تیسری جگہ یہ ہے کہ مسجد کے بارے میں عرف کی بنیاد پر تصریح کے بغیر  
وقف ممکن ہے، لیکن دوسرے امور میں عرف متحقق ہی نہیں ہے، فتح القدر  
میں ایک مسئلہ پر بحث کے دوران لکھتے ہیں۔

ونحن نقول ان العرف جار  
بان الاذن في الصلوة على وجه  
العصوم والتخلية يفيد الوقف  
على هذه الجهة فكان كالنعيذ  
فكان كمن قدم طعاما الى  
ضيفه نثر نثارا كان اذنا  
نر حله والتقاطه  
ہم کہتے ہیں کہ عرف چونکہ یہ رائج ہے کہ  
نماز کی عمومی اجازت اور عملاً جائیداد  
کو اس کام کے لئے خالی کر دینا اس  
جہت پر (یعنی مسجد کے طور پر) وقف  
کہلاتا ہے اس لئے یہ کلمہ وقف کے  
تلفظ کی طرح ہو جائیگا جیسے کوئی شخص  
ہمان کے سامنے کھانا رکھ دے یا رقم

بخلاف الوقف على  
الفقراء لم تجر عادة فيه  
بسجد التخلية والاذن  
بالاستغلال -

(فتح القدير ۲۲۲/۵)

کی بکیر کرے تو یہ کھانا کھانے اور بکیر  
کو چکنے کی اجازت شمار ہوتا ہے وقف  
علی الفقراء کا یہ حکم نہیں ہے کیوں کہ  
یہاں خالی کرنے اور اجازت دینے  
کی بنیاد پر استفادہ کی راہ قائم کرنے  
کی عادت (یعنی عرف) رائج نہیں ہے۔

اس عبارت سے یہ واضح ہے کہ مساجد کے بارے میں تو عرف کو قائم مقام  
تصریح کے مان لیا گیا ہے۔ لیکن دیگر امور خیرہ وقف کے سلسلے میں ایسا نہیں  
ہے، نیز یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ مساجد کے بارے میں فقہانے یہ تصریح بھی کی ہے  
کہ اس اجازت اور تخلیہ کے ساتھ کوئی امر منافی وقف نہ پایا جائے کیونکہ اجازت  
کے باوجود اگر کوئی بات منافی وقف پائی جائے گی تو وقف کی حقیقت متحقق نہ  
ہوگی مثلاً۔

ذكر الصدر الشهيد في  
الواقعات رجل له ساحة  
الابناء فيها امر قوما ان  
يصلوا فيها بجماعة فهذا  
على ثلاثة اوجه،  
احدها امان امرهم  
بالصلوة فيها ابدانصا

صدر شہید نے واقعات میں لکھا ہے  
کہ ایک شخص کی زمین جس میں تعمیر  
نہ ہوا اگر اس شخص نے اس زمین پر  
لوگوں کو جماعت سے نماز پڑھنے کی  
عام اجازت دیدی تو اس کی تین صورتیں  
ہیں، ایک صورت یہ ہے کہ وہ ابدی طور  
پر نماز پڑھنے کی صراحت کر دے مثلاً

بَان قَالَ صَلَوَاتُهَا اَبَدًا  
اَوْ اَمْرُهُو بِالصَّلَاةِ مُطْلَقًا  
وَنَوَى اِلَّا بِدَفْعِ هَذَيْنِ  
الْوَجْهَيْنِ صَارَتْ السَّاحَةِ  
مَسْجِدًا لَا يَوْرَثُ عَنْهُ  
وَأَمَّا اِنْ وَقَّتْ اَلْأَمْرُ بِالْيَوْمِ  
اَوِ الشَّهْرِ اَوِ السَّنَةِ فَفِي هَذَا  
الْوَجْهِ لَا يَصِيرُ السَّاحَةُ  
مَسْجِدًا لَوْ مَاتَ يَوْمًا  
عَنْهُ .

(فتاویٰ عالمگیری منہج ۱)

یہ کہہ دے کہ آپ حضرات یہاں ہمیشہ  
کے لئے نماز پڑھا کریں، یا دوسری  
صورت یہ ہے کہ نماز کا حکم تو مطلق ہو  
لیکن نیت ابد کی ہو تو ان دونوں  
صورتوں میں یہ جگہ مسجد بن جائیگی  
اور وراثت میں شامل نہ ہوگی، تیسری  
صورت یہ ہے کہ وہ اجازت کو موقت  
کر دے کہ ایک دن یا ایک ماہ یا ایک  
سال کیلئے نماز پڑھا کریں تو اس صورت  
میں زمین مسجد نہ ہوگی، اگر کہنے والے  
کا انتقال ہو جائے تو یہ جگہ اسکی وراثت  
میں شامل کی جائے گی۔

تیسری صورت میں ظاہر ہے کہ صرف توقیت کی قید، منافی وقف پائی  
گئی اور اسی لئے فقہاء نے اس صورت میں وقف تسلیم نہیں کیا، اسی طرح اگر  
منافی وقف کوئی اور بات پائی جائے گی جیسے تملیک یا نذر وغیرہ کے صفیے  
تو ان صورتوں میں بھی حقیقت وقف متحقق نہ ہوگی جیسا کہ یہ مضمون ثابت  
کیا جا چکا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس خصوصی چندہ میں ہتم کی حیثیت صرف وکیل بالشراء  
کی نہ ہو، بلکہ وہ چندہ مدرسہ میں داخل کر دیا جائے اس چندہ کے ذریعہ خرید کردہ



جائیداد کے وقف ہونے کا نقطہ نظر ہر اعتبار سے کمزور ہے، لیکن چونکہ یہ بھی ایک نقطہ نظر تھا اس لئے اس کی وضاحت بھی کر دی گئی اور ان کے جن دلائل کا علم ہوا ان کا بھی جائزہ لے لیا گیا (والعالم عندنا)

اس طرح کے خصوصی چندہ کے بارے میں دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس کے ذریعہ خرید کردہ جائیداد مدرسہ کی ملک ہے وقف نہیں ہے، اس نقطہ نظر کے مطابق توجیہ یہ ہے کہ معطلی نے رقم مدرسہ میں داخل کر دی تو اب مدرسہ اس رقم کا مالک ہو گیا اور معطلی کا اس سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا، بلکہ اگر معطلی رقم دیتے وقت کوئی شرط بھی لگائی تھی تو فقہاء کی تفسیر کے مطابق مستم کے قبضہ کرنے کے بعد ہبہ تام اور شرط فاسد ہے، زیادہ سے زیادہ اس کو ایک وعدہ قرار دیا جاسکتا ہے جس کی پابندی ایفاء وعدہ کے طور پر کی جائے گی، شرط کے طور پر نہیں کی جائے گی۔

اس طرح کا خصوصی چندہ چونکہ ہندوستان کے مدارس عربیہ سے پہلے نہیں تھا اس لئے یہ جزیئہ عربی کتابوں میں ملنا دشوار ہے، البتہ ہندوستان کے فقہاء و علماء نے اس سلسلے میں جو تحقیق ظاہر فرمائی ہے وہ مدرسہ شرف العلوم کانپور کے نزاع کے سلسلے میں موجود ہے، خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کے مفتی حضرت مولانا عبدلکریم صاحب نے معطلی کی رقم کے بارے میں لکھا

چونکہ اس رقم پر (پہلے) قبضہ کے بعد ہبہ تام ہو گیا تھا اور روپیہ مدرسہ کی ملک ہو گیا تھا (نظیرہ مافی العالمگیریۃ کتاب الوتف الفصل الثانی رجل اعطی درهما فی عمارۃ المسجد و نفقۃ المسجد او مصالح المسجد صح لانه

ان کا ان لا یمكن تصحیحه وقفاً یمكن تصحیحه تملیکاً بالهبة للمسجد او الملك للمسجد الخ اس بنا پر زمین مدرسہ کی طرف سے مدرسہ کے روپیہ سے خریدی گئی اور شیخ عبداللطیف (معطلی چندہ خصوصی) کی ملک میں زمین بالکل داخل نہیں ہوئی الخ :- (ضمیمہ عطر ہدایہ ص ۲۷۶)

معلوم ہوا کہ حضرت مولانا عبدالکریم صاحب رحمہ اللہ نے چندہ کو مدرسہ کے حق میں ہیہ قرار دیا اور اس کے ذریعہ خرید کردہ زمین کو بھی معطلی کی ملک میں داخل کئے بغیر، براہ راست مدرسہ کی ملک قرار دیا۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ نے اسی نزاع کے موقع پر اپنے فتویٰ میں تحریر فرمایا۔

:- یہ بعینہ ایسی صورت ہے کہ ایک ادارہ قومیہ دینیہ کا ناظم ایک مالدار کے پاس جاتا ہے کہ میرے مدرسہ کو فلاں زمین یا عمارت کی ضرورت ہے وہ اس کو روپیہ دیکر کہتا ہے کہ اس زمین یا مکان کو خرید لو، شرعاً یا عرفاً یہ معاملہ اس معنی میں سمجھا جائیگا کہ مالدار نے یہ نقود اس ادارہ کو ہیہ کر دئے ہیں اور یہ روپے اس کی ملک سے نکل کر اس ادارہ کے ہو گئے ہیں (ایضاً ص ۲۸۱)

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے اس عبارت میں ناظم مدرسہ یا مہتمم کو معطلی کا وکیل بالشرع قرار نہیں دیا، بلکہ انھوں نے صراحت فرمائی کہ یہ رقم مدرسہ کیلئے ہیہ ہو گئی اور معطلی کی ملکیت سے نکل کر یہ رقم مدرسہ کی ملک میں داخل ہو گئی ہے۔

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب لکھنوی رحمہ اللہ نے اس رقم کے بارے میں تحریر فرمایا۔

۱۔ مال متصدق (بالفتح) کے متصدق علیہ یا اس کے وکیل یا نائب یا سفیر کے قبضے میں آجانے سے رہبہ تام و لازم ہو جاتا ہے اور متصدق (بالفتح) ملک متصدق (بالکسر) سے نکل کر ملک متصدق علیہ میں آجاتا ہے اور متصدق کو اس کے واپس لینے کا اختیار باقی نہیں رہتا۔ اس لئے زرِ ثمن ملک معطی سے نکل کر ملک مدرسہ میں آگیا۔ (ایضاً ص ۲۸۳)

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب رحمہ اللہ نے بھی خصوصی چندہ کو معطی کی ملک قرار نہیں دیا، بلکہ مستم یا اس کے نائب کے قبضہ کر لینے کے بعد یہ رقم مدرسہ کی ملک میں آگئی۔ گویا مندرجہ اکابر علماء اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ زمین کی خریداری کیلئے جو خصوصی چندہ ارباب خیر سے لیا جاتا ہے وہ حقیقت کے اعتبار سے معطی کی ملک سے خارج ہو کر مدرسہ کی ملک بن جاتا ہے اور اب اس رقم سے جو جائیداد بھی خریدی جاتی ہے وہ مدرسہ کی ملک ہوتی ہے، اس دوسرے نقطہ نظر پر از روئے فقہ کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔

## مدرسہ کی املاک کا حکم

آخر میں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مدرسہ یا مسجد کی جو جائیدادیں وقف نہیں ہیں، بلکہ شرائط وقف پائے نہ جانے کے سبب انھیں مدرسہ یا مسجد کی

ملکیت قرار دیا گیا ہے، ان پر کسی انسان کا مالکانہ تصرف قائم کرنا جائز نہیں ہے بلکہ مدرسہ اور مسجد کی ان املاک کا تحفظ بھی وقف ہی کی طرح ضروری ہے، یتیم کی جائیداد اور بیت المال کی زمینوں کے بارے میں صراحت موجود ہے۔

ثما ان ارض الیتیم فی حکم  
ارض الوقف کما ذکرہ فی الجوہرۃ  
وافتی بہ صاحب البحر وکذا  
ارض بیت المال کما افقی بہ  
فی الخیریۃ وقال من کتاب  
الدعوی ان اراضی بیت المال  
جرت علی رقبۃہا احکام  
الوقوف الموبدۃ (فتاویٰ شاہی ج ۲۲)

پھر یہ کہ یتیم کی زمین، وقف کی زمین کے  
حکم میں ہے جیسا کہ جوہرہ میں مذکور ہے  
ابحار الریق کے مصنف نے یہی فتویٰ دیا ہے  
اور ایسے ہی بیت المال کی زمین کا بھی  
یہی حکم ہے، فتاویٰ خیرہ میں یہی ہے  
اور انھوں نے کتاب لدعویٰ میں فرمایا ہے  
کہ بیت المال کی اراضی پر ابدی اوقاف  
کے احکام جاری ہیں۔

معلوم ہوا کہ شرائط پائے نہ جانے کے سبب وقف قرار نہ دینا، ایک  
اصطلاحی بات ہے، جہاں تک ان املاک کے تحفظ یا ان کے استعمال میں دیانت  
وامانت کو ملحوظ رکھنے کا معاملہ ہے تو اس سلسلے میں مدارس عربیہ یا مساجد کی  
جائیدادیں وقف ہی کی طرح ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ اوقاف کی تولیت میں جاری  
دراشت کا حکم، املاک میں باقی نہیں رہتا۔ واللہ اعلم۔

هذا اخر ما اردنا ايرادہ فی هذا الكتاب واللہ

الموفق وهو المستعان

# ضمیمہ

فقیر العصر حضرت مفتی محمد حسن صاحب، دامت برکاتہم  
 علماء دیوبند میں اس وقت سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شورئی کی  
 شرعی حیثیت، ان حضرات زید مجدہم کی جماعت اور اصلاح کے بعد  
 ہدیہ ناظرین کے جارہی ہے، آخر میں مناسب معلوم ہوا کہ حضرت موصوف  
 کا ایک فتویٰ بھی ضمیمہ کے طور پر شائع کر دیا جائے، یہ فتویٰ ۱۳۷۵ھ میں  
 دیا گیا تھا لیکن اس کے بیشتر اجزاء زیر بحث موضوع سے متعلق ہیں  
 اسلئے انشاء اللہ اس فتویٰ کی روشنی میں زیر بحث موضوع کو سمجھنا آسان ہوگا

## استفتاء

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حضرت والا! دامت برکاتہم۔ سلام مسنون

ہمارے یہاں کئی سال ہوئے چند اہل خیر حضرات نے مسلم بچوں کی  
 دینی تعلیم و تربیت کے لئے مدرسہ قائم کرنے کا مشورہ کیا اس پر متفق ہو کر  
 کام شروع کر دیا گیا، زمین حاصل کی گئی، چندہ جمع کیا گیا، نقشہ میونسپلٹی سے  
 منظور کرا کے تعمیر شروع کر دی گئی، اللہ تعالیٰ نے مدد فرمائی مدرسہ بن گیا،  
 اس کی ضروریات (دارالاقامہ و مطبخ و غیرہ بھی) فی الجملہ تیار ہو گئیں، یہ سب کام  
 مجلس تنظیمیہ کے تحت ہوا اور یہ طے پایا کہ مدرسہ کیلئے اساتذہ اور دیگر  
 ملازمین کا تقرر و عزل و نصب اور ان کی تنخواہوں کا اور عہدوں کا تعین وغیرہ

تمام چیزیں مجلس انتظامیہ کیا کرے گی، مجلس انتظامیہ میں اکثر اہل علم ہیں بعض غیر عالم ہیں تعمیر وغیرہ کی دیکھ بھال کے لئے ہیں مگر سب اہل فہم و اہل تدین ہیں، اساتذہ و ملازمین کا تقرر ہو گیا، طلبہ داخل ہوئے اور تعلیم شروع ہو گئی، مدرسے متعلق ایک مسجد بھی تعمیر کی گئی، مسجد کے لئے ایک امام صاحب کو رکھا گیا، ایک صاحب کو مدرسے کا مہتمم تجویز کیا گیا، مہتمم صاحب کو تمام حسابات آمد و خرچ درست رکھنے کا ذمہ دار بنایا گیا مجلس انتظامیہ گاہے گاہے عامۃً تین ماہ گزرنے پر حسابات کی جانچ کرتی رہی اور مدرسہ کیلئے جائیداد خرید کر اور وقف دے کر آمدنی کی صورتیں بڑھاتی رہی، مہتمم صاحب کی کوتاہیوں پر حسن ادب کیساتھ توجہ دلاتی رہی مگر مہتمم صاحب نے کوتاہیوں کی اصلاح نہیں فرمائی جس سے نظام متاثر ہوا بار بار توجہ دلانے پر مہتمم صاحب نے اپنا رخ بدلا اور فرمایا کہ میں مختار کل ہوں، آپ لوگوں کی حیثیت تو صرف مشیر کی ہے میرا دل چاہے تو کسی بات میں مشورہ کروں نہ دل چاہے تو مشورہ نہ کروں، اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ میں آپ کے مشورہ پر عمل کروں، اب بحث یہ شروع ہو گئی کہ صاحب اختیار مہتمم صاحب ہیں کہ جس کو چاہیں ملازم رکھیں جس کو چاہیں الگ کر دیں، یا مجلس انتظامیہ جس کو مشیر یا مجلس شوریٰ بھی کہا جاتا ہے۔

ادھر مسجد کے امام صاحب نے بھی فرمایا کہ امام پر نکتہ چینی کرنے کا کسی کو حق نہیں، نماز پڑھانے والا صرف ایک شخص ہوتا ہے جو کہ مصلیٰ پر کھڑا ہوتا ہے وہی امام ہے بقیہ سب لوگ ارکان شوریٰ وغیرہ مقتدی ہیں سب امام کی حرکت و سکون کے تابع ہیں، کسی کو اختلاف کرنے کا حق نہیں ہے، اگر امام نماز میں غلطی



بھی کرتا ہے تو اس میں بھی امام کا اتباع لازم ہے۔ اگر امام میں کوتاہی ہو تو اس کو بھی برداشت کرنا ضروری ہے۔

ہستم صاحب اور امام صاحب نے مل کر ایک مقالہ تیار کیا جس میں اپنا اپنا اقتدار اعلیٰ ثابت کیا ہے اور سب کو اپنا کلیتہً ماتحت اور تابع قرار دیا۔ مقالہ طویل ہے اس میں غیر دینی سیکور عبودہ داروں کا تذکرہ بطور مثال و دلیل کیا ہے مثلاً کلکٹر ایک، وٹا ہے اور تمام حکام ضلع اسے ماتحت اور تابع ہوتے ہیں گورنر ایک، وٹا ہے، اسٹرن ایک، وٹا ہے وزیر اعظم ایک، وٹا ہے وغیرہ وغیرہ ان مثالوں کو بطور دلیل بیان کیا ہے ان کے متعلق تو ہمیں کچھ نہیں پوچھنا کیونکہ ظاہر ہے کہ یہ مثالیں شرعی مسائل کی بنیاد نہیں نہ حکومت نے کبھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہماری حکومت شرعی حکومت ہے بلکہ وہ تو بار بار اعلان کر چکی ہے کہ یہ لادینی حکومت ہے، جو شخص لادینی نظام پر دینی نظام کو قیاس کرنا چاہے ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ لغویت کیا ہوگی۔ اس کے جواب کی تو ضرورت نہیں کیونکہ کوئی سمجھ دار آدمی اس مغالطہ میں نہیں آئیگا۔ البتہ مقالہ کے بعض مندرجہ امور سے شبہ ہوتا ہے ان کے متعلق دریافت کرنا ہے۔

① گھر کا امیر باپ ہوتا ہے اولاد سب تابع ہوتی ہے، اولاد کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ ہم کماتے ہیں آپ ہمارے نوکر کی حیثیت سے رہتے، گھر کی خدمت انجام دیجئے اور جو کچھ ہم اس کے معاوضہ میں دیں لیکر کھالیا کیجئے۔

② حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہم امور میں حسب ارشاد باری تعالیٰ

صحابہ سے مشورہ کیا پھر جو کچھ شرح صمد ہوا اس پر عمل کیا صحابہ کی رائے یا ان کی کثرت رائے کے پابند نہیں ہوئے۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے مشورہ کیا آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کے سلسلہ میں مگر ملائکہ کی رائے کے خلاف عمل کیا، اس سے معلوم ہوا کہ امیر مجلس شوریٰ کا پابند نہیں۔

(۴) کیا امیر کی اطاعت ہر کام میں لازم ہے جبکہ وہ معصیت نہ ہو

(۵) کیا امیر کی کسی غلطی پر توجہ دلانا شرعاً حرام اور بغاوت ہے۔

(۶) کیا امیر پر اعتراض کرنے والا اور اس کی رائے سے اختلاف کرنے

والا واجب القتل یا مستحق قتل ہے، اسلاف میں اس کے کچھ نظائر ہوں تو پیش فرمائیں۔

(۷) ہستم صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ ہستم کی حیثیت سلطان وقت کی ہے کہ اس کو

پورے اختیارات حاصل ہیں البتہ اسکے پاس فوج، پولیس، خزانہ نہیں ہے

اس لئے وہ شرعی سزائیں نہیں دے سکتا، اس حد تک وہ سلطان معذور ہے

(۸) کیا امام نماز کے لئے بھی ایسا ہی اقتدار ہے کہ مقتدی اس کی تمام غلطیوں

میں اتباع کرنے پر مجبور ہے۔

(۹) اگر مقتدی امام صاحب کی غلطیوں کی وجہ سے ان کے پیچھے نماز پڑھنے

سے ناخوش ہوں تو ایسی حالت میں امام صاحب کا جبراً نماز پڑھانا اور کہنا کہ

مجھے کوئی الگ نہیں کر سکتا کہاں تک درست ہے۔

(۱۰) کیا کثرت رائے کسی حالت میں بھی معتبر نہیں اور یہ غیر دینی طریقہ ہے اس

پر عمل کرنے سے گناہ ہوگا

① امام صاحب، مہتمم صاحب، ملازم صاحب، کو کسی بھی حالت میں برطرف کیا جاسکتا ہے یا وہ ہر حالت میں اپنے عہدوں پر تاحیات برقرار و تنخواہ دار رہیں گے۔

(نوٹ ہے) سوالات طویل ہو گئے مگر امید ہے کہ ہماری مجبوری کو مد نظر رکھتے ہوئے مدلل مفصل جوابات تحریر فرمائیں گے، ان اطراف میں مہتمم صاحب کے اس مقالہ سے بڑا خلفشار ہو رہا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

والسلام

مسعود عالم

## الجواب سے واللہ الہادی سے الی الصواب

محرمی و علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ  
نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

①

باپ سے متعلق یہ خیال اور قول صحیح ہے، باپ کا ورثہ جتنے بھی متعدد آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کا حکم فرماتے ہوئے والدین کے ساتھ احسان کا بھی حکم فرمایا ہے جیسے وقضی ربک ان لا تعبدوا الا ایاہ دجالوا الدین احسانا۔ نیز حدیث شریف میں ہے انت ومالک لوالدیک امه وکلوة لک اور فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر ایک شخص نے ایک دکان شروع کی پھر اس کا

بیٹا بھی اس میں کام کرنے لگا جس سے ترقی ہوئی، پھر باپ بوڑھا ہو گیا کام کے قابل نہیں رہا تو بیٹا یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں دکان کا مالک ہوں یا اس میں شریک و حصہ دار ہوں کیونکہ میری محنت سے ترقی ہوئی ہے، بلکہ وہ دکان باپ کی ملکیت ہوگی اور بیٹا معاون شمار ہوگا، نیز بیان کیا ہے کہ بیٹے کے لئے جائز نہیں کہ باپ سے ملازم کی طرح خدمت لے کر یہ احترام والد کے خلاف ہے، لیکن اس سے مسئلہ ہتھم پر استدلال کرنا غلط اور مغالطہ ہے کیونکہ باپ تو اصل ہوتا ہے اور اولاد اس کے ذریعہ وجود میں آتی ہے وہ اولاد کی پرورش کرتا ہے تعلیم و تربیت کرتا ہے۔

مدرسہ میں شوریٰ کا وجود منصب پہلے ہے اس نے اہتمام کا منصب تجویز کیا اور ہتھم صاحب کو لا کر بٹھایا اور ان کے لئے تنخواہ تجویز کی، پس ہتھم مدرسہ اور شوریٰ کا حال باپ اور اولاد کے حال سے بالکل برعکس ہے۔

(۲)

حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے رسول اور مؤید بالوحی ہونے کے باوجود حکم خداوندی و شاد رہم فی الابرار کے تحت اہم امور میں صحابہ سے مشورہ بھی فرمایا اور فاذا عزمتم فتوکل علی اللہ کے تحت شرح صدر پر عمل بھی فرمایا اور بعض مواقع میں اپنی رائے عالی کو صحابہ کی دجوئی کے پیش نظر ترک بھی فرمایا غزوہ احد کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے مدینہ طیبہ سے باہر جاکر جنگ کرنے کی نہیں تھی مگر شہادت کے شوقین صحابہ کی رائے کو اختیار فرمایا غزوہ خندق کے موقع پر آپ کی رائے مناسبت کی تھی مگر انصار کے دو قبیلوں

کے سرداروں کی رائے نہیں ہوئی، آپ نے ان کی رائے کو قبول فرمایا۔

من قال لا اله الا الله، کے لئے جنت کی خوشخبری سنانے کے واسطے حضرت ابو ہریرہؓ کو نعلین شریفین دے کر بھیجا لیکن حضرت عمرؓ کی رائے نہیں ہوئی، آپ نے اپنی رائے عالی کو ترک فرمادیا، یہ سب واقعات کتب احادیث صحاح میں صاف صاف مذکور ہیں، ظاہر یہ ہے کہ ان مواقع پر صحابہ کی رائے پر شرح صدر اور عزم ہو گیا نبی کا مقام اتنا بلند ہے کہ وہاں غلط چیز پر شرح صدر نہیں ہو سکتا کیونکہ وحی الہی عاصم و محافظ ہے۔

لیکن مجلس شوریٰ اور مہتمم کو اس پر قیاس کرنا غلط در غلط ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رفیع مقامات آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تزکیہ اور فیض صحبت کی بدولت حاصل ہوئے يتلوا علیہم وایتہ ویزکیہم وיעلمہم الکتاب والحکمۃ صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منصب رسالت نہیں دیا بلکہ اللہ اعلم حیث يجعل رسالته پھر مہتمم کے منصب اتہام کو جو کہ شوریٰ کا دیا ہوا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب رسالت پر کیسے قیاس کیا جاسکتا ہے، استغفر اللہ العظیم۔

(۳)

جماعت ملائکہ کے لئے مجلس شوریٰ کا لقب بڑا عجیب لقب ہے، اور آیت قرآنی واذ قال ربك للملائكة اني جاعل في الارض خليفه، کا مطلب مشورہ طلب کرنا عجیب در عجیب ہے، نہ یہاں شوریٰ ہے نہ مشورہ ہے لہذا یہ نتیجہ نکالنا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ ملائکہ کی شوریٰ کے پابند نہیں اسی طرح مہتمم

بھی مدرسہ کی شوریٰ کا پابند نہیں بالکل بے محل ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر اپنا خلیفہ بھیجے کیلئے ملائکہ سے اپنا ارادہ ظاہر فرمایا کہ جس طرح دیگر کائنات سے متعلقہ خدات ملائکہ کے سپرد ہیں اس خلیفہ سے متعلقہ خدات ہیں ان کے سپرد کی جائیں گی ملائکہ کو تخلیق آدم کی حکمت کا علم نہیں تھا اس لئے انھوں نے اپنے منصب سے بڑھ کر بات کی جس پر ان کو جواب دیا گیا اذیٰ اعلم ما لا تعلمون پھر انھوں نے اعتراف قصور کیا۔

حق تعالیٰ خالق ہیں، ملائکہ مخلوق ہیں، خالق کو مخلوق سے مشورہ لینے کا کیا محل ہے، اللہ پاک کا علم ذاتی ہے، ملائکہ کا علم حصولی (اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا) ہے پھر وہاں مشورہ کی کیا گنجائش ہے، ملائکہ کو ملائکہ اللہ نے بنایا، اللہ تعالیٰ کو اللہ تعالیٰ ملائکہ نے نہیں بنایا کیا مدرسہ کے مہتمم اور شوریٰ کا بھی یہی حال ہے نعوذ باللہ من شرور انفسنا۔



امیر (سلطان) کی اطاعت واجب ہے جب کہ موافق شرع ہو  
معصیت نہ ہو امر السلطان ینفذ اذا وافق الشرع والا فلا۔ اشباہ  
من القاعدۃ الخامسة وفوائد شتی فلوامر قضائہ بتعلیف الشہود  
وجب علی العلماء ان ینصحوہ ویقولوا لا تکلف قضائک الی امر  
یلزم منه من خطک او سخط الخالق او در مختار و فی ط عن الحموی  
ان صاحب البحر ذکر ناقلان عن ائمتنا ان طاعة الامام فی غیر معصیۃ



واجبۃ فلوا مر بصرکم یومہ و جب اہ شامی ۲۲۲۔ لیکن اگر اکثر کے نزدیک  
امام کی رائے میں ضرر ہو تو اکثر کی رائے کا اتباع کیا جائے قال فی الملتقی و  
ینبغی للامام ان یرض الجیش عند دخول دار الحرب یعلو الفارس  
من اللہجل قال فی شرحہ وان یکتب اسماءہم وان یومر علیہم من کان  
بصیرا بامور الحرب وتذبیرہا ولو من الموالی وعلیہم طاعتہ لان مخالفتہ  
الامیر حرام الا اذا اتفق اکثر انہ ضرر یتبع اہ شامی ۲۲۲۔

⑤

نہ بغاوت ہے نہ حرام ہے بلکہ ضرر سے بچانے کیلئے خواہ ضرر دنیوی ہو  
یا اخروی امیر کو نصیحت کرنا علماء کے ذمہ واجب ہے جیسا کہ ۲ میں گذرا۔  
وجب علی العلماء ان ینصحوا ۱۱

⑥

عن حذیفۃ بن یمان قال قلت یا رسول اللہ! ینبغی لک ان تأخذ بالحدود  
شربا کان قبلہ شر قال نعم قال فما العصمة قال السیف قلت و  
هل بعد السیف بقیۃ قال نعم تكون امارۃ علی اقداء وھدنة علی  
دخول قلت ثم ما اذا قال ثم ینشأ دعاۃ الضلال فان کان للہ فی  
الارض خلیفۃ جلد ظہرک و اخذ مالک فاطعہ والافنت وانت  
عاض علی جذل شجرة الحديث ۱۱ اس کی شرح مرقاۃ ۱۲۳ میں ہے ایک  
ہی شخص کو ایک وقت رفع شرکیئے سیف (قتال) کا حکم دیا اور دوسرے وقت  
میں جسمانی و مالی اذیت و ظلم کو برداشت کرتے ہوئے اطاعت امیر و خلیفہ کا حکم دیا

نیز کلمہ حق عند سلطان جائز کو افضل الجہاد قرار دیا، کذا فی شرح الجامع الصغیر<sup>۱</sup>۔  
چند واقعات و اقوال امراء (خلفاء) کے نقل کئے جاتے ہیں، جن سے معلوم ہوگا کہ امیر کی رائے سے اختلاف اور امیر پر اعتراض کی ان کے یہاں کیا سزا اور کتنی قدر تھی، سب سے اول اور سب سے افضل خلیفہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں جب وہ خلیفہ ہوئے تو خطبہ دیا اور فرمایا شو تکلم ابو بکر فحمد اللہ واثنی علیہ شو قال اما بعد ایہا الناس فانی قد ولیت علیکم ولست بخیر کوفان احسنت فاعینونی وان اسأتفقومونی ۱ تاریخ الخلفاء ۲ فاذا رأیتمونی استقمیت فاتبعونی و اذا رأیتمونی زغت فقومونی ۳ تاریخ الخلفاء ۴ یعنی اگر میں سیدھا سیدھا چلوں تو میرا اتباع کرو اور میری امانت کرو، اگر میں ٹیڑھا پن اختیار کروں تو اس میں میرا اتباع مت کرو بلکہ مجھے ہی سیدھا کرو۔

اسی ارشاد سے امام مالکؒ نے نتیجہ نکالا قال مالک لا یكون احد اماما ابدا الا على هذا الشرط ۵ تاریخ الخلفاء ۶ کوئی شخص کبھی بھی امام نہیں بن سکتا مگر اسی شرط کے ساتھ جو خلیفہ اول نے بیان فرمائی، خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا لا تزیدوا فی مہلور النساء علی اربعین اوقیۃ فمن زاد القیت الزیادۃ فی بیت المال فقالت امرأة ما ذالک الیک قال ولم قالت لان الله يقول و آتیتم احدا من قنطارا فقال عمرو۷ امرأة اصابک ورجل اخطأ ۸ مرقاة المفاتیح ۹ ۱۰ ایک عورت نے امیر المؤمنین کی رائے سے اختلاف کیا اس کی قدر فرمائی عتاب نہیں فرمایا۔

عزابی وائل قال جلست مع شيبه على الكرسي في الكعبة فقال  
لقد جلس هذا المجلس عمر فقال لقد هممت ان لا ادع فيها صفراء  
ولا بيضاء الا قسمت قلت ان صاحبك لو يفعل قال هما امران  
اقتدى بهما - بخاری شریف باب کسوة الکعبة ۱۷ - یہاں بھی کوئی عتاب  
نہیں فرمایا بلکہ اپنی رائے کو ترک فرمایا۔

وعن ثور الكندي ان عمر بن الخطاب كان يعس بالمدينة  
من الليل فسمع صوت رجل في بيت يتغنى فتسور فوجد عند امرأة  
وعنده خمر فقال يا عدو الله اظننت ان الله يترك وانت على  
معصية فقال وانت يا امير المؤمنين لا تعجز عني ان اكر عصيت الله  
واحدة فقد عصيت الله في ثلاث قال الله تعالى ولا تجسسوا وقد  
تجسسست وقال واتوا البيوت من ابوابها وقد تسورت على ودخلت  
على بغير اذن وقال الله تعالى لا تدخلوا بيوتا غير بيوتكم حتى  
تسئلوا وتسئلوا على اهلها قال عمر فهل عندكم من خير ان  
عفوت عنكم قال نعم فعفى عنه وخرج وتركه امه ازالته الخفاء ۲۲  
دیکھئے یہاں نہ صرف اختلاف کیا بلکہ کتنی سخت گرفت کی لیکن حضرت عمرؓ نے  
سزا نہیں دی۔ خلیفہ ہونے کے بعد خطبہ دیا، اسی خطبہ میں فرمایا۔

وروي انه قال يوما على المنبر يا معاشر المسلمين ماذا تقولون  
لو ملت براسي الى الدنيا كذا وصيّل رأسه فقام اليه رجل فاستل سيفه  
وقال اجل كذا نقول بالسيف كذا واشار الى قطعه فقال اباي

تعنی بقولک قال نعم ایاک اعنی بقولی فنهراً عمر ثلثا وهو بنهر  
عمر فقال عمر رحمک اللہ الحمد للہ الذی جعل فی رعیتی من اذا  
تعویجت قومنی - ازالۃ الخفاء جلد چہارم مترجم -

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دن منبر پر ارشاد فرمایا، اے مسلمانوں کے  
گروہو! تم کیا کرو گے اگر میں اپنا سر دنیا کی طرف جھکا لوں۔ اس طرح وہ اور  
اپنے سر کو جھکایا۔ ایک شخص کھڑا ہوا اور تلوار کھینچ کر بولا کہ ہاں پھر ہم اپنی  
تلوار سے اس طرح کر دیں گے اور گردن کاٹنے کا اشارہ کیا، حضرت عمر رضی اللہ  
عنہ نے فرمایا (استحاثاً) کیا تو اپنے قول سے مجھے ہی مراد لے رہا ہے، اس نے کہا  
ہاں، میں اپنے قول سے آپ ہی کو مراد لے رہا ہوں حضرت عمرؓ نے اسکو تین  
مرتبہ جھڑکا وہ حضرت عمرؓ کو جھڑکتا رہا اس کے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا۔  
اللہ تجھ پر رحم کرے۔ اللہ کا شکر ہے جس نے میری رعیت میں ایسے شخص  
کو رکھا کہ اگر میں ٹیڑھا ہو جاؤں تو وہ مجھے سیدھا کر دے۔

قال عمرؓ فی مجلس فیہ المهاجرون والانصار اراہتم لو ترخصت  
فی بعض الامور ماذا کنتم فاعلین فسکتنا فقال ذلک مرتین او ثلثا  
لو ترخصت لکم فی بعض الامور ماذا کنتم فاعلین قال بشر بن سعد  
لو فعلت ذلک لقومناک تقویو القدح فقال عمرؓ انتم اذا انتم  
ازالۃ الخفاء جلد چہارم مترجم -

حضرت عمرؓ نے خلیفہ ہوتے ہی عام اجازت دی کہ میری جو بات قابل  
اعتراض ہو سر دربار مجھے ٹوک دیا جائے، آپ کی طرف سے اعلان دیا گیا کہ

احب الناس الى من رفع الى عیوبی یعنی سبک زیادہ میں اس شخص کو پسند کروں گا جو میرے عیوب پر مجھے اطلاع دے اس کے بعد ادنیٰ ادنیٰ لوگوں نے سر دربار آپ پر نکتہ چینی شروع کی، اگرچہ وہ نکتہ چینی غلط ہوتی تھی مگر آپ اس پر خوش ہوتے تھے اور بڑی توجہ سے سنتے تھے اور اس کا جواب دیتے تھے اہ سیرت فاروق اعظم ۱۵۔

آپ خطبہ پڑھنے کیلئے تشریف لائے تو حضرت سلمان فارسیؓ نے ٹوکا۔  
 انت برود من الیمن الی عربین الخطاب فقسمها بین اصحاب رسول اللہ  
 صلی اللہ علیہ وسلم برداً برداً ثم صعدا المنبر یوم جمعة فخطب الناس  
 فی حلة منها والحلة عند العرب ثوبان من جنس واحد وکان ذلک  
 من احسن زیہم فقال الا اسمعوا ثم وعظ الناس فقام سلمان فقال  
 واللہ لا نسمع واللہ لا نسمع قال وما ذالک قال انک اعطیتنا ثوباً ثوباً  
 ورحمت فی حلة فقد تفضلت علینا بالدنیا فتبستو قال عجبت  
 یا ابا عبد اللہ رحمک اللہ انی کنت غسّلت ثوبی الخلق فاستعرت  
 بؤد عبد اللہ بن عمر فلبسته مع بردی فقال سلمان الآن نسمع۔

(ازالۃ الخفاء ۱۲۱ جلد چہارم مترجم)

قال ابن عون کان الرجل یقول لمعاویۃ واللہ لتستقیم بنایا  
 معاویۃ او لنقومنک فیقول بماذا فیقول بالخشب فیقول اذا نستقیم  
 تاریخ الخلفاء ۱۲۹ دیکھئے حضرت معاویہؓ کو کتنا سخت کلمہ کہا مگر انھوں نے  
 کیا معاملہ کیا۔

یزید کو جب ولی عہد بنانے کا قصہ پیش آیا، حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر اور  
 حضرت عبداللہ بن عمر سے گفتگو کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر کا نمبر آیا تو  
 ارسل الی ابن الزبیر فقال یا ابن الزبیر انما انت ثعلب روافع علما خرج  
 من حجر دخل فی آخر و انت عمدة الی ہذین الرجلین فنفخت فی  
 منازحہما وجعلتہما علی غیر راثیہما فقال ابن الزبیر ان کنت قد مللت  
 الامارة فاعتزلہما وھلم ابنک فلنبایعہ ارأیت اذا بايعت ابنک معک  
 لا یکما نسمع ونطیع لا تجتمع البیعة کما ابدلہ۔ تاریخ الخلفاء ۱۵۰ و ۱۵۱  
 غور کیجئے۔ اور جاریہ بن قدامہ کا مکالمہ حضرت معاویہؓ سے کتنا سخت ہے اس کو  
 بھی دیکھئے۔ فیہا ان قواثر السیوف التي لقیناک بہا بصفین فی ایدینا  
 قال (معاویہؓ) انک لتهددنی قال انک لو تملکن اقصرہ ولم تفتحنا  
 عنوة ولكن اعطینا عھودا و مواتیق فان وفیت لنا و فینا وان ترغب  
 الی غیر ذلک فقد ترکنا وراثنا رجلا مداما و ادر عا شلدا و السنة  
 حداد فان بسطت الینا ختوا من عذر و لقنا الیک بباع من ختر قال  
 معاویہؓ لا اکثر اللہ فی امثالک اہ۔ تاریخ الخلفاء ۱۵۲۔

یزید الناقص ابو خالد بن الولید نے جو خطبہ دیا اس میں صاف صاف  
 اعلان کیا فان اردتو بیعتی علی الذی بذلت لکم فانا لکم وان ملت  
 فلا بیعتہ لی علیکم و ان رأیتم احد الاقوی منی علیہا فانا اول من  
 یبایعہ و یدخل فی طاعته و استغفر اللہ لی و لکم اہ تاریخ الخلفاء ۱۵۳۔  
 دیکھئے ان اکابر اسلاف کے پاس فوج اور پولیس بھی تھی بیت المال کا خزانہ بھی



تھا مگر اپنے سے اختلاف کرنے والوں اور اعتراض کرنے والوں کو قتل نہیں کیا نہ قید کیا بلکہ غایت تحمل سے کام لیا اور تاکیدی اعلانات کئے کہ ہم سے جو کوتاہی ہو جائے وہ بلا خوف ہمارے سامنے پیش کر دو تاکہ ہم اس کی اصلاح کریں۔ اگر اختلاف کرنے والے کو قتل کرنا واجب ہوتا تو یہ حضرات قدرت کے باوجود ترک واجب کا گناہ اپنے سر نہ لیتے۔

(۸)

امام کا مقام بہت بلند ہے، اس کو حق جل شانہ کی بارگاہ میں اپنا نمائندہ بنا کر نماز ادا کی جاتی ہے وہ اعلیٰ صفات کے ساتھ متصف ہونا چاہئے، احکام نماز کا وہاں سب سے زیادہ عالم ہو، قرآن کریم تجوید کے ساتھ صحیح پڑھتا ہو، سب سے زیادہ متقی ہو وغیرہ وغیرہ الا حق بالامامة تقدیماً بل نضبا الاعلم باحكام الصلوة بشرائط اجتنابه للفواحش الظاهرة ثم الاحسن تلاوة وتجويد للقراءة ثم الادراع ای الاكثر اتقاء للشبهات ام درمختار علی هامش رد المحتار ۳/۲۱۱

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ امام نے بھول کر غلطی کی تو مقتدی کو اس غلطی میں بھی اتباع لازم ہوتا ہے تاکہ امام کی مخالفت فعلاً لازم نہ آئے مثلاً قنوت، تکبیرات العید، قعدہ اولیٰ سجدہ سہو، سجدہ تلاوت اگر امام ترک کر دے تو مقتدی بھی اتباع امام میں ترک کر دے امام کی مخالفت نہ کرے تجب متابعت الامام فی الواجبات فعلاً وکذا ترکاً ان لازم من فعلہ مخالفة الامام فی الفعل کترک القنوت او تکبیرات العید او القعدة

الاولیٰ اوسجود السہو والتلاوة فیترکہ الموتع ایضاً شامی ص ۲۱۶۔  
لیکن ہر غلطی کا یہ حکم نہیں ہے۔

جو امور بدعت ہوں یا منسوخ ہوں یا نماز سے ان کا تعلق نہ ہوا نہیں  
امام کا اتباع نہیں کیا جائیگا، مثلاً ایک سجدہ زائد کرے یا تکبیرات عید میں اقوال  
صحابہ پر زیادتی کرے یا نماز جنازہ میں چار سے زائد تکبیر کہے یا پانچویں رکعت  
کے لئے بھول کر کھڑا ہو جائے تو ان صورتوں میں امام کا اتباع نہیں کیا جائیگا  
وانہ لیس لما ان یتابعہ فی البدعة والمنسوخ وما لا تعلق له بالصلوة  
فلا یتابعہ لوزاد سجدة او زاد علی اقوال الصحابة فی تکبیرات لعیدین  
او علی اربع فی تکبیر الجنازة او قام الی الخامسة اھ شامی ص ۲۱۶۔

سنن میں فعلاً و ترکاً اتباع واجب نہیں مثلاً امام تکبیر تحریمہ کے لئے رفع  
یدین نہ کرے یا ثناء نہ پڑھے یا رکوع و سجود کے لئے تکبیر نہ کہے یا سبحان ربی  
العظیم اور سبحان ربی الاعلیٰ نہ پڑھے یا سمع اللہ من حمدہ نہ کہے تو ان امور میں  
امام کا اتباع واجب نہیں۔ وانہ لا تجب المتابعة فی السنن فعلاً و کذا  
ترکاً فلا یتابعہ فی ترک رفع الیدین فی التحریمة والثناء و تکبیر  
الرکوع و السجود و التسبیح فیہا و التسمیع اھ شامی ص ۲۱۶۔ اگر امام  
کسی واجب قولی کو ترک کر دے جس کے کرنے سے واجب فعلی میں مخالفت  
لازم آتی ہو مثلاً تشہد، سلام، تکبیر تشریق کو ترک کر دے تو اس میں امام کا  
اتباع نہیں کیا جائیگا و کذا لا یتابعہ فی ترک الواجب القولی الذی  
لا یلزم من فعلہ المخالفة فی واجب فعلی کا تشہد والسلام و تکبیر  
التشریق اھ شامی ص ۲۱۶۔

ہر فرض میں اتباع امام کو کلیۃً فرض کہنا بھی صحیح نہیں، وكون المتابعة  
فرضا في الفرض لا يصح على الإطلاق لما مر جوابه من ان المسبوق لو قام قبل تَعُود  
امام قدر التشهد في الصلوة تصح صلواته ان قرأ ما تجوز به الصلوة بعد تَعُود  
الامام قدر التشهد والا لا مع انه لم يتابع في القعدة الاخيرة فلو كانت  
المتابعة فرضا في الفرض مطلقا بطلت صلواته اه شافعی ص ۳۱۶۔

⑨

جس شخص کی امامت کو قوم ناپسند کرے اسلئے کہ اس میں خرابی ہے یا اس  
سے زائد لائق امامت دوسرے آدمی موجود ہیں پھر وہ شخص جبراً امام بن کر نماز پڑھائے  
تو اس کیلئے ایسا کرنا مکروہ تحریمی ہے اسکی نماز مقبول نہیں۔ ولو امر قوما وھولہ  
کارھون ان الکراہۃ لفساد فیہ اولانہما راحق بالامامۃ منہ کورہ لہ ذلک  
تحریماً لحديث ابی داؤد لا یقبل للہ صلوة من تقدم قوما وھولہ  
کارھون اه در مختار ص ۳۶۶۔

قدر سنت سے قرات و اذکار کو طویل کرنا جو کہ قوم پر بار ہو مکروہ تحریمی ہے۔  
ویکروہ تحریمات تطویل لصلوة علی لقوم زائد علی قدر السنۃ فی قراۃ و اذکار۔  
ص ۳۶۶۔ حضرت معاذ بن عمار کی نماز میں قرات طویل کی ایک مقتدی نے نماز توڑ دی  
معاذ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا تو امام صاحب ہی کو تنبیہ فرمائی فاقبل  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی معاذ قال یا معاذ ان انت اقرا والشمع وضئھا  
والضحی واللیل اذا یغشی، سبھ اسو ربک الاعلی (متفق علیہ الخ) مکتوۃ  
یہاں سے قرات مستوزہ کا اندازہ ہوا۔ ایک شخص نے حاضر خدمت ہو کر شکایت کی کہ

فلاں شخص صبح کی نماز طویل پڑھاتا ہے جس کی وجہ سے میں شریک نماز نہیں ہوتا  
یہ شکایت سنکر امام پر بہت شدید عتاب فرمایا۔ عن قیس بن حازم قال اخبرنی ابن  
مسعود ان رجلاً قال والله یا رسول الله ان لا تأخر علی صلوة الغداة من اجل  
فلان مما یطیل بنا فخرایت رسول الله صلی الله علیہ وسلم فی موعظتہ شد غضبا  
منہ یومئذ ثم قال ان منکم منفرین فایکوما صلی بالناس فلیتجنزوا فان فیہم  
الضعیف والکبیر وذا الحاجة (متفق علیہ) مشکوٰۃ شریف (۱۱۱)

تمام مالی صفات کے باوجود اگر امام سے نماز میں غلطی ہو جائے خواہ سہوا ہی  
ہو اس سے کھیتہ صرف نظر نہیں کیا جائیگا بلکہ اس کو متنبہ کیا جائیگا، اگر قرأت میں  
غلطی ہو جائے تو نماز کو فساد سے بچانے کیلئے لقمہ دیا جائیگا غلطی فاحش ہو جانے  
کی صورت میں اعادہ نماز کا حکم ہوگا، اگر صلوٰۃ رباعی میں تیسری رکعت پڑھ کر  
بیٹھنے لگے تو اسکو یاد دلایا جائیگا کہ کھڑا ہو جائے، اگر چوتھی رکعت پڑھ کر کھڑا  
ہونے لگے تو اسکو بٹھایا جائیگا اگر وہ نہ بیٹھے تو اس کا اتباع نہیں کیا جائیگا،  
اگر امام سے سہوا کوئی واجب ترک ہو جائے تو سجدہ سہو سے مکافات کی جائیگی  
اگر نماز میں واجب کا ترک ہونا یاد ہی نہ آیا یا قصداً سجدہ سہو نہ کیا یا عمدتاً واجب کو  
ترک کیا تو اعادہ نماز کا حکم ہوگا۔ غرض اصلاح نماز کی کوشش میں امام کے  
بند درجات حائل و مانع نہیں، حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھول ہو گئی تو  
مطلع ہونے پر مکافات فرمائی نیز ارشاد فرمایا انما انا بشر مثلکموانسی کما تنسون  
فاذا نسیت فذکر فی (متفق علیہ) مشکوٰۃ (۱۲) یہ بھی حکم فرمایا کہ میرے قریب  
اہل عقل و فہم کھڑے ہوا کریں (تاکہ اگر کوئی بات پیش آجائے تو نماز کو فساد سے

بچانے میں سہولت رہے، لیلیٰ منکر اولوالاхлаام والنہی ان شامی بیہ۔  
 مسلمانوں میں دینی انحطاط بڑھتا جا رہا ہے، امامت کے اوصاف بھی کم ہوتے  
 جا رہے ہیں، ایک مسئلہ بیان کرتے ہوئے فقیہ ابواللیث سمرقندی رحمہ اللہ کو لکھنا  
 پڑا الجہل فی القراء غالب الخ۔ شامی بیہ۔ امامت کو بہت سے حضرات نے  
 پیشہ معاش بنالیا ہے متولی صاحبان بھی ان سے تاجروں کی طرح معاملہ کرتے  
 ہیں جو امام کم نرخ کا ملتا ہے اسکو رکھتے ہیں، مختلف علاقوں میں اماموں کی ذریعہ  
 بھی عجیب عجیب دیکھنے میں آتی ہیں، اور ان کی آمدنی کے شعبے بھی عجیب عجیب  
 ہیں ایک امام صاحب ملاقات کے لئے جانا ہوا ان کے حجرہ میں پانی کے متعدد  
 گھڑے رکھے ہوئے تھے دریافت کرنے پر بتایا کہ محلہ کی مستورات جب ایام  
 ماہواری سے فارغ ہوتی ہیں تو وہ پانی کا گھڑا امام صاحب کے پاس بھیجتی ہیں امام  
 صاحب چند مخصوص آئینہ و سورتیں پڑھ کر اس پر دم کرتے ہیں، اس پانی سے  
 مستورات غسل کرتی ہیں تب پاک ہوتی ہیں ہر گھڑے پر دم کرنے کا معاوضہ بھی بتایا  
 ہے، اگر امام صاحب سفر میں گئے ہوں تو جب تک وہ واپس آکر پانی پر دم نہ  
 کریں تو وہ پانی غسل کیلئے کارآمد نہ ہوگا وہ مارٹھورنہ بنیکا امام صاحب کے دم  
 کر نیسے اس میں طہوریت کی صفت آئے گی، اس دم کرنے میں امام صاحب کسی  
 کو اپنا نائب بھی نہیں بناتے اسلئے مستورات کئی کئی روز بلا غسل اور بلا نماز رہتی  
 ہیں اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اہل محلہ کی میت کو غسل دینا، اس کی نماز  
 پڑھانا اسکو قبر میں رکھنا پھر سوئم وچلم وغیرہ یہ سب چیزیں امام صاحب ہی  
 سے متعلق رہتی ہیں اور ان میں ہر کام کا معاوضہ بھی ہوتا ہے، مرغی بکری وغیرہ

ذبح کی جائے تو وہ بھی امام صاحب ہی ذبح کریں گے اور اس کا معاوضہ لیں گے  
عید الاضحیٰ میں حرم قربانی اور عید الفطر میں صدقۃ الفطر میں امام صاحب ہی کا حق  
سمجھا جاتا ہے۔

فاسق کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہے واما الفاسق فقد عللوا کراهة تقديمه  
بانه لا يهتم بامر دينه و بان في تقديمه تعظيمه وقد وجب عليهم اهانتة شرعاً  
ولا يخفى انه اذا صحت اعلو من غيره لا تزول لعلته فانه لا يومن عليه ان يصلی  
بهم بغير طهارة فهو كالمبتدع تکره امامته بكل حال بل مشی فی شرح  
المنية علوان کراهة تقديمه کراهة تحريم لما ذکرنا قال ولذا لم تجز الصلوة  
خلفه اصلاً مسند مالک ورواية عن احمد اه شامی ۳/۲۶۷۔

اگر کوئی غیر متقی، بے عمل، فاسق امام مسلط ہو جس کو الگ کرنے پر قدرت نہ ہو  
تو مجبوراً اس کے پیچھے نماز ادا کر لیجائے تاکہ جماعت ترک نہ ہو فی حدیث ابی ہریرۃ  
والصلوة واجبة علیکم خلف کل مسلم براکاز او فاجرا وان عمل الکبائر  
مشکوۃ شریف متل بعض صحابہ کرام نے حجاج کے پیچھے ایسی ہی مجبوری میں نماز  
پڑھی ہے۔

(۱۰)

اگر مجلس شوریٰ میں امام اور مہتمم کے انتخاب یا عزل کا مسئلہ پیش  
ہو اور اس میں اختلاف رائے ہو تو شرعی دلائل سے ترجیح دی جائے اگر دلائل  
متساوی ہوں تو قرعہ اندازی کر لی جائے یا اہل علم کی کثرت رائے کو ترجیح دی جائے  
بے علم اور بے عمل عوام کی کثرت رائے معتبر نہیں فان استووا یقرع بین المستویین



او الخیار الى القوم فان اختلفوا اعتبر اكثرهم وان قدموا غير الاولى اسأؤابلا  
اشواء در مختار ۳، فان اختلفوا فالعبرة بما اختاره الاكثر. قال فی شرح  
المشکوۃ لعلہ محمول علی اکثر من العلماء اذا وجدوا ولا فلا عبرة بکثر الجاهلین  
قال اللہ تعالیٰ ولكن اکثر هؤلاء یعلمون ۱۰ مطاوی ۲۰ حضرت عبد الرحمن بن عوف ۲۰  
نے خلافت کیلئے چند حضرات میں سے حضرت عثمان ۲۰ کو اکثریت کی مدائے کے پیش  
نظر انتخاب کیا جس سے پھر سب ہی نے اتفاق کیا. شروح بخاری، فتح الباری،  
عمدة القاری وغیرہ میں تفصیل مذکور ہے، نیز سوال ۱۰ کے جواب میں امام و سلطان  
کی رائے کے خلاف کرنے کی ممانعت کے ذیل میں شامی کی عبارت نقل کی گئی  
ہے الا اذا اتفق اکثر انہ ضرر فیتبع ۱۰۔

کثرت رائے کو اگرچہ وہ اہل علم اور اہل تدین کی ہو بالکل ناقابل اعتبار  
قرار دینا اور یہ کہنا کہ یہ غیر دینی طریقہ ہے، غلط ہے، ایک مسئلہ میں اگر فقہاء کرام  
کا اختلاف ہو تو دیگر وجوہ ترجیح کے علاوہ اس کو بھی بیان کیا گیا ہے و علیہ اکثر علما شامی  
نے رد المحتار، تنقیح الفتاوی الحامدیہ شرح عقود رسم المفتی میں اسکی تصریح کی  
ہے، حدود کے اندر رہتے ہوئے اس پر عمل کرنا گناہ نہیں اور لا اکثر حکم الکل تو  
ایسا مشہور ہے کہ فقہاء نے جگہ جگہ اس سے استدلال کیا ہے۔

### ۱۱

حضرت سعد بن ابی وقاص ۲۰ کو فہ کے گورنر تھے، عشرہ مبشرہ میں تھے

بہت قدیم الاسلام تھے، مستجاب الدعوات تھے، جنہوں نے نماز براہ راست حضرت  
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھی تھی، جنہوں نے کسریٰ کو شکست دی، ملک

فارس کو فتح کیا، ان کی شکایت کی گئی جس میں تھا کہ یہ نماز ٹھیک نہیں پڑھاتے  
 انہ لا یحسن یصلی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود ان سے نماز کی کیفیت کو دریافت  
 کیا اور سن کر فرمایا کہ میرا بھی یہی خیال ہے کہ تم اسی طرح پڑھاتے ہو گے (یعنی  
 شکایت غلط ہے) پھر آدمی کو کوڑہیجکر تحقیق کی تو سب نے ان کی تعریف کی مگر  
 ایک شخص نے شکایت کی، حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے دعا کی کہ یا اللہ اگر یہ شخص جھوٹا  
 ہے تو اس شخص کے ساتھ ایسا ایسا ہو، چنانچہ اس کا بہت برا حال ہوا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شکایت غلط ہونے پر بھی حضرت سعد رضی اللہ  
 عنہ کو معزول فرمادیا اور ان کی جگہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو متعین فرمادیا، بخاری  
 شریف میں یہ واقعہ مذکور ہے اور بھی متعدد مقامات پر اپنی عادت کے موافق  
 امام بخاری نے اس کو بیان فرمایا ہے، جس نے جو عہدہ دیا تھا اسی نے واپس  
 لے لیا، حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بد عادی نہ ان سے  
 ناراض ہوئے نہ کوئی احتجاج کیا کہ مجھے بلا قصور علیحدہ کر دیا، نہ نظام میں کوئی فرق  
 آیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی برائت بھی فرمادی کہ  
 ان کا قصور نہیں تھا بلکہ مصلحت و انتظاما علیحدہ کیا ہے، ازالۃ الخفاء ۲۳۵ میں  
 یہ صاف صاف مذکور ہے، اس سے معلوم ہوا کہ علیحدہ کرنے کے لئے قصود وار ہونا  
 بھی ضروری نہیں بلکہ مصلحت و انتظاما بھی علیحدہ کیا جاسکتا ہے حضرت خالد بن  
 ولید رضی اللہ عنہ کو معزول فرمایا جس کی تفصیل ازالۃ الخفاء ۲۳۲ میں ہے۔  
 حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے عہدہ سپاہی سے علیحدہ ہو کر بھی ناخوشی کا اظہار  
 نہیں کیا بلکہ یہ فرمادیا کہ میرا مقصود عہدہ نہیں بلکہ خدمت اسلام ہے اب سپاہی

ہو کر خدمت کروں گا، ابجواہر المفیہ میں متعدد فقہاء و قضاة کے متعلق لکھا ہے کہ ان کو فلاں عہدہ دیا گیا پھر معزول کر دیا گیا پھر عہدہ دیا گیا۔

جب کہ باہم طے کیا گیا کہ عزل و نصب مجلس انتظامیہ کے اختیار میں ہے تو جس طرح مجلس انتظامیہ نے امام صاحب، مہتمم صاحب، مدرس صاحب، ملازم صاحب کو عہدہ دیا ان کے لئے تنخواہ مقرر کی، کام سپرد کیا، اسی طرح مجلس انتظامیہ کو عہدہ واپس لینے اور معزول کر دینے کا بھی حق ہے مگر اس میں نفاذیت نہ ہو لہذا ہوا ان کی خدمات اور وقار کا لحاظ رکھا جائے، تذلیل و تحقیر ہرگز نہ کی جائے امام صاحب و مہتمم صاحب وغیرہ کو خود بھی علیحدہ ہو جانے کا اختیار ہے وہ بھی مجلس انتظامیہ کی تذلیل و تحقیر سے پورا پرہیز کریں، اجارہ کا معاملہ طرفین کی رضامندی پر ہوتا ہے ابتداء بھی بقاؤ بھی اگر امانہ پر معاملہ ہوا ہے تو جو اس معاملہ کو ختم کرنا چاہے وہ ایک ماہ قبل اطلاع کر دے تاکہ طرف ثانی اپنا دوسرا انتظام کر لے معاملہ ملازمت ختم ہو جانے پر بھی تعلقات میں ناگواری اور کشیدگی نہ ہونے پائے۔

اگر آپ پورا الفاظ ارسال کر دیتے تو ممکن ہے معلومات میں اضافہ ہوتا اور جواب کیلئے مزید بصیرت حاصل ہوتی۔

## لیفاظ

جو شخص امارۃ کی حرص یا طلب کرے وہ اس کا مستحق نہیں عن

ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال

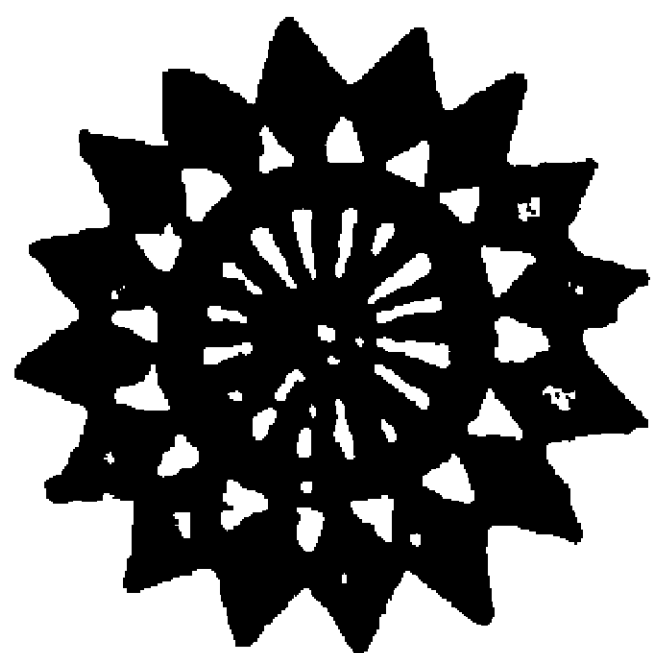
انکو مستحصر ہون علی الامارۃ و سنکون ندلما یتوہ القیمۃ فنعت  
المرضعة و بئست الفاطمة ۱۰

عن ابی موسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال دخلت علی النبی صلی اللہ علیہ  
وسلم وانا ورجلین من قومی فقال احدا للرجلین امنا یا رسول اللہ وقال  
الاخر مثله فقال انا لانا نولی هذا من سألنا وکلا من حرص علیہ الخ  
(بخاری شریف ص ۱۰۵) امارت کی حرص و طلب کو ناپسند فرمایا اور اس کا  
انجام قیامت میں خراب بتایا گیا۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو عہدہ قضا  
پیش کیا گیا مگر انھوں نے انکار فرمادیا، اس کی سزا میں دس کوڑے روزانہ  
لگتے تھے اور جیل میں ڈال کر زہر دے کر ان کو ختم کر دیا گیا مگر وہ اپنے  
استقلال پر قائم رہے، عہدہ قضا قبول نہیں کیا رحمہ اللہ تعالیٰ و رفع درجۃ  
آمین فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم۔

حررہ العبد محمود عفی عنہ

مدرسہ جامع العلوم کانپور

۱۰ جنوری الثانیہ ۱۴۴۵ھ



## آئندہ مراجع

نمبر شمار	اسماء کتب	اسماء مصنفین	ولادت	وفات
۱	قرآن مجید			
۲	التعمید لائتہ التجدید	حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ		۱۳۶۳ھ
۳	اخبار الجمیعہ اکتوبر ۱۹۳۵ء			
۴	احکام القرآن	ابوبکر احمد بن علی الحصاص رازیؒ	۳۰۵ھ	۳۴۰ھ
۵	التفسیرات الاحمدیہ	احمد بن شیخ ابوسعید معروف ملا جیونؒ	۱۰۴۸ھ	۱۱۳۰ھ
۶	الاحکام السلطانیہ	ابوالحسن علی بن محمد حبیب البصری الماوردیؒ	۳۶۳ھ	۴۵۰ھ
۷	اصول الفقہ	عبدالوہاب خلافؒ	۱۸۸۸ھ	۱۹۵۶ھ
۸	اصول الفقہ	شیخ محمد خضریٰ بکؒ		۱۹۲۶ھ
۹	احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت — مولانا تقی امینی مدظلہ العالی			مدظلہ
۱۰	الاعتصام	ابو اسحاق شاطبی غرناطیؒ		۴۹۰ھ
۱۱	ابو الرائق	علامہ زین العابدین ابن ابراہیم المعروف بہ ابن نجیم مصریؒ	۹۲۶ھ	۹۷۰ھ
۱۲	اصول الفقہ	شیخ ابو زہرہ مصریؒ		
۱۳	ابوالمحیط	ابو حیان الاندلسی	۱۲۵۶ھ	۱۳۳۵ھ
۱۴	ابوداؤد شریف	ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانیؒ	۲۰۲ھ	۲۷۵ھ

نمبر شمار	اسماء کتب	اسماء مصنفین	ولادت	وفات
۱۵	الاحسان فی علوم القرآن	حضرت مولانا فتح محمد تائب لکھنویؒ	.	۱۲۳۵ھ
۱۶	المقدمۃ السنیہ	مجدد الف ثانی و شاہ ولی اللہ دہلویؒ	۹۶۲ھ ۱۱۱۴ھ	۱۰۳۵ھ ۱۱۷۶ھ
۱۷	الموافقات	ابو اسحاق ابراہیم الشاطبی	.	۷۹۰ھ
۱۸	اعلام الموقعین	علامہ ابن قیم حنبلیؒ	۶۹۱ھ	۷۵۱ھ
۱۹	ازالۃ الخفاء	شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ	۱۱۱۴ھ	۱۱۷۶ھ
۲۰	الفاروق	علامہ شبلی نعمانیؒ	.	۱۳۳۲ھ
۲۱	اسلامی مذاہب	شیخ ابو زہرہ، ترجمہ غلام احمد حریری	.	.
۲۲	ابن ماجہ	ابو عبد اللہ محمد بن یزید ابن ماجہ قزوینیؒ	۲۰۹ھ	۲۷۳ھ
۲۳	الکلم الطیب	حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ	۱۲۸۰ھ	۱۳۶۳ھ
۲۴	الاشباہ والنظائر	علامہ زین العابدین ابن نجیم مصری	۹۲۶ھ	۹۷۰ھ
۲۵	امداد الفتاویٰ	حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ	۱۲۸۰ھ	۱۳۶۳ھ
۲۶	الاحکام السلطانیہ	قاضی ابو یعلیٰ الفرار	۳۸۰ھ	۴۵۸ھ
۲۷	بوادر النواذر	حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ	۱۲۸۰ھ	۱۳۶۳ھ
۲۸	بیان القرآن	.	.	.
۲۹	بیاض اشرفی	.	.	.
۳۰	بخاری شریف	امام بخاری محمد بن اسمعیلؒ	۱۹۴ھ	۲۵۶ھ
۳۱	تفسیر کبیر	امام فخر الدین محمد رازیؒ	۵۴۴ھ	۶۰۶ھ
۳۲	تفسیر ابن کثیر	علاء الدین ابو الفداء اسمعیل بن عمر بن کثیرؒ	۷۰۰ھ	۷۷۴ھ



نمبر شمار	اسمائے کتب	اسمائے مصنفین	ولادت	وفات
۳۳	تفسیر الجامع لاحکام القرآن	ابو عبد اللہ محمد الانصاری القسریؒ	.	۱۶۷۱ھ
۳۴	تفسیر المنار	رشید رضا	۱۸۶۵ھ	۱۹۳۵ھ
	"	و شیخ عبدہ	۱۸۴۹ھ	۱۹۰۵ھ
۳۵	تفسیر الجواهر	الشیخ عبد الحکیم طنطاوی جوہری	۱۸۷۰ھ	۱۹۴۰ھ
۳۶	تفسیر الکشاف	علامہ زرخشی (ابو القاسم محمود بن عمر	۱۸۶۷ھ	۱۹۲۸ھ
۳۷	تفسیر مظہری	محمد ث قاضی شہار الشربانی پتیؒ	۱۱۴۳ھ	۱۲۲۵ھ
۳۸	تفسیر بیضاوی	عبد اللہ ناصر الدین قاضی بیضاویؒ		۶۸۵ھ
۳۹	تفسیر روح المعانی	ابو الفضل شہاب الدین سید محمد آلوسی بغدادیؒ		۱۲۷۰ھ
۴۰	ترجمان السنہ	علامہ بدر عالم میرٹھی	۱۳۱۶ھ	۱۳۸۵ھ
۴۱	تاریخ التشریع الاسلامی	علامہ خفزی بک محمد بن عصفی	۱۸۷۲ھ	۱۹۲۷ھ
۴۲	ترمذی شریف	امام ابو عیسیٰ ترمذیؒ	۲۰۹ھ	۲۷۹ھ
۴۳	تاریخ دارالعلوم	سید محبوب رضویؒ	۱۹۱۱ھ	۱۹۷۹ھ
۴۴	تاریخ الامم الاسلامیہ	محمد بن عصفی الخفزی بک	۱۸۷۲ھ	۱۹۲۷ھ
۴۵	تذکرۃ الرشید	مولانا عاشق الہی میرٹھیؒ	۱۲۹۸ھ	۱۳۶۰ھ
۴۶	جامع الرموز	شمس الدین محمد خراسانی ہستانیؒ		۹۶۹ھ
۴۷	حجۃ اللہ الباقیہ	شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ	۱۱۱۴ھ	۱۱۷۶ھ
۴۸	خلاصۃ التفاسیر	بحر العلوم فتح محمد لکھنویؒ		۱۲۳۵ھ
۴۹	دستور حیات	مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ		مظنہ

نمبر شمار	اسماء کتب	اسماء مصنفین	ولادت	وفات
۵۰	در مختار	علامہ محمد بن علی علاؤ الدین مصطفیٰ دمشقیؒ	۱۰۲۵ھ	۱۰۸۸ھ
۵۱	ذیل الجواہر	ملا علی قاریؒ		۱۰۱۴ھ
۵۲	رد المحتار	سید محمد امین ابن عابدین	۱۱۹۸ھ	۱۲۵۲ھ
۵۳	روداد سال اول	دارالعلوم دیوبند		۱۲۸۳ھ
۵۴	سنن المصطفیٰ	شیخ ابوالحسن محمد بن عبدالہادی سندھیؒ		۱۱۳۸ھ
۵۵	شیخ زادہ	محمی الدین محمد بن مصطفیٰ القوجویؒ		۹۵۱ھ
۵۶	شرح عقود رسم المغنی	علامہ ابن عابدین دمشقیؒ	۱۱۹۸ھ	۱۲۵۲ھ
۵۷	شرح عفتانہ	علامہ سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانیؒ		۷۹۲ھ
۵۸	طبرانی	ابو القاسم سلیمان بن احمد بن ایوب		
		لمنی طبرانی	۲۶۰ھ	۳۶۰ھ
۵۹	الطرق الحکمیۃ	علامہ ابن قیمؒ	۶۹۱ھ	۷۵۱ھ
۶۰	عمدة القاری	علامہ بدر الدین عینیؒ	۷۴۳ھ	۸۵۵ھ
۶۱	عطر ہدایہ	مولانا فتح محمد صاحب تائب لکھنویؒ		۱۳۳۵ھ
۶۲	عنوان انقلاب	علامہ عبید اللہ سندھیؒ		۱۳۶۳ھ
۶۳	فتاویٰ خلیلیہ	حضرت مولانا خلیل احمد بہار پوریؒ	۱۲۶۹ھ	۱۳۴۶ھ
۶۴	فتح الباری	علامہ حافظ الدین ابن حجر عسقلانیؒ	۷۷۳ھ	۸۵۲ھ
۶۵	فیض الباری	علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ	۱۲۹۲ھ	۱۳۵۱ھ
۶۶	فتح الکریم	مولانا محمد شاہ صاحب سہلیؒ		

نمبر شمار	اسمائے کتب	اسمائے مصنفین	ولادت	وفات
۶۷	فوائد عثمانی	علامہ شبیر احمد عثمانی	۱۳۶۲ھ	۱۳۶۹ھ
۶۸	فتح القدر	علامہ ابن ہمامؒ	۱۷۸۸ھ	۱۸۶۱ھ
۶۹	فتاویٰ عالمگیری	بادشاہ عالمگیرؒ کے حکم سے مجلس اکابر علماء ہند نے ۱۱۱۸ھ میں مرتب کیا	۱۱۱۸ھ	
۷۰	فتاویٰ دارالعلوم	مفتی دارالعلوم دیوبند		
۷۱	فتاویٰ کفایت المفتی	مفتی کفایت الشرح صاحبؒ	۱۲۹۲ھ	۱۳۷۲ھ
۷۲	قصص القرآن	حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ	۱۳۱۸ھ	۱۳۸۲ھ
۷۳	قاسم العلوم	حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ	۱۲۴۸ھ	۱۲۹۷ھ
۷۴	کشاف اصطلاحات الفنون الاسلامیہ	شیخ محمد علی تھانویؒ		
۷۵	کشف الاسرار	علامہ عبدالعزیز بخاریؒ	۱۷۳۰ھ	
۷۶	کنز العمال	شیخ علی متقی	۱۹۷۵ھ	
۷۷	کتاب الخراج	امام ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم الکوفیؒ	۱۸۲ھ	
۷۸	لمعات التنبیح	شیخ عبدالحق محدث دہلوی	۱۹۵۸ھ	۱۰۵۲ھ
۷۹	مشکوٰۃ شریف	شیخ ولی الدین خطیب عمری تبریزیؒ	۱۷۳۰ھ	
۸۰	مواقف المسترشدين	علامہ عبید اللہ سندھیؒ	۱۳۶۳ھ	
۸۱	مسودہ دستور انسانی	حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ	۱۳۱۵ھ	۱۴۰۳ھ
۸۲	مقدمہ اعلاارلسنن	مولانا ظفر احمد تھانویؒ	۱۳۱۰ھ	۱۳۹۲ھ

نمبر شمار	اسمائے کتب	اسمائے مصنفین	ولادت	وفات
۸۳	منہاج السنۃ	علامہ ابن تیمیہؒ	۵۶۱ھ	۷۲۸ھ
۸۴	مناقب موفی	امام صدر الائمہ مکی		
۸۵	مقام ابو حنیفہؒ	مولانا سر فراز خاں صفدر پاکستان	مذللہ	
۸۶	المبسوط	شمس الائمہ ابو بکر محمد بن احمد سرخسیؒ	۴۰۰ھ	۴۹۰ھ
۸۷	مجمع الزوائد	محدث علی بن ابی بکر بن سلیمان ہاشمی شافعی	۷۳۵ھ	۸۰۷ھ
۸۸	مسند احمد	امام احمد ابن حنبلؒ	۱۶۴ھ	۲۴۱ھ
۸۹	معارف القرآن	مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ	۱۳۱۴ھ	۱۳۹۶ھ
۹۰	ماہنامہ دارالعلوم دیوبند	زیر ادارت مولانا حبیب الرحمن قاسمی	مذللہ	
۹۱	مختصر الوقایہ	تاج الشریعہ محمودؒ		
۹۲	منحۃ الخالق	خاتم المحققین علامہ سید امین (ابن عابدین) شامی	۱۱۹۸ھ	۱۲۵۲ھ
۹۳	نسائی شریف	ابو عبد الرحمن احمد بن شعیب خراسانیؒ	۲۱۵ھ	۳۰۲ھ
۹۴	اسلام کا نظام حکومت	مولانا حامد الانصاری غازی	مذللہ	
۹۵	ہدایہ اولین	امام ابو الحسن برہان الدین علی بن ابی بکر بن عبد الجلیل نسر قانیؒ	۵۱۱ھ	۵۹۳ھ

وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ اَوَّلًا وَاٰخِرًا

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

دارالمؤلفین ٹیگزام چینل  
ہر موضوع پر ذخیرہ کتب کا عظیم مرکز

